نار
سحر ساجد

نار کہانی ہے محبت کی مگر اس میں آپ کو محبت ہوتی نظر نہ آئے گی...... **نار** کہانی ہے اک راز کی اور راز اک چنگاری سے کم نہیں......

سحر ساجد کے قلم سے ایک خوبصورت اُلجھتی سلجھتی، سلگتی بھڑکتی، محبت کی آگ میں جلتی اور اسرار میں پنپتی تحریر

نار

سحر ساجد

نوٹ:۔

اس ناول کے جملہ حقوق بنامِ مصنفہ سحر ساجد محفوظ ہیں۔ یہ ناول قسط وار پاکیزہ ڈائجسٹ میں شائع ہو رہا ہے اور مصنفہ نے کتاب گھر (http://kitaabghar.com) کو آن لائن پبلشنگ کے لیے اجازت دی ہے۔ لہٰذا اس تحریر کی کسی بھی اور رسالے، ڈائجسٹ، میگزین، ویب سائٹ، سیل فون ایپ یا انٹرنیٹ پر کسی بھی شکل میں کاپی کرنا خلافِ قانون ہے۔ خلاف ورزی کرنے والے کو قانونی کارروائی کا سامنا اور بھاری جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔

قسط نمبر 1

http://kitaabghar.com

گھر اس طرح سے بتیوں سے سجا ہوا تھا جیسے کوئی دلہن top to toe سجی سنوری ہوتی ہے۔سنہری بتیوں کی وجہ سے پورا گھر بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔لان میں موجود درخت بھی ان ہی بتیوں کی وجہ سے سبز کے بجائے سنہری زیادہ دکھتے تھے۔تنوں کے گرد لپٹی بتیاں، شاخوں میں الجھ کر جھولتی، جلتی بجھتی بتیاں، گھر کے باہر بیرونی دروازے کے دائیں بائیں بنے ستونوں پر بتیاں، گلی میں بھی۔ بتیوں اور قمقموں کی سجاوٹ نظر آتی تھی۔ رات کے وقت بھی دن کا گماں گزرتا تھا۔جس طرف نگاہ کرو، بتیاں ہی بتیاں۔خوب صورت لائٹنگ، ایک دم شاندار۔

اس لائٹنگ کے علاوہ ایک مخصوص چہل پہل بھی نظر آتی تھی۔ ادھر ادھر بھاگتے بچے، آتے جاتے لوگ، مہمان اور داخلی دروازے کے پاس چہرے پر مسکراہٹ سجائے کھڑے میز بان۔ایک مخصوص سا شور، ویسا ہی جیسا اس قسم کی کسی بھی تقریب میں ہوتا ہے۔ اور اگر بیرونی دروازے سے جیسے ہی اندر جاؤ اور قدم جوں جوں اندرونی سمت بڑھتے جائیں تو ساری آوازوں پر حاوی ہوتی ایک آواز سنائی دیتی تھی۔ ڈھولک کی تھاپ۔ تھاپ ایک لے میں گونجتی تھی اور گونجتے، گونجتے یکدم بے ڈھنگی سی ہوتی اور پھر چند نسوانی قہقہے بلند ہوتے، ذرا سا شور ہوتا اور پھر سے تھاپ اسی لے میں گونجنے لگتی۔ سریلی سی آوازیں۔ ماہیے گانے لگتیں۔

آج مہندی تھی اور مزنہ کو خوب غضب کا روپ چڑھا تھا۔نظر ٹھہرتی نہ تھی۔ گوری رنگت اور اس پر چہرہ معصوم، اس کے چہرے کے ایک ایک نقش میں بنانے والے نے معصومیت کوٹ کوٹ کر بھر رکھی تھی۔ پیلا جوڑا، پیلی، سبز، سنہری چوڑیاں، پیلے، سفید، سرخ پھولوں سے لدی ہوئی، دوپٹے کا ذرا سا گھونگٹ نکالے وہ شرم سے لال، پیلی ہوئی جا رہی تھی۔ اس کی سہیلیاں اس کے کمرے میں موجود تھیں اور اسے چھیڑنے کے ساتھ ساتھ ڈھولک بھی بجا رہی تھیں۔ ڈھولک پھر سے ایک لے کے ساتھ بج رہی تھی۔

''دولہا والے آ گئے، دولہا والے آ گئے۔ اٹھو، اٹھو۔ جلدی کرو، پلیٹیں پکڑو، شمی، امبر۔'' ایک دم کسی نے آ کر کہا تھا اور ڈھولک بجنا بند ہوئی۔ کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ ایک افراتفری سی پھیلی اور چند منٹوں میں ہی کمرا خالی۔

مزنہ اکیلی رہ گئی تھی۔ اس نے اٹھ کر کھلا دروازہ ذرا سا بھیڑ دیا تھا اور پھر سہج سہج کر قدم اٹھاتے ہوئے آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔ دوپٹے کو چہرے سے ذرا سا سرکایا، اپنا روپ دیکھا اور ایک مسکراہٹ اس کے چہرے پر روشنی کی طرح چمک کر پھیلی تھی۔ وہ شاید ابھی کچھ دیر اور آئینے کے سامنے یوں ہی کھڑی رہتی کہ دروازہ اچانک کھلا تھا۔ وہ بے ساختہ مڑی اور آپی کو دیکھ کر وہ بے اختیار جھینپی تھی۔

خولہ اس کے جھینپنے پر مسکرائی تھی لیکن اس کی مسکراہٹ کو ایک عجیب سے تاثر نے اچانک ہی ڈھانپ لیا تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے ٹھہر سی گئی۔ قدم بڑھا کر مزنہ تک نہ جا سکی تھی اور مزنہ، وہ وہیں سر جھکائے اسی جھینپے انداز میں کھڑی تھی۔ خولہ نے ایک گہری سانس بھری، نرمی سے چلتے ہوئے وہ اس تک آئی۔ مزنہ کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے۔ مزنہ نے سر اٹھا کر مسکراتی مگر جھینپی نگاہوں سے خولہ کو دیکھا تھا۔

''مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'' خولہ نے نرم لہجے میں کہا اور پھر اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھایا اور خود بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ کہنے کو تو اس نے کہہ دیا تھا کہ اسے کچھ بات کرنی ہے مگر اب۔ وہ گونگی ہو کر رہ گئی تھی۔

''آپی۔'' مزنہ نے اس کے نہ بولنے پر آہستہ سے پکارا تھا۔

''ہمایوں بہت اچھا انسان ہے۔ میں جانتی ہوں مزنہ کہ وہ تمہیں بہت اچھے سے رکھے گا لیکن۔ لیکن اسے کبھی۔ ہاں کبھی یہ معلوم ہونے نہ دینا کہ تم۔'' مزنہ کے پکارنے پر جیسے اس کی قوتِ گویائی لوٹ کر آئی تھی۔

''لیکن آپی! اس میں حرج ہی کیا ہے۔ کیا اس بات سے کوئی فرق پڑتا ہے؟ آپ خود ہی تو کہہ رہی ہیں وہ ایک اچھا انسان ہے تو پھر؟''

''مزنہ۔'' خولہ نے یک دم اس کی بات کاٹی۔

''فرق پڑتا ہے جبھی تو میں تمہیں منع کر رہی ہوں۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے سو اچھائی کی بھی ہے، بہت سی نزاکتیں ہیں جنہیں تم ابھی نہیں سمجھ سکو گی۔ یہ تمہیں تب سمجھ میں آئیں گی جب تم میری عمر کو پہنچو گی۔ سوال مت کرو۔ جو میں کہہ رہی ہوں اسے پلو سے باندھ لو، گرہ لگا لو، گھول کر پی لو کہ اسے کبھی کسی حالت میں بھی یہ بات معلوم نہ ہونے دینا۔'' اب کہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر خولہ نے کہا۔

مزنہ خاموش ضرور ہو گئی تھی لیکن وہ کتنی الجھ چکی تھی، یہ اس کے چہرے پر صاف نظر آ رہا تھا۔ خولہ چند لمحے اس کے الجھن بھرے تاثرات کو دیکھتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ بات کہہ کر وہ اسے الجھا دے گی، پریشان کر دے گی مگر اس کے سوا چارہ بھی تو کچھ اور نہیں تھا۔

''مزنہ۔'' اس نے یک دم اس کے دونوں ہاتھ اپنے سرد ہوتے ہوئے ہاتھوں میں لیے تھے۔

''یہ بات ایک راز ہے اب سے اور۔ یہ راز ایک چنگاری ہے، سلگتی ہوئی چنگاری۔ ایسی چنگاری جو ایک ''نار'' کو بھڑکا دے گی کہ پھر جسے تم بجھا سکو گی اور نہ میں۔ یہ محض بھڑکے گی ہی نہیں بلکہ سب کچھ بھسم کر دے گی۔ اور پھر سب ختم۔ سب، ہاں سب ختم۔''

خولہ جب یہ کہہ رہی تھی تو یوں بول رہی تھی جیسے وہ اپنے آپ میں نہ ہو اور مزنہ، وہ حیرت، الجھن اور ذرا سا ڈر کر اس کی بات سنتی تھی کہ خولہ کا لہجہ آنچ دیتا تھا، سلگتا سا تھا۔

☆......☆......☆

''یا میرے خدا!''

فون سنتے ہی احمد صاحب سینے پر ہاتھ رکھ کر صوفے پر ڈھے پڑنے والے انداز میں گرے تھے۔ خولہ کچن میں تھی اور آواز اس

http://kitaabghar.com

کے کانوں تک بھی جا پہنچی تھی۔ وہ گھبرا کر تقریباً دوڑتے ہوئے کچن سے باہر آئی تھی۔

''ابو۔ ابو! کیا ہوا؟'' دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بیٹھے احمد صاحب پریشان سے زیادہ بیمار نظر آنے لگے تھے۔ اور جب خولہ نے گھبرا کر ان کا کندھا ہلا کر پوچھا تو یوں جیسے بچ جانے والی سکت نے بھی دم توڑ دیا تھا۔

''تمہارے پھوپا۔'' اور اس سے زیادہ وہ بول نہ پائے تھے۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر رونے لگے تھے۔

خولہ کے حواسوں نے بھی کام کرنا جیسے یکدم چھوڑا۔ وہ ابو کے پیروں کے پاس بیٹھی تھی۔ پھوپا ہارٹ پیشنٹ تھے اور۔ اور۔ وہ اس خیال کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی جو کہ اس کے ذہن میں منڈلانا شروع ہو چکا تھا۔ مزنہ بھی ان آوازوں پر کمرے سے باہر آئی تھی۔

''ابو، ابو! کیا ہوا پھوپا کو؟'' خولہ اب ان کا ہاتھ پکڑ کر ہتھیلی کو ملتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''اعجاز کی مارکیٹ میں آج صبح اچانک آگ بھڑک اٹھی تھی۔ سب کچھ جل کر تباہ ہو گیا اور وہ برداشت نہ کر سکا۔'' احمد صاحب نے اتنی سی بات کہی اور پھر سے رونے لگے تھے۔

خولہ کے بدن میں یکدم لرزش اتری تھی۔ مزنہ مارے گھبراہٹ کے اسی جگہ پر کھڑی مجسم ہو کر رہ گئی تھی۔

''کس۔ کس ہسپتال میں؟'' خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے خولہ نے پوچھا۔

''وہ۔ نہیں رہا۔'' لفظ نہیں تھے۔ وہ لفظوں کی صورت منوں، ٹنوں وزن تھا۔ ایک بم تھا جو عین ان کے سروں پر ڈھے پڑا تھا۔ پھٹ پڑا تھا۔

خولہ، ابو کے پاس ہی ڈھے پڑنے والے انداز میں زمین پر گری تھی۔ اور مزنہ۔ اس کے منہ سے ایک دم چیخ نکلی تھی۔ وہ تینوں نفوس ایک وقت میں ایک ہی جیسے بھاری اور پر شدت صدمے کا شکار ہوئے تھے۔

''پھپھو، جہانگیر۔ کیا گزر رہی ہوگی ان پر؟ کیا بیتا ہوگا ان دونوں پر۔ کیسے سہہ پائے ہوں گے وہ یہ؟ کیسے؟'' خولہ دونوں کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھی تھی جبکہ مزنہ احمد صاحب سے لپٹ کر اونچی آواز سے روئے جا رہی تھی۔ وہ یوں بھی چھوٹی تھی اور گھبرانے میں ہمیشہ ہی عجلت کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اور ابو۔ وہ بھی مزنہ کو ساتھ لپٹائے بری طرح روئے جا رہے تھے۔ کوئی اگر شاک کی سی کیفیت میں تھا تو وہ خولہ ہی تھی۔ وہ یوں بیٹھی تھی۔ جیسے اس ایک بات پہ، ایک خبر پر یقین نہیں کر پائی ہو۔ اعتبار نہ کر سکی ہو۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے اسی ایک حالت میں بیٹھی رہی تھی۔

☆......☆......☆

اعجاز صاحب کی موت کے بعد سب سے زیادہ ہولناک انکشاف یہ تھا کہ ان کا کئی کنال کا گھر گروی رکھ کر قرض لیا گیا تھا۔ احمد صاحب جیسے جیسے حالات کو ڈیل کر رہے تھے۔ ویسے ویسے پریشان سے پریشان تر ہوتے جا رہے۔

بظاہر ٹھاٹ باٹ اور اندر خانہ صورتِ حال۔ اسی کوٹ جیسی کہ جس کی جیبیں ادھڑی ہوئی، پھٹی ہوئی تھیں۔

جہانگیر اس وقت آنرز کے تیسرے سمیسٹر میں تھا۔ بچہ تھا اور وہ بھی لاڈلا۔ اس کے لیے باپ کا صدمہ ہی کافی تھا۔ اعجاز صاحب تمام معاملات نمٹانے کے بعد چھوٹی بہن فرخندہ کو اپنے گھر لے آئے تھے۔ جو مارکیٹ جل کر راکھ میں تبدیل ہوئی تھی۔ اسے دوبارہ کھڑا کرنا ناممکن تھا۔ اتنا سرمایہ کہاں سے آتا۔ بینک بیلنس اگر ہوتا تو اعجاز صاحب گھر ہی گروی کیوں رکھتے۔ وہ ان دنوں ایک اور مارکیٹ خریدنے کے چکر میں تھے۔ بینک سے لون نہ ملنے کی وجہ سے انہوں نے گھر گروی رکھا تھا لیکن کون جانتا تھا کہ حالات اس طرح سے پلٹا کھا جائیں گے کہ ان کی بیوی اور اکلوتے بیٹے کو ساری عمر کے لیے مجبور کر کے رکھ دیں گے۔

اس جلی ہوئی راکھ میں بدلی ہوئی مارکیٹ کو یونہی بیچ دیا گیا۔ جتنے میں بھی سہی، جیسے بھی سہی۔ احمد صاحب نے اسے بیچ کر وہ رقم جہانگیر کی تعلیم کے لیے محفوظ کر دی تھی اور جہاں تک ان دونوں کے خرچے کی بات تھی تو اتنا تو انہیں اللہ نے دے ہی رکھا تھا کہ وہ بیوہ بہن اور بھانجے کا بوجھ اٹھا سکتے۔ اسی لیے وہ فرخندہ اور جہانگیر کو اپنے گھر لے آئے تھے۔ اس سے قطع نظر کہ ان کے گھر میں گنجائش ہوتی یا نہیں ہوتی۔ یہ معاملہ گھروں کا نہیں ہوتا، دلوں کا ہوتا ہے اور احمد صاحب کا دل۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس شخص کا دل صلہ رحمی سے کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور ان کے پاس رشتوں کے نام پر تھا ہی کیا؟ خولہ، مزنہ، دو بیٹیاں اور ایک بہن بس۔ تو جب بہن اس حال کو پہنچے تو بھائی کیسے لاتعلق ہو جاتا۔ وہ کوئی اور بدقسمت بھائی ہوتے ہوں گے جو بے حس و لاتعلق بن کر جی لیتے ہوں گے۔ احمد ایسے نہ ہو سکتے تھے اور نہ ہی تھے۔

اس حادثے کے بعد زندگی ایک تعطل کا شکار ضرور ہوئی تھی لیکن زندگی کا کام چلنا ہے ایک جھٹکے کے بعد۔ کچھ عرصے کے بعد کچھ وقت بیت جانے کے بعد زندگی نے اپنی ڈگر پر پاؤں رکھ دیئے تھے، لڑکھڑا کر ہی سہی، وہ چل پڑی تھی۔

جہانگیر اپ سیٹ تھا۔ وہ ضرورت سے زیادہ خاموش ہو گیا تھا اور چڑچڑا بھی۔ اسے ماموں کے گھر رہنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہاں اپنے گھر جیسی سہولیات تھیں نہ ہی بے فکر زندگی۔ ایک مکمل مختلف ماحول۔ جہاں اسے گزارہ کرنا تھا۔ وہ یکدم ہی مجبوروں والی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اگرچہ زندگی پہلے جیسی نہ تھی مگر اتنی بری بھی نہیں تھی لیکن جہانگیر کو کون سمجھاتا۔ احمد صاحب احسان نہیں کرتے تھے لیکن جہانگیر اسے احسان ہی سمجھتا تھا۔ خوامخواہ ہی وہ خودترسی کا شکار ہو گیا تھا۔ خولہ اور مزنہ اسے گھر کے فرد کی طرح ہی ٹریٹ کرتی تھیں۔ احمد صاحب اسے بیٹا کہتے تھے لیکن وہ۔ ہر ماہ جب اسے پاکٹ منی ملتی، ہر سمیسٹر کی فیس جب ادا کی جاتی، نئے کپڑے جوتے جب جب خریدے جاتے جب اس سے یہ پوچھا جاتا کہ اسے کچھ چاہئیں تو نہیں۔ گاڑی کی جگہ جب بائیک پر یونی جانا پڑتا۔ جب کبھی اسے ماں سے پیسے مانگنے پڑتے تو ہر دفعہ اس کے اندر ایک احساس اپنی جڑیں کچھ اور پھیلا لیتا۔ اس احساس کی جڑیں اسے جکڑنے لگتیں۔ اسے ایسی زندگی نہیں چاہیے تھے، اس نے ایسی زندگی کا کب سوچا تھا۔ کب اس نے اس طرح کا طرزِ زندگی چاہا تھا۔ اسے پڑھنا تھا، کامیاب

http://kitaabghar.com

ہونا تھا اور پھر سے وہی لائف اسٹائل ویسا ہی گھر حاصل کرنا تھا۔ کبھی حوصلہ ٹھاٹھیں مارنے لگتا تو کبھی عزم ٹوٹ کر بکھر جاتا۔ اور اسی کشمکش نے اسے چڑ چڑا، بدمزاج اور غصیلا بنا دیا کر رکھ دیا۔ مجموعی طور پر اس کی شخصیت مسخ ہوئی تھی۔ وہ، وہ جہانگیر نہیں تھا جیسا اس کے باپ نے چاہا تھا یا اس کی ماں کی آنکھوں نے دیکھنا چاہا تھا۔

حادثے کب سلامت چھوڑتے ہیں، بلندی سے پستی۔ کہنے کو دو متضاد لفظ مگر یہ سفر شدید ترین اذیت ناکی کا سفر۔ یہ وہ ہی جانے کہ جس کے پیروں نے یہ فاصلہ طے کیا۔ مرنے والے مر جاتے ہیں اور پیچھے رہ جانے والے، وہ بس مرتے ہی تو نہیں۔ باقی رہتا ہی کیا ہے؟ گو کہ جہانگیر کے لیے زندگی اتنی مشکل ثابت نہیں ہوئی جتنی کسی دوسرے کے لیے ہوسکتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اسے قدر نہیں تھی، غصہ تھا، گلے شکوے تھے، مشکل ہوتی تو جانتا ناں کہ زندگی کیسے ناک کی لکیریں بھی نکلوا کر رکھ دیتی ہے۔ مشکل سر پر ٹوٹ کر پڑتی تو جانتا ناں کہ آبلہ پائی کیا ہوتی ہے، آخر کیا؟

☆......☆......☆

"یہ کیا ہر جمعرات کو گھر کو قبرستان بنایا ہوا ہوتا ہے تم لوگوں نے۔" ابھی ابھی وہ یونیورسٹی سے آیا تھا اور آتے ہی اگربتی کی خوشبو سے گرمی چڑھی تھی۔ اسے رہ کر تاؤ آیا۔

"حد ہوتی ہے جہانگیر۔ ختم کا دن ہے اور ابو کو تو تم جانتے ہی ہو۔"

"کب تک یار، تم لوگوں کے خیموں سے قبر میں پڑے مردے کیا فیض یاب ہوتے ہیں؟ کھانے، ٹھونسنے کے لیے بس ڈھونگ رچا رکھے ہیں۔" وہ سخت بیزار نظر آتا تھا۔

"ابو تو ابھی تک دادا کا ختم دلواتے ہیں ہر جمعرات کو اور تم ہو کہ......"

"بس بس۔ مجھے نہیں سننا پھر سے وہ ہی ہسٹری نامہ۔ بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ اس خاندان میں بچوں کے نام بھی پیروں سے پوچھ پوچھ کر رکھے جاتے ہیں۔"

خولہ کی بات یک دم کاٹی گئی تھی۔ اور وہ چپ کی چپ رہ گئی تھی۔

"کھانا؟" اس نے موضوع بدلنا بہتر جانا تھا۔

"ظاہر ہے کھاؤں گا ہی۔ لیکن اللہ کا واسطہ، اس ختم والا کھانا نہ مجھے دینا۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا تھا۔

"جہانگیر! تم بھی حد ہی کرتے ہو خوامخواہ کی چڑ پال رکھی ہے تم نے۔" خولہ کہتے ہوئے اٹھی تھی۔

جہانگیر نے شدید بیزاری سے سر جھٹکا تھا۔ جہانگیر اور خولہ ہم عمر تھے۔ چند ماہ کے فرق سے جہانگیر، خولہ سے بڑا تھا۔ جہانگیر کی گھر میں کسی سے نہیں بنتی تھی۔ اسے ہر بات، ہر کام پر اعتراض ہی ہوا کرتا تھا۔ اب بھی وہ دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھے آنکھیں موندے

صوفے پر نیم دراز تھا۔ یقیناً کھانے کا انتظار تھا۔ اسی دوران لینڈ لائن کی بیل بجی تھی۔ جہانگیر صاحب اٹھ کر جاتے، یہ کیسے ہوتا بھلا۔؟

مزنہ کمرے سے باہر آئی تھی، فون بھی اسی کا تھا۔ وہ وہیں ٹیلی فون اسٹینڈ کے پاس کھڑے ہو کر گپیں ہانکنے لگی۔ جہانگیر نے تھوڑی دیر تو برداشت کیا اور پھر۔

''تمہاری باتیں ہی ختم نہیں ہوتیں، بند کرو یہ فون۔'' آنکھیں کھول کر، رخ بدل کر وہ غصے سے دہاڑا۔

مزنہ چونکی۔ حیرت بھری آنکھوں سے اسے دیکھا۔

''وہ جہانگیر بھائی میری دوست۔'' وہ منمنائی تھی۔

''میں کہہ رہا ہوں فون بند کرو۔'' جواباً اور اونچی آواز میں کہا گیا تھا۔ مزنہ نے گھبرا کر فون کریڈل پر رکھا اور اندر بھاگ گئی تھی۔

''اس گھر میں بندہ دو گھڑی سکون سے بیٹھ بھی نہیں سکتا۔'' وہ حد درجہ کوفت سے بڑبڑایا تھا۔ خولہ نے یہ منظر دیکھا تھا لیکن وہ خاموش رہی اور اسی خاموشی کے ساتھ اس نے کھانے کی ٹرے جہانگیر کے آگے لا رکھی تھی۔

☆......☆......☆

''جہانگیر! پھپھو کا بی پی شوٹ کر گیا ہے۔ جلدی آؤ۔'' جس قدر بوکھلا کر فون کیا گیا تھا، اسے سن کر وہ حواس باختہ ہوا تھا۔

''ماموں کہاں ہیں؟'' لاؤڈ ہو کر پوچھا گیا۔

''وہ شہر سے باہر ہیں۔'' خولہ نے روتے ہوئے جواب دیا۔

فرخندہ کو بی پی کا مسئلہ اب کا نہیں تھا، یہ مرض کافی عرصے سے لاحق تھا انہیں لیکن اعجاز صاحب کی وفات کے بعد سے مرض نے جیسے شدت اختیار کر لی تھی۔

''میں بہت فاصلے پر ہوں خولہ۔ گاڑی ہے گھر میں؟''

''ہے۔''

''تو لے جاؤ ناں امی کو۔'' اسے جیسے رہ کر غصہ آیا تھا۔

''میں؟ مجھے کہاں آتی ہے ڈرائیونگ۔''

''واٹ؟'' وہ چلایا اور جواباً خولہ کی سسکیاں ابھریں۔

اس نے جھنجھلا کر فون بند کیا۔ ایمبولینس کو کال کی، پتا سمجھایا خولہ کو کال کرنے کے بعد اس نے بھی ہسپتال کا رخ کیا تھا اور جب وہ ہسپتال پہنچا تو فرخندہ کی حالت سنبھل چکی تھی۔ اس نے غصہ جانے کس لحاظ میں پی لیا۔ اس وقت تو پی لیا تھا لیکن رات کو۔ رات کو ماموں کے آنے پر وہ پھٹ پڑا تھا۔ تب تک فرخندہ بھی گھر آ چکی تھیں اور اب دواؤں کے زیر اثر سو رہی تھیں۔ ماموں کو دیکھتے ہی اسے سخت تپ

http://kitaabghar.com

چڑھی تھی۔

''کیا سکھایا ہے آپ نے بیٹیوں کو۔انہیں یہ تک نہیں معلوم کہ ایمرجنسی میں مجھے نہیں،ایمبولینس کو کال کی جاتی ہےاور آپ نے انہیں گاڑی تک چلانا نہیں سکھائی۔کل کو آپ کو کچھ ہوا اور میں شہر سے باہر ہوا تو تب یہ کیا کریں گی؟''الفاظ اور لہجہ دونوں ہی نہایت گستاخ تھے۔

''تمیز سے بات کرو جہانگیر۔تمہیں کیا سکھایا گیا ہے آخر؟ کیا یہ بھی نہیں کہ بڑوں سے بات کیسے کی جاتی ہے؟''خولہ کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔وہ بھی غصے سے ہی بول رہی تھی اور اتنا ہی اونچا۔جتنی اونچی جہانگیر کی آواز تھی۔

''خولہ!''احمد صاحب نے اسے ڈپٹا اور پھر انہوں نے رخ جہانگیر کی طرف موڑا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو،مجھے کم ازکم انہیں گاڑی چلانا سکھانی چاہیے تھی۔اب تم ہوناں،تم سکھا دینا۔''نرمی سے کہتے ہوئے انہوں نے جہانگیر کا کندھا تھپتھپایا۔

''میری ذمے داری ہے کیا؟''وہ ٹھنڈے مگر اسی بدتمیز لہجے میں بولا۔خولہ نے بل کھا کر اسے دیکھا مگر احمد صاحب کی نظریں اسے بولنے نہیں دیتی تھیں۔

''ٹھیک ہے تم جاؤ اب آرام کرو۔''اسی نرم لہجے میں اس سے کہا گیا۔وہ ایک سخت نظر خولہ پہ ڈال کر چلا گیا۔

''کیا ہوگیا ہے خولہ!اسے اگر کچھ نہیں سکھایا گیا تو تم کس بات کا ثبوت دے رہی ہو؟''اس کے جاتے ہی وہ برہم انداز میں خولہ سے مخاطب ہوئے تھے۔

''ابو!اب آپ زیادتی کررہے ہیں۔اس کا لہجہ دیکھا تھا آپ نے۔''

''پریشان ہے اس لیے آؤٹ ہوگیا اور غلط تو نہیں کہہ رہا تھا ناں۔مجھے تم دونوں کو ڈرائیونگ سکھانی چاہیے تھی۔''

''ٹھیک ہے ضرور سکھائیں ڈرائیونگ۔لیکن یاد رکھیے گا،مجھے بھی اب اس گدھے سے ڈرائیونگ نہیں سیکھنی اور خبردار جو آپ نے دوبارہ یہ بات کہی تو۔''وہ ٹھیک ٹھاک تپی ہوئی تھی۔

''خولہ!''

احمد صاحب کی ناراض آواز پر اس نے غصے سے سر جھٹکا تھا۔اتنی بدتمیزی،وہ بھی اس کے ابو کے ساتھ اسی کے سامنے۔کاش کہ وہ ایک تھپڑ اس کے منہ پر دے مارتی۔وہ پیچ وتاب کھا کر رہ گئی تھی۔

☆......☆......☆

وقت کو کوئی آج تک پکڑ سکا۔یہ کام بھلا کبھی ہو سکا۔کوئی روک سکا۔بند باندھ سکا،نہیں ناں۔تو ان پانچ نفوس کی زندگیوں میں یہ ہوتا اور کیونکر ہوتا۔وقت گزر رہا تھا اپنی مخصوص رفتار سے۔

خولہ نے MS مکمل کیا تو جہانگیر نے بھی MBA مکمل کیا تھا اور جیسے ہی اسے جاب ملی، اس نے نیا شوشا چھوڑ دیا تھا۔

وہ اب الگ ہونا چاہتا تھا۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہو چکا تھا تو مزید اب ماموں کے احسانات تلے زندگی نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ وہ اپنا علیحدہ گھر چاہتا تھا۔ چاہے رینٹ پر ہی کیوں نہ ہوتا۔ دیکھا جائے تو خواہش غلط تھی نہ ہی اس کا عمل لیکن مسئلہ فرخندہ تھیں۔ وہ بے حد کمزور ہو چکی تھیں اور طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ یہاں تو مزنہ اور خولہ تھیں۔ گھر کی کوئی ذمے داری بھی نہیں تھی۔ اب اس عمر میں اکیلے رہنا، گھر سنبھالنا، یہ کہاں ان کے بس کا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر ان کی طبیعت۔

احمد صاحب ہرگز بھی رضامند نہیں تھے۔ زندگی میں پہلی بار انہوں نے جہانگیر سے غصے میں بات کی تھی لیکن وہ۔ ذرا جو ٹس سے مس ہوا ہو۔

''تمہیں ماں کی کوئی پرواہ ہے یا نہیں؟''

''مجھ سے زیادہ اور کس کو ہو سکتی ہے بھلا؟''

''تو پھر اس عمر میں کیوں اسے مجبور کرتے ہو؟ وہ اب اس طبیعت کے ساتھ گھر سنبھالے گی؟ تمہارے کپڑے دھوئے گی؟ کھانے بنائے گی؟ گھر صاف کیا کرے گی؟'' وہ بری طرح تلملائے تھے۔

''جس طرح آپ کے گھر میں یہ سارے کام میڈ کرتی ہے، ہمارے گھر میں بھی میڈ کر دیا کرے گی۔''

''میڈ کو بھی پیسے دینے پڑتے ہیں برخوردار۔ اور تم جن چند ہزار کے بل پر یوں میرے سامنے آ کھڑے ہوئے ہو، اس سے کیا کیا کرو گے۔ گھر چلاؤ گے، ماں کی میڈیسن کے خرچے بھرو گے یا میڈ رکھو گے؟'' جہانگیر کے چہرے نے لمحوں میں رنگ بدلا تھا۔

''آپ جتا رہے ہیں؟'' وہ بھڑک کر بولا۔

''سمجھا رہا ہوں۔ اگر تم سمجھو تو!''

''میں نہیں آپ سمجھیں ماموں، میں اب اور یہاں نہیں رہ سکتا۔''

''تم۔''

''اس کی طرف سے میں معافی مانگتی ہوں احمد بھائی۔'' فرخندہ کی آواز پر وہ اپنی بات جاری نہ رکھ سکے تھے۔ وہ چونک کر مڑے تھے۔ وہ نم آنکھیں لیے شرمندہ سے چہرے کے ساتھ کھڑی تھیں۔

''فرخندہ! کیسی باتیں کرتی ہو۔'' وہ یک دم اٹھ کر ان تک گئے۔ کندھے کے گرد بازو پھیلایا اور انہیں یوں ہی بازوؤں کے حلقے میں لیے صوفے تک لائے تھے۔ اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے انہوں نے بہن کا سر تھپکا تھا۔ وہ عمر میں ان سے چھوٹی تھیں لیکن ان سے زیادہ بوڑھی دکھائی دیتی تھیں۔

"اسے اپنی مرضی کرنے دیں احمد بھائی۔ یہ جب تک یہاں رہے گا، روز آپ کے منہ کو آئے گا اور مجھ سے یہ برداشت نہیں ہو گا۔ جب سر پر پڑے گی عقل تب ہی آئے گی۔" وہ رنجیدہ ہو کر بول رہی تھیں۔

"یہ تو آفس چلا جایا کرے گا۔ پیچھے سے تم اکیلی، اوپر سے طبیعت بھی تمہاری ٹھیک نہیں رہتی۔ کچھ ہو گیا تو ذمے دار کون ہو گا؟"

"رکھ دے گا ایک میڈ جو چوبیس گھنٹے میری چوکیداری کیا کرے گی، اسے بھی تو معلوم ہو کہ کس بھاؤ بکتی ہے۔"

"کمال بات کرتی ہو تم بھی۔ میڈ خاک پرواہ کرے گی تمہاری۔"

احمد صاحب کسی طور مطمئن نہیں ہو رہے تھے اور جہانگیر بیزار کھڑا یہ جذباتی مکالمہ سن رہا تھا۔

"یہ اب اڑ گیا ہے بھائی صاحب، گھر میں آئے روز بدمزگی ہوا کرے گی، آپ سب ایک نہ ایک دن تنگ آ جائیں گے اور میں یہ نہیں چاہتی۔ اسے کر کے دیکھ لینے دیں اپنی مرضی۔" وہ دونوں ہاتھ بھائی کے ہاتھوں پر رکھے آزردگی سے کہہ رہی تھیں۔ اور احمد صاحب ایک گہری سانس بھر کر رہ گئے تھے۔ وہ اس پر زبردستی نہیں کر سکتے تھے، اسے مجبور نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جوان تھا، اپنی مرضی کا مالک تھا اور اب تو خیر سے روزگار بھی مل چکا تھا۔ کہاں تک روکتے اسے۔

جہانگیر نے انہیں نرم پڑتا دیکھ کر اپنی کوششیں مزید تیز کر دیں۔ بہت اچھا نہ سہی۔ لیکن گزارے لائق ایک مکان رینٹ پر لے لیا تھا اور چند ہی ہفتوں میں وہ ماں کو لے کر وہاں شفٹ ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

رات کا وقت تھا۔ لان میں ایک برتھ ڈے پارٹی کا ارینجمنٹ نظر آ رہا تھا لیکن اس ارینجمنٹ میں نفاست کا رنگ نمایاں تھا۔ افراد ادھر ادھر ٹولیوں کی شکل میں کھڑے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ تبسم مہمانوں سے ملنے میں مصروف تھیں۔ یہ برتھ ڈے پارٹی بھی ان ہی کے لیے تھی۔ وہ عمر عزیز کی چالیسویں بہار کو خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ وہ ایک بلند قامت لیکن اسمارٹ سی خاتون تھیں۔ یہ پارٹی بھی ان کے بھائی نے بصد اصرار ارینج کی تھی ورنہ وہ ایک سنجیدہ شخصیت کی حامل اپنی روایات کی پاسدار خاتون جانی جاتی تھیں۔

بہت سے لوگ انوائٹڈ تھے۔ تبسم کا حلقۂ احباب بھی وسیع تھا۔ وہ سادہ شیفون کی ساڑھی میں ملبوس لمبی گردن، کانوں میں موجود لمبے لمبے آویزوں کی وجہ سے گردن اور لمبی نظر آ رہی تھی۔ آویزے اس کی واضح طور پر نظر آتیں کالر بونز کو چھو رہے تھے۔ بال ایک جوڑے کی شکل میں گردن سے ذرا اوپر بندھے ہوئے تھے۔ چند لٹیں چہرے کے اطراف میں جھول رہی تھیں اور ٹھوڑی کے پاس آ کر سیدھی لٹیں گولائی کی شکل اختیار کرتی نظر آ رہی تھیں۔

میک اپ اگر تھا بھی تو نظر نہیں آ رہا تھا البتہ آنکھوں کا لائنر اور کاجل بڑی، بڑی آنکھوں کو کچھ اور نمایاں کر رہا تھا۔ چہرے کی اسکن گلو کر رہی تھی۔ وہ دلکش تھی یا نہیں اس وقت دل پر وار کرنے کی پوزیشن میں ضرور تھی۔ پاؤں کالے اسٹرپس والے ہائی ہیل جوتوں میں

http://kitaabghar.com

مقید تھے۔ایک ہاتھ سے ساڑی کا پلو تھامے۔دوسرے ہاتھ سے بکے اٹھائے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کی آنکھیں تبسم کو ڈھونڈ رہی تھیں۔وہ ذرا دیر سے پہنچی تھیں۔سو استقبالیہ پہ کوئی موجود نہ تھا۔لان میں پھیلے ہجوم میں تبسم کو ڈھونڈنا تھا۔وہ تھکنے لگی تھی کہ یک دم نظروں نے تبسم کو جالیا تھا۔وہ قدرے جوش سے ان کی طرف بڑھی تھی۔

''Many many happy returns of the day!''ان کے پاس جا کر خوشی سے کہتے ہوئے اس نے بکے مس تبسم کی طرف بڑھایا تھا۔

''ارے۔تھینک یو سوچ۔''تبسم نے اس کے گال سے گال ملاتے ہوئے شکریہ ادا کیا۔

''لک ایٹ یو۔بائے گاڈ،تم کتنی خوب صورت لگ رہی ہو۔''اس کو کندھوں سے پکڑ کر خود سے ذرا سا دور کر کے دیکھتے ہوئے تبسم نے کہا تھا۔

وہ ہلکا سا ہنس دی۔ہنسی کیا،سمجھو کہ کسی نے مٹھی بھر موتی کسی نقرئی برتن میں اچھال دیئے ہوں۔وہ اس کی ہنسی کی آواز پر ہی تو متوجہ ہوا تھا۔وہ آج تیسری دفعہ اسے دیکھ رہا تھا۔

پہلی بار۔پہلی بار کب دیکھا؟وہ تبسم آپی کو چھوڑنے جا رہا تھا۔انہیں ڈراپ کرنے کے بعد اسے اپنے آفس جانا تھا۔اس روز گاڑی راستے میں خراب ہوگئی تھی اور وہ گاڑی کا بونٹ اٹھائے اس خرابی کی تلاش میں کھڑا تھا کہ اس کے پاس سے ایک رکشا پھٹ پھٹ کرتا گزرا۔ذرا سا آگے جا کر رکا۔پھر بیک ہو کر ان تک آیا تھا۔ان کے پاس رکنے پر دروازہ کھلا اور ایک چہرہ نظر آیا۔اور وہ ہی کاجل سے بھری دو آنکھیں۔

''خیریت؟''تبسم بھی اس کے ساتھ ہی کھڑی تھیں جبھی تو وہ پہچان پائی تھی۔

''گاڑی خراب ہوگئی ہے؟''

''آ جائیں،آپ میرے ساتھ آ جائیں۔گو کہ یہ ٹیوٹا کرولا نہیں ہے۔''آخر میں اس کا لہجہ ذرا سا شرارتی ہوا تھا۔وہ اسے مکمل طور پر نظر انداز کیے،تبسم سے بات کر رہی تھی۔تبسم ہنس دی تھیں۔

''اس وقت یہ ٹیوٹا کرولا سے بھی بڑھ کر ہے۔''پھر تبسم نے مڑ کر بھائی سے کچھ کہا اور رکشے میں بیٹھ گئی۔رکشا ایک دفعہ پھر سے پھٹ پھٹ کرتا چل پڑا تھا۔اور وہ بونٹ کھولے کھڑا ذرا سا حیران ہوا تھا۔وہ پہلی نظر کی محبت نہیں تھی لیکن اس چہرے نے اسے اٹریکٹ ضرور کیا تھا۔

''کیا آنکھیں تھیں،کیا معصومیت تھی؟''وہ بے اختیار بڑبڑایا تھا اور اس کے بعد آج وہ غالباً اسے تیسری بار دیکھ رہا تھا اور بات اٹریکشن تک نہ رہی تھی مگر محبت تک بھی نہ پہنچی تھی اور اسے ابھی محبت تک جانا بھی نہیں تھا۔

اٹریکشن کے بعد اور محبت سے پہلے۔یہ پسندیدگی تھی۔وہ اس کی ہنسی کی آواز پر متوجہ ہوتا اور پہچان نہ پاتا یہ کیسے ہوتا؟اس نے

http://kitaabghar.com

مڑ کر آواز کی سمت دیکھا۔نظروں نے اسے گرفت کیا اور قدم بے اختیار۔ایک ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے، دوسرے میں مشروب کا گلاس تھامے، وہ اس تک آیا تھا۔

''السلام علیکم!'' خوش دلی سے مسکرا کر کہا گیا۔وہ یوں مخاطب کیے جانے پر ہلکا سا حیران ہوئی، حیران کیا ہوئی۔دل کشی اور بڑھ گئی تھی۔

''وعلیکم السلام۔'' اسی خوش دلی کے ساتھ نہیں۔جواب کافی سنجیدگی سے آیا تھا۔

''کیسی ہیں آپ؟''

''اللہ کا شکر ہے۔''

''اتنی بے مروتی؟ بندہ جواباً حال ہی پوچھ لیتا ہے۔'' اس کے سنجیدہ انداز پر وہ چڑا اور وہ بے نیاز بس تبسم سے ہی باتیں بگھارے جا رہی تھی۔

اور وہ ڈھیٹ۔سارے ڈھیٹوں کو مات دیتا وہیں ہلکے ہلکے سپ بھرتا کھڑا رہا تھا اور تبسم کے گھورنے پر بدمزہ ہو کر پلٹا تھا۔لگتا تھا کہ بات آج پسندیدگی سے نکل کر کسی اور سمت جا رہی تھی یا جانے والی تھی یا شاید جا چکی تھی۔اسے خود بھی اندازہ نہ تھا۔نہیں ہو پا رہا تھا۔وہ اسے اتنی اچھی کیوں لگتی تھی؟ کیوں لگ رہی تھی؟ کہ وہ بار بار گردن موڑ کر لان میں پھیلے ہجوم میں اسے تلاشتا اور جب وہ نظر آتی تو ایک مسکراہٹ ہونٹوں پر خواہ مخواہ ہی پھیل جاتی۔دل میں ایک خوشی کی لہر، بے وجہ ہی، ایویں ہی اٹھتی اور سرشاری کر جاتی۔

''کیا چہرے یہ کمال بھی کرتے ہیں۔'' وہ حیران تھا۔

''کیا دل یوں بھی پابند ہوتا ہے۔'' وہ یقین نہیں کر پا رہا تھا۔

''کیا محض کسی کو آنکھ بھر کر دیکھ لے تو یہ ہی کافی ہوتا ہے یا کافی ہو سکتا ہے۔'' اعتبار نہیں آتا تھا۔

اور اب کی بار جب اس نے حیران، بے یقین اور بے اعتبار ہونے کے لیے نظریں اٹھائیں تو وہ پورے لان میں کہیں نہ ملی۔نظروں کی تلاش میں شدت آئی اور پھر وہ اسے بیرونی راستے پر باہر کو جاتی نظر آئی تھی تو وہ پارٹی ادھوری چھوڑ کر جا رہی تھی۔کیوں؟ اس نے اپنے سامنے موجود شخص سے معذرت کی، لوگوں کے بیچ میں سے اور کبھی ان سے ٹکراتے ہوئے، ان سے بچتے ہوئے، تیز تیز قدم اٹھاتے تقریباً بھاگتے ہوئے وہ اس کے پیچھے آیا تھا۔

''ایکسکیوزمی!'' اس نے ایک دم بے اختیار چڑھی ہوئی سانسوں کے ساتھ آواز دی۔اس کے قدم اچانک تھمے اور گردن موڑ کر اس نے حیرانی سے آواز کی سمت دیکھا۔

وہ تقریباً بھاگتے ہوئے اس تک آیا تھا اور جب اس کے عین سامنے آیا تو حواس نے اطلاع پہنچائی کہ ''ہم۔م بھائی، اسے بھلا

کیوں روکا۔؟''اور جواب؟ ندارد۔

''جی؟''

اور وہ کاجل بھری آنکھوں میں حیرانی سموئے جب پوچھتی تھی تو معصومیت جان لیتی تھی۔

''وہ۔''اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''آپ جا رہی ہیں؟''اور اس کے اس سوال پر ایسی نظروں سے اسے دیکھا گیا جیسے کسی کی دماغی حالت پر شدید شبہ ہوا اور یہ احساس بھی اچانک ہی ہوا ہو۔

''میرا خیال ہے۔''ٹھہر کر جواب دیا گیا اور وہ منتظر نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔اور جب وہ یوں دیکھتی تھی تو اس کا دل چاہتا تھا کہ وقت ٹھہر جائے، سمے رک جائے، پتھر ہو جائے اور کوئی ایسا احساس بھی باقی نہ رہے جو کہ اس پل، اس لمحے، اس ساعت کو دھندلا کر درد دینے کا باعث بنے۔وہ اس کے یوں دیکھنے پر سر جھکا کر مسکرایا اور جیبوں میں ہاتھ ڈال کر دو قدم اور آگے آیا تھا۔

''آپ کو نہیں لگتا کہ آپ کو پارٹی یوں چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے۔''اور اس کے اس سوال پر اس لڑکی کی آنکھیں قدرے پھیل سی گئی تھیں۔ٹھیک ہے وہ تبسم کا بھائی تھا مگر یہ بے تکلفی؟ بے اختیار اس کا بایاں ابرو اوپر کو اٹھا۔

چہرے پر ایک تیکھا پن نظر آیا۔

''ایکسکیوز می؟''اور وہ ابرو اٹھا کر، اسی تیکھے پن کے ساتھ پوچھتی تھی اور مسکراہٹ کو قابو کرنے کے باوجود بھی سامنے کھڑے شخص کے لب مسکراتے ہوئے سے لگے تھے اور جب اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں کچھ تھا۔کچھ ایسا کہ جس نے اس لڑکی کو بے اختیار کانشس ہونے پر مجبور کیا تھا۔

''تو آپ ٹھہریں گی؟''

''آپ کا سوال بے معنی ہے۔''

''اور میں اگر۔ایک با معنی سوال کروں تو۔؟''

''جی۔''اس کا بایاں ابرو پھر سے اوپر کو اٹھا۔ریفلیکس ایکشن۔

''آپ اچھی لگتی ہیں مجھے۔پروپوز کرنا چاہتا ہوں۔''وہ اس کے سامنے سیدھا کھڑا جیبوں میں ہاتھ ڈالے براہِ راست اسے دیکھتے ہوئے بولا۔اعتماد قابلِ رشک تھا۔

اس کے اس سوال پر بے ساختہ اسے دیکھا، وہ بدک کر پیچھے ہٹی اور اس کا منہ یک دم کھلا تھا مگر وہ کچھ کہہ نہ سکی تھی۔وہ چند لمحے اسی طرح اسے دیکھتی رہی اور پھر اس کی آنکھوں کی تہ سے کہیں بہت نیچے سے کچھ ابھرا اور ابھر کر پوری طرح سے نمایاں ہو گیا تھا۔

’’میں......‘‘اس کے منہ سے سرسراتا ہوا لفظ نکلا۔’’میریڈ ہوں۔‘‘اور یہ جملہ اپنے اندر اتنی طاقت رکھتا تھا کہ سامنے موجود شخص کو ایک زور کا جھٹکا دے سکے،اس کا رنگ فق ہوا۔جذبات بھک سے اڑ گئے۔

’’جی؟‘‘اور اس نے اس انداز سے سوال کیا جیسے جواب سمجھ نہ آیا ہو۔

وہ اس کے بدلتی رنگت والے چہرے کو دیکھتی رہی۔اس کا چہرہ لمحوں میں تاریک ہوا تھا اور اس نے جواب دوبارہ دہرایا نہ تھا۔وہ بس بے حس سے انداز میں اسے دیکھتی رہی اور پھر۔پھر پلٹ گئی مگر یوں پشت پھیر لینے کے باوجود اس کی نظروں کا شاک کسی کانٹے کی طرح وہ اپنی پشت پر محسوس کر سکتی تھی۔اس نے کچھ بے آرام ہوتے ہوئے ساڑھی کا پلو شانوں کے گرد مضبوطی سے کسا اور چاہا تھا کہ اس کے پیر لڑکھڑا نہ جائیں۔وہ بار بار اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتی تھی اور اس ایک کوشش میں تھی کہ باہر کھڑا اس کا شوہر اس کے بدلے چہرے کی عبارت کو پڑھ نہ سکے۔

باہر اس کا شوہر کھڑا تھا اور پشت پر وہ مرد کہ جس کی آنکھوں سے اس کے لیے پسندیدگی بے طرح سے چھلکتی تھی اور ان دونوں کے درمیان۔ایک عورت۔قدم لحہ بہ لحہ اس رستے کو ناپ رہے تھے،فاصلہ کم کر رہے تھے جو کہ اس کے شوہر کی جانب تھا اور اس کی پشت ہر ایک احساس تھا جو کہ دہکتا تھا۔

گیٹ پار کر کے دائیں جانب مڑنے سے پہلے اس نے ذرا کی ذرا نظریں ترچھی کر کے دیکھا اور اس کا دل دھک کر کے رہ گیا، وہ ابھی تک اسی ایک حالت،اسی ایک کیفیت اور اسی زبردست دھچکے کے زیر اثر کھڑا تھا اور بے یقینی سے اسے تکتا تھا۔

☆......☆......☆

سمجھ تو اسے بے حد اچھی طرح سے آ گئی تھی کہ کس بھاؤ بکتی ہے لیکن یہ کہ اسے خود کو مار دینا منظور تھا مگر اپنی انا کو نہیں۔پیسہ دانتوں سے پکڑنے کے باوجود پکڑ میں نہیں آتا تھا۔یوں محسوس ہوتا تھا کہ تنخواہ جب ATM سے نکلتی تھی تو ساتھ میں پر لے کر نکلتی تھی۔یہ آئی،وہ گئی۔کل ملا کر دو افراد۔لیکن گزارہ مشکل۔ایک حصہ رینٹ میں گیا،ایک حصہ بل کے اخراجات پر خرچ ہوا۔پھر میڈز کی تنخواہیں،امی کی دوائیاں،ریگولر چیک اپس،ضروری گروسری اور معلوم نہیں کیا کیا۔اور گھر میں فرنیچر کی کمی کو بھی وہ اسی تنخواہ میں سے آہستہ آہستہ پورا کر رہا تھا۔پورا گھر فرنش کرنا بے حد مشکل ثابت ہو رہا تھا۔فرخندہ کا جو سامان تھا وہ تو احمد صاحب نے تب ہی سیل کر دیا تھا۔وہ بہت مہنگا فرنیچر تھا اور جہازی سائز کے بیڈز تھے جنہیں ایک پہلے سے پُر گھر میں فٹ کرنا مشکل تھا۔سو احمد صاحب نے زیادہ تر سامان سیل کر دیا تھا۔تب انہیں کیا معلوم تھا کہ بھانجے صاحب کو الگ گھر میں رہنے کی خواہش ستائے گی۔وہ تو یہ ارادہ کیے بیٹھے تھے کہ جہانگیر کی دلہن بھی اسی گھر میں آئے گی۔مزنہ اور خولہ نے کون سا ہمیشہ انہی کے پاس رہنا تھا۔مگر یہ جہانگیر۔سو بھگتے اب۔

☆......☆......☆

اسے تو ابھی جرمنی جا کر پڑھنا تھا۔اس کے لیے پیسہ جمع کرنا تھا مگر یہاں تو۔خیر،ان حالات نے اسے کچھ اور چڑچڑا بنا ڈالا تھا۔اس دن بھی جب وہ گھر آیا تو مزنہ کو وہاں موجود دیکھ کر اس کا پارہ چڑھا تھا۔

''امی!آپ کیوں آئے روز ان کو بلواتی رہتی ہیں،کبھی خولہ تو کبھی مزنہ۔میڈ کس مرض کی دوا ہے آخر۔''مزاج برہم۔موڈ بگڑا ہوا۔

''تمہیں یہ بات کیوں سمجھ نہیں میں آتی جہانگیر۔مجھے میڈ کی ضرورت نہیں،میرا دل گھبراتا ہے اکیلے۔''

''امی!آپ بچہ تو نہیں ہیں ناں،یہ آپ کی زندگی ہے اور یہ ایسی ہی رہے گی۔آپ کو اسے ایسے ہی گزارنا ہے۔کب تک ماموں کا احسان لیتا رہتا میں۔آپ کو اب تک کمپرومائز کر لینا چاہیے تھا لیکن آپ۔''وہ اور چڑا تھا۔

''تم شادی کرلو جہانگیر۔''

''ہیں؟''یہ تھا اس کا حل۔ایسا شاندار حل کہ اس کے چودہ طبق روشن ہوئے تھے۔

''کمال کرتی ہیں آپ بھی امی۔میں یہاں اپنے فیوچر کے لیے ہلکان ہو رہا ہوں اور آپ کو شادی کی پڑی ہے۔''

''تو شادی فیوچر نہیں ہوتی انسان کا؟''امی نے تو آج تہیہ کر رکھا تھا۔اسے زچ کر کے رکھ دینے کا۔

''امی پلیز۔''وہ بیزار ہوا۔

''جہانگیر!میرے بچے۔میری زندگی کی خوشی بس اب یہ ہی ہے۔میں یونہی نہیں مرجانا چاہتی۔جس طرح کہ تمہارے بابا چلے گئے۔میں تمہاری خوشیاں دیکھ کر مرنا چاہتی ہوں۔اتنا سا تو حق ہے ناں میرا تم پر کہ نہیں؟''

وہ جذباتی نہیں تھا۔نہ ہی کسی ایموشنل بلیک میلنگ کا شکار ہوا کرتا تھا لیکن باپ کی موت،اس کی دکھتی رگ تھی۔

''امی!مجھے تھوڑا سا وقت دے دیں پلیز۔میں اچھی طرح سے اسٹیبلش ہو جاؤں تو۔''

''اور یہ تھوڑا سا وقت گر میرے پاس ہی نہ ہوا تو؟''

اور وہ یک دم چپ ہوا تھا۔فرخندہ اسے دیکھ رہی تھیں اور وہ نظریں سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔

''مزنہ کیسی لگتی ہے تمہیں؟''

جہانگیر کا منہ اس سوال پر بے اختیار کھلا تھا۔

''امی!خدا کا خوف کریں۔میں نے کبھی ان دونوں کے بارے میں نہیں سوچا۔''وہ بدکا تھا۔

''میری حالت کو دیکھو جہانگیر،اس گھر کو دیکھو۔خود کو دیکھو اور پھر بتاؤ کوئی غیر مجھے،تمہیں اس گھر کو سنبھال سکے گی؟''وہ اس کے بازو پر ہاتھ رکھے سوال کر رہی تھیں۔

اور وہ یک دم الجھ گیا تھا۔

گھر کو چھوڑو۔ خود کو چھوڑو مگر امی۔ ان کا جیسا خیال مزنہ، خولہ رکھتی تھیں، رکھ سکتی تھیں یہ بالکل سامنے کی بات تھی۔ طے شدہ بات تھی۔ اس ایک کام میں کوئی دوسرا ان پر سبقت نہیں لے جا سکتا تھا۔

"میں تمہیں مجبور نہیں کرنا چاہتی تھی۔ تم اچھی طرح سے سوچ لو پھر بتا دینا۔ جیسے تمہاری مرضی ہوگی، ویسا ہی ہوگا۔" اس کو یوں الجھا ہوا دیکھ کر فرخندہ نے مسکرا کہتے ہوئے اس کا گال تھپکا تھا اور اس نے آہستگی سے سر ہلا کر ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چوما تھا۔ ماں اس کا واحد عزیز از جان رشتہ، ان کے لیے اسے اگر سر کے بل کھڑا ہونا پڑتا تو وہ بھی کر گزرتا۔

☆......☆......☆

"ابو!"

اخبار سامنے پھیلا تھا، نظریں بھی اخبار پر ہی تھیں لیکن پھر بھی یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اخبار نہیں پڑھ رہے۔ وہ پریشان نظر آرہے تھے۔ خولہ کے پکارنے پر ان کا چونکنا بنتا تھا اور وہ چونکے بھی۔

"کیا بات ہے، آپ پریشان ہیں؟" چائے کی پیالی ان کے سامنے رکھتے ہوئے وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔ احمد صاحب نے بے اختیار ایک گہری سانس بھری تھی لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔ اخبار جھٹک کر تہ کیا اور چائے کی پیالی اٹھالی۔

"مزنہ کہاں ہے؟" خولہ کو اپنے سوال کے جواب کی توقع تھی۔ اس سوال کی توقع نہ تھی۔

"اپنے کمرے میں ہے۔"

"کچھ کھایا اس نے؟"

جواباً خولہ نے ہونٹ بھینچ کر نفی میں سر ہلایا اور اسے یک دم ابو کی پریشانی کی وجہ بھی معلوم ہوگئی تھی۔ احمد صاحب کے چہرے پر پریشانی کچھ اور واضح ہوئی۔

"ابو! پھپو نے رشتے کا ہی کہا ہے ناں، آپ انکار کر دیں۔ جب مزنہ کی بھی مرضی نہیں ہے تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے۔" وہ ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نرم لہجے میں بولی تھی۔

"خولہ! مجھے کم از کم تم سے اس بات کی توقع نہیں تھی۔ تم سمجھدار ہو کر بھی ایسی بات کہہ رہی ہو۔ فرخندہ پہ کیا بیتے گی، کیا تم نہیں جانتیں؟" احمد صاحب ذرا سی ناراضی سے بولے۔

"مزنہ آپ کو انکار نہیں کرے گی ابو! لیکن وہ خوش بھی نہیں ہے، وہ جہانگیر سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ اب آپ محض پھپو کی خاطر، اس کی مرضی کے خلاف فیصلہ کریں گے۔ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی؟" احمد صاحب فوری طور پر کچھ نہ کہہ سکے تھے۔

"خولہ!" انہوں نے چائے کی پیالی رکھی اور ایک دم خولہ کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے تھے، لہجے کی نرمی عروج پر تھی۔

''اس مسئلے کا ایک حل ہوسکتا ہے اگر تم چاہو تو۔ میں تمہیں فورس نہیں کر رہا بیٹے محض ایک تجویز تمہارے سامنے رکھ رہا ہوں، مزنہ چھوٹی ہے، سختیوں کی عادی نہیں ہے اور جہانگیر کو ابھی وقت لگے گا پوری طرح سے اپنے پیروں میں کھڑے ہونے میں اور وہ مزنہ، اس نے تو برانڈڈ چیزوں سے نیچے کبھی کچھ لیا ہی نہیں، وہ یہ سب نہیں کر سکے گی لیکن۔'' احمد صاحب کا حلق یہاں آ کر یک دم بند ہوا تھا۔

اور خولہ، دھڑکتے دل کے ساتھ وہ ان کے منہ سے اگلی بات سننے کے انتظار میں تھی کہ گو کہ سمجھ تو آ ہی رہا تھا مگر پھر بھی وہ سننا چاہتی تھی۔

''لیکن تم۔ یہ کر سکتی ہو۔ تم بڑی ہو۔ میچور ہو، سمجھدار ہو، اگر تم اس رشتے کے لیے راضی ہو جاؤ تو۔''

اس نے یکدم اپنے ہاتھ ابو کے ہاتھوں سے کھینچ کر باہر نکالے تھے اور یہ ردِ عمل تھا۔ چند لمحے وہ نا سمجھی اور شاک کی سی کیفیت میں وہاں بیٹھی رہی اور پھر اچانک وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر ٹھہر سی گئی، یوں جیسے سمجھ نہ پا رہی ہو کہ اب کیا کرنا ہے۔

''آئی ایم سوری بیٹے۔ اگر تم ہرٹ ہوئی ہو تو۔'' احمد صاحب نے شکستہ آواز میں اس کے یوں کھڑے ہونے پر کہا تھا اور خولہ وہاں زیادہ دیر تک رک نہیں سکی تھی۔ تیز قدموں سے چلتے ہوئے وہ وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

☆......☆......☆

رات قطرہ قطرہ پگھلتی تھی۔ ٹپ ٹپ کر کے گزرتی تھی اور وہ شال کی بکل مارے دونوں بازو ٹانگوں کے گرد لپیٹے صحن کی سیڑھیوں پر بیٹھی، بے آواز رو رہی تھی۔ ماتھا بازوؤں پر ٹکائے۔ وہ اس طرح سے روتی تھی کہ گر کوئی کان لگا کر بھی سنتا ناں تو سسکی کی آواز بھی نہ آتی۔ مزنہ اپنے کمرے میں بے خبر سو رہی تھی۔ احمد صاحب بھی محوِ خواب تھے۔ نیند کس کی برباد ہوئی؟ اس کی جو کہ آدھی رات کو یوں بے آرام، تکلیف کی سی حالت میں بیٹھی تھی۔

یہ کوئی پہلی بار نہیں تھا کہ ابو نے یوں کیا ہو اور اس نے چپ چاپ سہہ لیا ہو۔

مزنہ کے ساتھ بچپن میں ایک حادثہ ہوا تھا اور اسی حادثے نے مزنہ کو احمد صاحب کے اس قدر نزدیک کر دیا تھا کہ اس کے سامنے انہیں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ اکثر خولہ سے زیادتی کر جاتے تھے، بچپن میں جب کبھی وہ احتجاج یا ضد کرتی۔ تب بھی اسے ہی سمجھایا جاتا کہ مزنہ کے ساتھ تو ایسا ہوا ہے، تم تو بڑی ہو، سمجھدار ہو، تمہیں مزنہ کے ساتھ اچھے سے پیش آنا چاہیے نہ کہ یوں ضد کرنی چاہیے۔ تب تو امی بھی زندہ تھیں۔ ابو کے ساتھ ساتھ وہ بھی اسے ہی سمجھانے بیٹھ جاتی تھیں۔ خولہ کو تو اب عادت سی ہو چکی تھی لیکن یہ۔ یہ سخت تھا، شدید تھا، بدتر تھا، زندگی کا معاملہ تھا، مذاق تھوڑی تھا کوئی؟

جہانگیر کبھی بھی وہ شخص نہ ہوتا جس کے ساتھ وہ زندگی گزارنے کا سوچتی۔ وہ ایک مشکل شخص تھا اور ابو۔ وہ کیا چاہ رہے تھے، کیا کرنا چاہ رہے تھے وہ۔ یہ چیزوں یا کھلونوں کا معاملہ نہ تھا، زندگی تھی زندگی۔ ایک ایسی زندگی جو ابو مزنہ کے لیے سوٹ ایبل نہیں سمجھتے تھے اور وہ

چاہتے تھے کہ وہ زندگی خولہ گزار لے، محض اس لیے کہ وہ یہ کر سکتی ہے۔ خولہ بھی تو ان ہی کی بیٹی تھی، ان کا ہی خون تھی تو پھر ایسا تضاد کیوں؟

''کیا بہت سے کام کر لینے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک ناپسندیدہ شخص کے ساتھ ایک مشکل زندگی گزار لی جائے، کیا یہ ہی۔''

اذیت حد سے بڑھ چکی تھی اور وہ رو رو کر خود کو ہلکان کر رہی تھی۔ تکلیف جیسے پانی بن کر اپنا آپ عیاں کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

''ابو نے ایسا کیوں کیا۔ کیوں؟ ہمیشہ مزنہ کو فوقیت دی، ترجیح دی۔ تو کیا میں لوہے کہ بنی تھی اور مزنہ نازکی کا پیکر۔''

سوچیں نہیں تھیں، وہ زہر تھا زہر۔ جو کہ نس نس میں پھیل کر انہیں کاٹ کر رکھ دینے کا موجب بن رہا تھا۔ وہ بکھر رہی تھی۔ پرزہ پرزہ ہو جانے کو تھی۔

''نہیں۔ اس بار نہیں۔''

اصولاً تو خولہ کا جواب یہ ہی ہونا چاہیے تھا۔ اسے اب کی بار اسٹینڈ لے ہی لینا چاہیے تھا۔ زندگی تھی، کوئی بے ڈھنگا مذاق نہیں لیکن وہ عجیب کیفیت تھی جس کا وہ شکار ہوئی تھی۔ اس کیفیت کے لیے گر کوئی موزوں ترین لفظ تھا تو وہ ایک ہی تھا۔ ''خود اذیتی۔''

''ٹھیک ہے ابو کو بھی پتا چلنا چاہیے تھا کہ انہوں نے میرے لیے کس قدر غلط شخص کو چنا۔ کس قدر غلط فیصلہ کیا۔ مزنہ کے سر سے اتار کر جو بلا وہ میرے سر ڈال رہے ہیں اس کو صرف میں ہی نہیں بھگتوں گی، وہ بھی بھگتیں گے۔ مزنہ جتنی بھی پیاری سہی اور چاہے کچھ بھی ہو مگر میں اولاد ہوں اور جب میں تکلیف میں ہوں گی تو راحت ان کو بھی نہیں پہنچے گی۔ تب کیسے پہنچ سکے گی راحت انہیں؟''

دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے رگڑ کر آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے آگ میں کودنے کا نہیں، جلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ محض یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اس کے ابو کا فیصلہ اگر مزنہ کے لیے ٹھیک نہیں تھا تو اس کے لیے بھی درست نہیں تھا۔ کس قدر مضحکہ خیز، تکلیف دہ بات ہے ناں کہ کبھی کبھی انسان کو محض ایک چھوٹی سی بات سمجھانے کے لیے پوری زندگی داؤ پر لگانی پڑتی ہے، دان کرنی پڑتی ہے، ضائع ہو جاتی ہے، یہ جتنی مضحکہ خیز بات ہے، اتنی ہی تکلیف دہ اور اذیت ناک بھی ہے کہ زندگی، صرف ایک بار کا نام۔ بار، بار بھلا کب۔ کس نے دیکھی کب؟ کیا دیکھی کبھی کسی نے؟

☆......☆......☆

''خولہ بڑی ہے فرخندہ۔ اس کو چھوڑ کر گر میں مزنہ کی شادی کر دوں تو تم خود سوچو وہ کتنا آکورڈ فیل کرے گی۔ میرے لیے وہ دونوں برابر ہیں لیکن تم ذرا سا خیال کرو تو خولہ کو اپنی بہو بنا لو۔''

اندھی محبت بھی کیا چیز ہے۔ جیسے ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ ویسے ہی یہ اندھی محبت بھی بڑی راہ دکھلا دیتی ہے۔ کس صفائی سے احمد صاحب نے مزنہ کو بچایا تھا۔ ستم یہ کہ یہ گفتگو خولہ نے سن لی تھی۔ پرزے کچھ اور اڑے، ٹکڑے کچھ اور۔ اور بے اختیار اس کے لبوں پر اِک طنزیہ مسکراہٹ ابھری تھی۔

”سب سے بڑی زیادتی یہ ہے کہ زیادتی کو سہہ لیا جائے۔“ لیکن قصور خولہ کا بھی اتنا نہیں تھا۔ بچپن سے ہی یہ سب دیکھتی آ رہی تھی اور اب نفسیاتی طور پر وہ اس انتہا کو جا پہنچی تھی کہ جسے خود اذیتی کا نام دیا جاتا ہے۔ ہم کیوں ایسا کرتے ہیں، کیوں؟ کیوں ہم اپنے ہی رشتوں کو، خون کے رشتوں کو اتنا زیر بار کر دیتے ہیں؟ کیوں ہم یہ سوچ لیتے ہیں کہ ایک انسان محض سہنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے؟ ہم رک کر، ذرا سا ٹھہر کر۔ یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ ہمارے رویے کہیں ہماری اپنی ہی اولاد کو تباہ تو نہیں کر رہے؟ ٹھیک ہے کوئی ایک اولاد کوئی ایک بچہ کسی خاص صورتِ حال کی وجہ سے عزیز ہو جاتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب بنتا ہے نہ نکلتا ہے کہ آپ باقی اولاد کو زک پہنچائیں اور یہ چاہے اپنے رویے سے ہی کیوں نہ ہو۔ ہم کب نارمل ہونا سیکھیں گے؟ کب ہم درمیانی راہ پہ چلنا سیکھیں گے۔؟ آخر کب؟

کیا یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ماں، باپ اپنی ہی اولاد کی زندگی خراب کر دیں؟ جواب ایک سا ہوگا، یک لفظی۔ ہوگا کہ ”نہیں“ لیکن یہ بے ڈھنگا جھوٹ ہے۔ بکواس ہے، ہمارے معاشرے میں اکثر ماں، باپ ہی اولاد کی زندگی خراب کرنے کا باعث بنتے آئے ہیں، بے جوڑ شادیاں، اولاد سے زیادہ چاچے، مامے، پھوپیوں کی پرواہ۔ ساری عمر پال پال کر اور جب زندگی بنانے کی بات آتی ہے تو رشتوں کے نام پر پریشرائز ہو کر ماں باپ بچوں کی زندگی خراب کرنے کا باعث بن جاتے ہیں اور آفرین ہے ان بیٹیوں پر جو کہ ساری عمر ”لاج“ کو سنبھالتے ہوئے ہی گزار دیتی ہیں۔ ایک بے جوڑ شادی کو، اعلیٰ جوڑ ثابت کر کے دکھا دیتی ہیں۔ خولہ گر ایسی نہیں تھی مگر وہ ایسی بن گئی۔ بظاہر دکھنے میں فرمانبردار، اچھی بیٹی مگر در حقیقت یہ اس کا انتقام تھا۔ انتقام۔ وہ اگر جلے گی تو آنچ ان کو بھی محسوس ہوگی جو کہ اس کے پیارے تھے۔ یہ انوکھا انتقام تھا، انتقام۔

☆......☆......☆

دل دھڑکتا تھا نہ خوشی محسوس ہوتی تھی۔ اک جامد، بے حس سا احساس تھا جو کہ پورے وجود کو کفن کی طرح لپیٹے ہوئے تھا۔ گو کہ سرخ لباس میں ملبوس تھی۔ بیڈ پر مجسمہ ہو کر بیٹھی وہ اس حقیقت کو قبول کرنے کی کوشش میں تھی کہ اس کی شادی جہانگیر سے ہو چکی تھی۔ منگنی چند ماہ تک رہی تھی اور ان چند ماہ میں۔ جہانگیر نے کبھی کوئی میسج کیا نہ ہی کوئی اور بات، کبھی جو آمنا سامنا ہوا تھا۔ السلام علیکم، وعلیکم السلام۔ اور بات ختم۔ جیسا اس کا حال تھا، ویسا ہی جہانگیر کا تھا۔

یہاں اس کا باپ تھا، وہاں اس کی ماں۔ وہ باپ کے ہاتھوں مجبور ہوئی تھی تو جہانگیر ماں کے واسطے۔ دونوں کی مجبوریاں ایک سی۔ ایک مشرق تو دوسرا مغرب۔ زندگی۔ تو اب کیسے گزرے گی؟ ہاں، کیسے؟

دروازہ ہلکی سی چرر کی آواز سے کھلا۔ کمرے کا پرسکوت ماحول ارتعاش زدہ ہوا تھا۔ وہ بے اختیار کانشس ہوئی تھی۔ دروازہ بند ہونے کی آواز آئی، سکوت ایک بار پھر پھیل سا گیا تھا۔ اب قدموں کی چاپ ابھری تھی۔ جہانگیر نے کوٹ اتار کر صوفے پر اچھالا، وہ اب صوفے پر بیٹھ کر جوتے کے تسمے کھول رہا تھا اور وہ گود میں ہاتھ رکھے سر جھکائے خاموش۔

http://kitaabghar.com

''کتنا عجیب لگ رہا ہے ناں یہ سب۔ تم، میری بیوی، مجھے تو بے حد عجیب سا محسوس ہو رہا ہے، کیا تمہیں بھی ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔'' جوتے اتارتے ہوئے وہ بے حد عام سے لہجے میں بولا تھا۔

خولہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''ہاں۔ مجھے بھی اتنا ہی عجیب محسوس ہو رہا ہے۔'' اور اس کا تو لہجہ بھی عجیب سا ہو رہا تھا۔

''میں نے کبھی ایسا نہیں ہو چا تھا۔ ان فیکٹ مجھے تمہاری چلتی زبان سے بڑی کوفت ہوا کرتی تھی۔''

''کیا کہا جا سکتا ہے۔ اب یہ کوفت تو ساری عمر کی ہے۔'' وہ کندھے اچکا کر ذرا سا مسکرائی۔ جہانگیر نے چونک کر اسے دیکھا اور ہنس دیا۔

''تو تم نے ثابت کر دیا کہ تمہاری زبان آج بھی اتنی ہی چلتی ہے۔''

''میں آگے بھی ثابت کرتی رہوں گی، ڈونٹ یو وری۔'' وہ ذرا جو جھجکی ہو۔ جہانگیر نے اب کے ماتھے پر بل لیے اسے دیکھا۔

خولہ کی نظر اٹھی۔ نظریں بے تاثر تھیں۔

''خولہ! مجھے فضول باتیں پسند نہیں۔''

''میں اچھی طرح سے جانتی ہوں۔''

بیڈ سے نیچے اترتے ہوئے، وہ اب بھی جواب دینے سے باز نہیں آئی تھی۔

''اب کیا بس لڑنے کا ارادہ ہی ہے؟'' وہ خفا سا نظر آیا تھا۔

''نہیں۔'' اس کا لہجہ اب کہ ذرا سا نرم ہوا تھا اور کہہ کر وہ رکی نہیں تھی، چینج کرنے چلی گئی تھی۔

''زندگی تو اب ایسے ہی گزرے گی، ایسے ہی۔''

☆......☆......☆

''یہ چائینیز ٹرائی کریں، پہلی بار بنایا ہے آج۔'' وہ جہانگیر کے سامنے چاولوں کی ٹرے رکھتے ہوئے بولی تھی۔

رات کا کھانا کھایا جا رہا تھا۔ تین لوگ تھے لیکن ٹیبل پر اہتمام آج معمول سے زیادہ تھا جو کہ یہ اعلان کرتا تھا کہ خولہ نے سارا دن آج پھر کچن کی نذر کیا ہے۔ جہانگیر نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر ذرا سے چاول اپنی پلیٹ میں نکالے تھے۔

''کیا یار۔ تم ہر وقت فضول فضول سے کھانے بناتی رہتی ہو۔ تمہیں ہوم اکنامکس میں ماسٹر کرنا چاہیے تھا نہ کہ MS۔MS کر کے تو تم نے ماموں کا پیسہ ہی برباد کیا ہے۔'' اس کے چہرے پر طنزیہ سے تاثرات تھے، خولہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ فرخندہ بھی چونکی تھیں۔

''بھلا پیسہ کیوں برباد کیا ہوا؟ تعلیم تو تعلیم ہوتی ہے۔'' اسے جہانگیر کی بات چبھی تھی۔

''تعلیم صرف وہ ہوتی ہے جو آپ کو monetary benefits دے۔ باقی اگر شعور حاصل کرنا ہے تو پھر بی اے، ایف اے کافی ہے۔ اس سے زیادہ شعور حاصل کر کے لڑکیوں نے کرنا کیا ہے؟'' اس کا لہجہ اب طنز کے ساتھ ساتھ تمسخر کا عنصر بھی لیے ہوئے تھا۔ وہ رغبت سے کھا رہا تھا اور خولہ۔ وہ چبھتی مگر کھوجتی نظروں سے جہانگیر کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے اندازہ کر چکی ہو کہ یہ لہجہ، یہ باتیں، یہ انداز، کس چیز کی تمہید تھی۔

''تو، تم کیا چاہتے ہو؟ اس MS کا کیا کروں؟''

اب کی بار اس نے ٹھنڈے مگر پرسکون لہجے میں پوچھا تھا۔ جہانگیر نے پلیٹ پر جھکا سر اٹھایا۔ مسکرا کر اسے دیکھا اور۔

''تم اسے اٹالین اور چائنیز کھانے بنانے کے لیے استعمال کرو اور کرنا بھی کیا ہے تم نے۔''

اور یہ بہت سخت تھا۔ خولہ کا رنگ لمحوں میں بدلا تھا۔

''جہانگیر!'' فرخندہ نے سخت لہجے میں تنبیہہ کی اور وہ برے موڈ کے ساتھ اٹھ گیا۔

''چھوڑو اسے تم کھانا کھاؤ۔'' اور خولہ کو اگر دیکھو تو لگتا تھا جیسے اسے سانپ سونگھ گیا۔

''وہ اب کیا چاہ رہا تھا اس سے۔ کیا؟''

☆......☆......☆

ہاف فرائی ایگ کی پلیٹ ٹیبل پر رکھ کر وہ چائے رکھنے دوبارہ کچن میں گئی تھی اور جب چائے چولہے پر چڑھا کر واپس آئی تو جہانگیر ابھی تک ناشتا کرنے نہیں آیا تھا۔ اس نے بے اختیار وال کلاک کی طرف نظر کی۔ وہ معمول سے لیٹ تھا۔ خولہ کو حیرت ہوئی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا کہ جن کو دیکھ کر گھڑیوں پر وقت درست کیا جاتا ہے۔

''جہانگیر!'' اسے پکارتے ہوئے وہ کمرے کی طرف بڑھی تھی۔

''جہانگیر آج ناشتا۔'' اور اس کے آگے کے لفظ ادا نہ ہو سکے تھے۔ وہ آفس جانے کے لیے بالکل تیار کھڑا تھا اور موڈ اچھا خاصا برہم دکھائی دیتا تھا۔

''ناشتا؟'' اس نے احتیاط سے سوال چنا۔

''خود ہی کرو اپنے ذائقے دار ناشتے۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔'' اور احتیاط کا بھلا کیا فائدہ ہوا۔ خولہ نے کسی نادیدہ کڑوے گھونٹ کو حلق سے نیچے اتارا تھا۔

''شام میں تیار رہنا۔ ایک پارٹی پر انوائٹڈ ہیں۔'' کھینچ کھینچ کر غصے سے موزے پہنتے ہوئے وہ بولا۔ خولہ کو اتنا غصہ آیا کہ اس نے جواب ہی نہیں دیا۔ بندہ پوچھے کہ مزاج برہم کیوں؟ کوئی وجہ؟ کوئی غلطی بھی تو ہو آخر۔ شوہر ہونے کا مطلب یہ کہ جب چاہا ناک کے نتھنے پھلا کر بے عزتی کر دینے والے اسٹائل میں بات کی جائے۔

''سن رہی ہو، شام میں تیار رہنا۔'' اور جب وہ اپنی انہی سوچوں میں مگن، سوچوں میں ہی غصے سے بل کھا رہی تھی تو اچانک کندھے کو کسی لوہے کے شکنجے نے جکڑ کر اچھا خاصا جھٹکا دے کر پوچھا تھا۔

''سی۔'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تھا۔ کندھے پہ جہانگیر کا ہاتھ تھا۔ یہ ذرا سی دیر بعد سمجھ آیا تھا۔

''صحیح۔'' ایک اور تلخ گھونٹ اتارا گیا اور نم سا احساس آنکھوں میں ابھر آیا تھا۔ اور وہ۔ وہ بڑبڑاتا ہوا، لیپ ٹاپ کا بیگ کندھے پر ڈالتے ہوئے نکل گیا تھا۔ خولہ، وہ وہیں کھڑی سلگتی تھی لیکن ختم نہ ہوتی تھی کہ نجانے ختم ہونے میں ابھی اور کتنی دیر باقی تھی۔

''یہ میری زندگی تو نہیں تھی۔ یہ مزنہ کی تھی جو میں جی رہی ہوں۔'' ایک نئی، عجیب سی سوچ ذہن میں ابھر کر، یکدم ہی آن سمائی تھی۔

☆......☆......☆

''پھپھو! نائلہ کو میں نے سمجھا دیا ہے وہ آپ کو میڈیسن دے دے گی اور پلیز کھانا وقت پر کھا لیجیے گا۔ دونوں بیٹھ کر انڈین ڈرامے ہی نہ دیکھتی رہیے گا۔'' جوتے کے اسٹرپس بند کرتے ہوئے مصروف سا عجلت بھرا انداز۔ وہ پھپھو کو ہدایتیں دے رہی تھی۔

فرخندہ اس کے انداز پر مسکرا دیں۔

''ادھر آؤ۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے، اسے دیکھتے ہوئے اپنے پاس بلایا تھا۔

''جی۔'' انداز میں بے توجہی تھی، وہ اب اپنے چوڑی دار بازوؤں کو ٹھیک کرنے میں مشغول تھی۔ فرخندہ نے زیر لب آیت پڑھ کر پھونکی تھی۔ وہ چونکی اور پھر بے اختیار ہنس دی تھی۔

''پھپھو!'' ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر ان کا گال چوما تھا۔

''بہت پیاری لگ رہی ہو۔'' فرخندہ کے کہنے پر مسکراہٹ اور گہری ہوئی۔

''کیا فائدہ؟'' وہ مسکراتے ہوئے بازوؤں کو ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔

''آپ کا بیٹا سڑا ہوا ہے۔'' ناک چڑھا کر کہا۔ فرخندہ ہنس دی تھی۔

''ٹھیک ہو جائے گا۔'' اور پھر اس کا ہاتھ تھام کر۔ تسلی دینے کے سے انداز میں بولی تھیں۔

خولہ کی مسکراہٹ پھیکی پڑی لیکن جلد ہی اس نے خود کو کمپوز کر لیا تھا۔ کچھ کہنے کو منہ کھولا لیکن باہر سے بائیک کا زوردار ہارن سنائی دیا تھا۔ وہ بوکھلا کر اٹھی تھی۔

''میں چلتی ہوں پھپھو، اللہ حافظ۔'' تیزی سے کہہ کر وہ کمرے کی طرف بھاگی، اپنا پاؤچ اٹھایا، چادر لی اور پھر تیزی کے ساتھ وہ باہر پورچ میں آئی تھی۔ اس کی تمام تر تیزی اور جلدی کے باوجود جہانگیر کے ماتھے کے بل صاف دیکھے جا سکتے تھے۔ خولہ نے اس سے نظریں چرائیں۔ جہانگیر نے اسے گھورتے ہوئے بائیک اسٹارٹ کی تھی لیکن غنیمت تھا کہ منہ سے پھول نہیں جھڑے تھے۔ خولہ نے شکر کی سانس

بھرتے ہوئے گیٹ باہر سے مقفل کیا اور بائیک کے پیچھے آ بیٹھی تھی۔ وہ جب آتے تو خود ہی گیٹ کھول دیتے۔ نائلہ اور فرخندہ تب تک سو چکی ہوتیں، اسی بنا پر گیٹ باہر سے مقفل کیا گیا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی جہانگیر نے بائیک چلائی نہیں اڑائی تھی اور اس کا سیاہ آنچل ہوا میں لہراتا ہوا بل کھاتا، دور سے ہی دیکھا جا سکتا تھا۔

☆......☆......☆

"اتنے بڑے ہوٹل میں بائیک پر آنا quite insulting۔" وہ پارکنگ میں بائیک کھڑی کرتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔

"تو ابو سے گاڑی۔"

"ہونہہ۔" خولہ کی بات کو اس نے ایک ہونہہ سے کاٹا تھا۔ وہ چپ کی چپ رہ گئی تھی۔ جہانگیر اپنا کوٹ اور ٹائی ٹھیک کرتے ہوئے آگے بڑھا۔ خولہ نے بھی اس کی پیروی کی تھی مگر ایک دم اسے پیچھے کو جھٹکا لگا تھا۔ اس کی شال بائیک کے کسی پرزے کے ساتھ اٹکی تھی۔

"جہانگیر!" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ وہ جو چند قدم آگے جا رہا تھا۔ آواز پر پلٹا اور اسے دیکھا۔ اور اس کے بعد۔ اس کے بعد وہ بھول گیا کہ کسی نے آواز دی تھی اور اگر آواز دی تھی تو کیوں دی تھی، وہ کتنی اچھی لگ رہی تھی ناں۔ اچھی سے زیادہ پروقار، سر پر بلیک شیفون کا دوپٹہ سلیقے سے اوڑھے ہوئے کندھے پر شال۔ سرخ اور سیاہ امتزاج کا لباس اس پر بے حد جچ رہا تھا۔ وہ جہانگیر کے یوں دیکھنے پر سٹپٹائی اور مڑ کر خود ہی شال چھڑوانے کی کوشش کرتے ہوئے زمین پر بیٹھی تھی۔ اسے دراصل سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ شال اٹکی تو اٹکی کدھر۔ جہانگیر نے مسکراہٹ دبائی اور اس تک آیا۔ اس کے پاس پنجوں کے بل بیٹھتے ہوئے شال کو دیکھنے کے بجائے، اسے دیکھتے ہوئے اس کی شال آزاد کرائی تھی۔ خولہ نے اس حرکت پر گھور کر اسے دیکھا، وہ مسکراہٹ پر قابو نہ کر سکا تھا۔

"اچھی لگ رہی ہو۔" آواز سرگوشی کی صورت بلند ہوئی تھی۔ خولہ مسکراتے ہوئے اٹھی۔

"مجھے پتا ہے۔" اعتماد واپس آتے دیر نہ لگی۔

"یعنی کہ میرے کہنے کی اہمیت ہی نہیں۔" وہ شاکڈ ہوا۔

"ہاہاہا۔" خولہ قہقہہ لگا کر ہنسنے پر مجبور ہوئی تھی۔

ان دونوں کے سروں پر موجود آسمان کہ جہاں رات کی سیاہی تاروں کی ٹمٹماہٹ کو نمایاں کر رہی تھی۔ اس کے ہنسنے پر یوں محسوس ہوا تھا کہ وہ ٹمٹماہٹ کچھ اور نمایاں ہوئی تھی۔ وہ اس کی زندگی کے گنتی کے خوب صورت لمحوں میں سے پہلا لمحہ تھا ورنہ وہ کیا جانے کہ میریڈ لائف خوب صورت بھی ہوتی ہے اور یہ کہ اسے انجوائے بھی کیا جاتا ہے، خولہ کیا جانے؟ اسے کیا معلوم؟ کہ زندگی، جہانگیر کی صورت میں ایک سخت چیز بن کر اسے ملی تھی۔

☆......☆......☆

''تمہیں ہوا کیا ہے آخر؟'' وہ چینج کر کے آئی تو جہانگیر کا موڈ بدستور بگڑا دیکھ کر پوچھے بنا نہیں رہ سکی تھی۔

پارٹی کا آغاز تو بہت اچھے موڈ کے ساتھ ہوا تھا مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا جہانگیر کا موڈ خراب ہوتا گیا تھا۔ خولہ کی سمجھ سے باہر تھا کہ ہوا تو ہوا کیا آخر؟ وہ تو جتنے اچھے طریقے اور اخلاق سے اس کے احباب سے مل سکتی تھی، وہ ملی تھی۔ اب ایسا کیا ہوا تھا جو وہ یوں منہ پھلائے بیٹھا تھا۔ وہ پوچھنا نہیں چاہتی تھی، بے حد تھکی آئی تھی اور اس وقت وہ بس آرام کرنا چاہتی تھی لیکن جہانگیر کو دیکھ کر پوچھے بنا رہ نہیں سکی تھی۔ پوچھ تو لیا مگر فائدہ کیا ہوا؟ اس نے ایک تیز نظر سے خولہ کو گھورا اور پھر سے گود میں رکھے لیپ ٹاپ پر مصروف ہو گیا تھا۔ خولہ کو رہ کر تاؤ آیا لیکن کیا کیا جا سکتا تھا کہ وہ صاحب بہادر تھے۔ مڑ کر ناک کے پھولے ہوئے نتھنوں کے ساتھ وہ اپنے کپڑے الماری میں ہینگ کرنے لگی تھی۔

''لمحوں کا فسوں ختم ہوتے بس اتنی سی دیر لگتی ہے کیا؟'' وہ آزردہ ہوئی جس پل جہانگیر اسے اچھا لگنے ہی لگتا تھا اس سے اگلے ہی پل میں اسے ایک تکلیف دہ بات سہنی پڑ جاتی تھی۔ اس کے نرم جذبات کا فور ہونے میں دیر نہیں لگاتے تھے۔ یہ تو طے تھا کہ وہ ان عورتوں میں سے نہیں تھی جنہیں اپنے شوہروں سے محبت ہوتی ہے یا ہو جاتی ہے یا وہ محبت کرنے کے جواز، بہانے ڈھونڈ ہی لیتی ہیں۔ اس کے لیے شادی بس ایک کمپرومائز۔ اور کچھ بھی نہیں۔ کہاں کی محبت اور کدھر کا فسانہ، ہونہہ۔ زندگی تلخ ہے، دل کو مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ محبت کوشش سے مشروط نہیں اور اس وقت اس کا دل اتنا برا ہو رہا تھا کہ جی چاہ رہا تھا کہ جہانگیر کی شکل تک نہ دیکھے۔ اور جی کے چاہنے سے بھلا آج تک کچھ ہوا ہے جو خولہ کے ساتھ ہوتا۔ نپے تلے قدموں کے ساتھ وہ بیڈ تک آئی تھی، نیند آ جاتی یہ ہی غنیمت ہوتی۔

''تم نے جنگلوں میں رہ کر MS مکمل کیا ہے خولہ؟'' اس سے پہلے کہ اس کی سونے کی کوششیں بار آور ثابت ہوتیں، اسے ایک سخت ناگوار لہجے میں پوچھے جانے والے سوال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ لیٹی ہوئی تھی۔ اس سوال پر چونک کر اٹھی تھی۔

''جی؟'' سوال سمجھ تو آ گیا تھا۔ پھر بھی اس کا سوالیہ حیرت بھرا جی معلوم نہیں کس بات کی یقین دہانی چاہتا تھا۔ جہانگیر نے اس کے جی کرنے پر ٹھک سے لیپ ٹاپ کا lid گرایا۔ پٹخنے کے سے انداز میں اٹھا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا تھا اور پھر رخ انور اس کی طرف موڑا۔

''کہیں سے جو تم پڑھی لکھی لگتی ہو؟ حلیہ دیکھا تھا آج اپنا اور پارٹی میں موجود دوسری عورتوں کو دیکھا تھا؟ خود ہی جج کرو کہ تم کہاں اسٹینڈ کرتی ہو، اور تمہارا ڈریس۔ کوئی اچھا ڈریس نہیں ہے تمہارے پاس؟ نہیں تھا تو مجھے بتا دیتیں، میں دلوا دیتا۔ اس طرح سے کوفت اور شرمندگی تو نہ اٹھانی پڑتی کہ جی یہ میری انیس سو ڈیڑھ کی عظیم، فقید المثال یادگار۔'' اور لہجے کی کڑواہٹ تکلیف دیتی تھی۔ چلو بات تکلیف تک ہوتی تو سہہ لی جاتی یہ انسلٹنگ تھا۔ خولہ کا چہرہ فق ہوا تھا۔

''بے حیائی اور۔''

''اوہ کم آن!'' جہانگیر نے بے ساختہ اس کی بات کاٹی۔

http://kitaabghar.com

''اب وہ ہی گھسا پٹا جملہ نہ دہرانا، سوسائٹی میں موو کرنا آنا چاہیے، تعلقات بنانے آنے چاہئیں، پیسہ، پیسہ ہی سب کچھ ہوتا ہے، اقدار نے آج تک کسی کو دیا ہی کیا ہے؟'' اس کے لہجے کی کڑواہٹ اب کے ذرا کم تھی لیکن پھر بھی اس کی کہی بات نے خولہ کو ٹھیک ٹھاک جھٹکے سے دوچار کیا تھا۔

''میں تمہاری بیوی ہوں جہانگیر۔ کوئی بزنس تو نہیں۔'' وہ شاکڈ تھی۔

''تو میں کب کہہ رہا ہوں کہ تم بزنس ہو۔''

''تو اور تم؟ کیا کہہ رہے ہو۔؟ آئی ایم سوری مجھے تو تمہاری کہی بات کا یہی مطلب سمجھ آیا۔ کچھ اور مطلب تھا تو پلیز مجھے سمجھا دو۔'' خولہ کا لہجہ اب کے ذرا تیز تھا۔

''میں تو تمہیں صرف اپ ٹو ڈیٹ ہونے کا کہہ رہا ہوں خولہ! کم از کم انسان کے حلیے سے یہ تو پتا چلنا چاہیے کہ وہ ایک باشعور، ایجوکیٹڈ انسان ہے۔''

خولہ نے سماعتوں اور فہم کے سارے دروازے کھول کر اس کی بات کو سنا تھا لیکن لفظ پکڑ میں نہیں آتے تھے۔ سمجھ میں ٹھہرتے ہی نہیں تھے اور وہ لمحہ اس طرح سے اس پر حاوی ہوا تھا کہ اسے کمزور کر گیا تھا۔ اپنی آنکھ میں یکدم ابھرنے والے آنسوؤں کو قابو کرنے میں وہ بے بس تھی۔ وہ بہہ پڑے تھے۔ اس نے چہرہ موڑ کر انہیں چھپانا چاہا تو۔

''ادھر۔ ادھر کرو ذرا منہ۔'' جہانگیر نے ہاتھ سے پکڑ کر اس کا چہرہ اپنی طرف کیا تھا۔ اسے اور شدت سے رونا آیا۔ وہ چند لمحے دانت پیستے ہوئے اس کے چہرے پر بہنے والے آنسوؤں کو دیکھتا رہا اور پھر ایک جھٹکے سے اس کا چہرہ چھوڑا تھا۔

''بات بعد میں ہوتی ہے، رونا پہلے آ جاتا ہے، جاؤ کمرے سے باہر جا کر یہ نیر بہاؤ، مجھے ڈسٹرب مت کرو۔''

اس کی بات ختم ہوتے ہی خولہ ایک جھٹکے سے اٹھی، زور سے دروازہ کھولا اور کمرے کی دہلیز کے پار کرتے ہی دونوں ہاتھ منہ پر رکھے وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔ دروازہ اس کی پشت پر بند ہو چکا تھا۔ وہ تو یوں روتی تھی کہ کان لگا کر بھی سنو ناں تو سسکی کی آواز نہ آئے، گمان تک نہ گزرے کہ یہاں کوئی کس کرب سے گزر رہا ہے اور کرب کس طرح سے آنکھوں سے بہہ رہا ہے۔ کان لگا کر سنو بھی تو نہ پتا چلے کہ سسکی خموشی کی زبان میں ادا ہوتی تھی۔

☆......☆......☆

یہ اس واقعے کے قریب دو ماہ کے بعد کی بات تھی اور یہ محض اتفاق ہی تھا۔ جہانگیر کے کسی دوست کی شادی تھی۔ فیملی انوائٹڈ تھی اور وہ خولہ کو ساتھ ہی لے کر جانا چاہتا تھا لیکن اس طرح سے نہیں کہ جس طرح سے وہ پہلی پارٹی اٹینڈ کر چکے تھے۔ اسے خولہ مکمل طور پر بدلی ہوئی چاہیے تھی۔ جہانگیر نے ہی اسے ہیئر کٹ اور ہیئر ڈائی کا مشورہ دیا تھا۔ خولہ نے مان لیا۔ اس نے خود خولہ کی وارڈروب چیک کی تھی اور ایک بھی سوٹ، ایک بھی ڈریس اس کے معیار پر پورا نہیں اتر سکا تھا۔ حالانکہ ان میں سے کوئی ڈریس رد کیے جانے والا نہیں تھا۔ وہ

سارے ڈریسز بہت مہنگے نہ سہی مگر اچھے پارٹی وئیرز تھے لیکن جہانگیر کو کون سمجھا تا۔

آج وہ خولہ کو لے کر مارکیٹ جا رہا تھا۔ ایک اچھا، معیاری، جدید اور خوب صورت ڈریس دلوانے۔ اصولاً تو خولہ کو خوش نہیں بے حد خوش ہونا چاہیے تھا کہ اس کا شوہر اسے خود شاپنگ پر لے کر جا رہا تھا۔ اس پر پیسے خرچ کر رہا تھا۔ وہ اسے خوب صورت اور بہترین دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن مسئلہ یہ کہ وہ یہ سب کرکس کے لیے رہا تھا۔ خولہ کے لیے؟ اپنے لیے؟ نہیں۔ صرف اور صرف اپنے اسٹیٹس کے لیے۔ خولہ شدید ناخوش تھی مگر حسب عادت خاموش تھی۔

کوئی بھی عزت دار عورت شوپیس بننا پسند نہیں کرتی اور خولہ بھی ایک عزت دار عورت تھی مگر اس کی عزت کو جہانگیر کے بوٹوں تلے آتے دیر نہیں لگتی تھی۔ انہوں نے پوری مارکیٹ چھان ماری تھی۔ مسئلہ یہ نہیں تھا کہ ڈریس پسند نہیں آ رہا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ جو پسند آتا تھا وہ رینج سے باہر ہوتا تھا۔ جہانگیر، خولہ کو ویسا ہی لباس لے کر دینا چاہتا تھا جیسے کہ اس نے اس دن پارٹی میں دوسری عورتوں کو پہنے دیکھا اور خولہ بہت اچھے سے جانتی تھی کہ ویسا کوئی بھی لباس پندرہ بیس ہزار سے کم کا نہیں تھا اور اس نے یہ بات جہانگیر کو سمجھانے کی کوشش بالکل بھی نہیں کی تھی۔

کچھ لوگوں کو ہاتھ جلنے کے بعد سمجھ آتی ہے کہ اچھا تو وہ آگ تھی، جس نے جلایا۔ وہ بس خاموشی سے اس کے ساتھ ایک دکان سے دوسری دکان میں پھرتی رہی، اسے الجھتے، بحث کرتے دیکھتی رہی۔ وہ تو خود ہی اچھی طرح جانتی تھی کہ جہانگیر کی حیثیت پانچ، چھ ہزار کا سوٹ لے کر دینے کی تھی لیکن وہ چاہتی تھی کہ جہانگیر بھی اچھی طرح سے یہ بات سمجھ لے تو مستقبل میں آسانی رہے گی اور آخر میں ہوا کیا، وہ ایک پانچ ہزار کا سوٹ لے کر گھر آ گئے تھے کہ ہنس کی چال چلنا اتنا بھی آسان نہیں ہوتا۔

''ہر چیز کو آگ لگی ہوئی ہے جدھر دیکھو مہنگائی، مہنگائی۔ اب بندہ ایک ڈھنگ کا سوٹ بھی نہیں لے سکتا۔''

اس نے ٹائی اتار کر پھینکی پھر گھڑی کی باری آئی اور اب وہ موزے کھینچ کھینچ کر اتارتے ہوئے بے حد چڑے ہوئے انداز میں بول رہا تھا۔

اور خولہ، وہ چپ سادھے ہوئے ایک، ایک پھینکی گئی چیز کو سمیٹ رہی تھی۔ اسے بیک وقت اس شخص پر غصہ اور ترس بھی آ رہا تھا۔ وہ آج تک اس طرزِ زندگی سے سمجھوتہ نہ کر سکا تھا جو باپ کی اچانک موت کے بعد اسے گزارنی پڑی تھی، سہنی پڑی تھی اور اب وہ صوفے کی بیک کے ساتھ سر ٹکائے انگلیوں کی پوروں سے پیشانی کو مسل رہا تھا۔ آنکھیں بند لیکن چہرے پر شدید اکتاہٹ کے تاثرات تھے۔ خولہ کچھ کہے بنا اس کے لیے چائے بنانے چلی گئی تھی۔ چند لمحوں بعد جب وہ چائے بنا کر لائی تو جہانگیر ہنوز اسی پوزیشن میں تھا۔

''جہانگیر!'' اس نے نرمی سے پکارا۔ جہانگیر نے ماتھے سے ہاتھ ہٹا کر اسے دیکھا۔

''چائے۔'' اس کے دیکھنے پر خولہ نے کپ بڑھایا تھا۔ جہانگیر کے چہرے پر یک دم ممنونیت کے تاثرات ابھرے تھے۔

''بعض اوقات تم کوئی ماہر عامل لگتی ہو خولہ! بن کہے جان جاتی ہو۔''

خولہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ یہ جہانگیر کا اسٹائل نہ تھا۔

''اپنے لیے نہیں بنائی چائے؟'' وہ اب چائے کی چسکیاں بھرتے ہوئے اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

''نہیں، موڈ نہیں تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ پھر خولہ نے بیڈ پر پڑا شاپنگ بیگ الماری میں رکھنے کی نیت سے اٹھایا تھا آگے بڑھ کر لیکن یک دم اس کو بیڈ پر الٹ دیا۔ وہ ایک بار پھر آج خریدے گئے لباس کو دیکھ رہی تھی۔

''کیا فائدہ ہوا پانچ ہزار خرچ کرنے کا۔ ایسے لباس تو میری وارڈروب میں موجود ہیں۔'' وہ اب اس جوڑے کو دوبارہ شاپنگ بیگ میں رکھ رہی تھی۔

''تو کہاں سے لاتا پندرہ بیس ہزار۔'' جہانگیر یک دم چڑا۔

''میں نے تو ڈیمانڈ نہیں کی تھی جہانگیر!'' خولہ کا لہجہ بے حد نرم تھا۔

''تم نے ڈیمانڈ نہیں کی لیکن پھر سے پارٹی میں تم وہاں اولڈ فیشنڈ ڈریس پہن کر جاتیں۔ یہ کم از کم اس سے تو بہتر ہے۔''

''ٹھیک ہے، ایک دفعہ کوئی فنکشن آیا، خرید لیا۔ کل کو کوئی اور فنکشن یا پارٹی ہوگی تو پھر سے نیا پانچ چھ ہزار کا ڈریس خریدیں گے کیا؟ اتنا افورڈ کر سکتے ہو تم؟''

''یہی، یہی بات تو میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جیسا لائف اسٹائل۔ جیسا اسٹیٹس میں چاہتا ہوں وہ مجھ اکیلے کی تنخواہ میں ممکن نہیں ہے۔''

''تو؟'' اور خولہ کا ''تو'' اندیشہ لیے ہوا تھا اور اندیشہ وہ کہ جسے سچ ہو ہی جانا تھا۔

''تو یہ کہ تم کوئی جاب کیوں نہیں کر لیتیں۔ پیسہ تو جو ملے گا ملے گا، تم بھی اپ ٹو ڈیٹ ہو جاؤ گی۔ معلوم ہوگا تمہیں کہ دنیا کہاں بہتی ہے۔ اسی گز کے گھر اور گھر کے کچن سے باہر دنیا کہاں بستی ہے۔ کہاں جا رہی ہے۔'' وہ بول رہا تھا اور اس کا ایک ایک لفظ کسی نشتر کی طرح جسم میں پیوست ہو کر اسے سن کر کے رکھ رہا تھا اور بالآخر وہ مردہ ہو گئی تھی۔ بیٹھے بٹھائے ہی یک دم ایک ساعت میں اور کتنی ہی لاتعداد چیونٹیاں تھیں جو اس کے مردہ وجود کو کھانے کے واسطے چڑھ دوڑی تھیں۔

جہانگیر کی بات سنتے ہوئے وہ پلک تک نہ جھپک سکی تھی اور بالآخر اس کی سمجھ و فہم کا دروازہ ٹھک سے بند ہو گیا تھا۔ وہ نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ سامنے بیٹھا شخص کیا کہہ رہا ہے، کیوں کہہ رہا ہے اور آیا کہ وہ اس سے ہی بات کر رہا ہے یا کسی اور سے۔ وہ کسی ایسی ہی کیفیت میں تھی جہاں احساس نامی چیز بھک سے اڑتی ہے یا پھر دھواں بن کر فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے اور وہ ٹھیک ایسی ہی کیفیت میں تھی۔

ناول نار ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 10 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

http://kitaabghar.com

قسط نمبر 2

http://kitaabghar.com

''جہانگیر بھائی کا دماغ خراب ہوگیا ہے کیا؟'' وہ مزنہ تھی جو اس کی بات سنتے ہی ناگواری سے بولی تھی۔ خولہ کے پاس جواب صرف خاموشی کی صورت میں ہی تھا۔

''ابو کو پتا چلا ناں تو وہ بہت غصہ ہوں گے۔ اب ایسے بھی حالات نہیں ہیں جہانگیر بھائی کے کہ وہ آپ کو جاب کے لیے فورس کریں۔''

خولہ کے پاس اب بھی خموشی ہی تھی۔

''آپ کو کیا ہوگیا ہے؟ کچھ تو بولیں۔'' مزنہ نے چڑ کر اس کا کندھا ہلایا تھا۔ اس کے سر پر لیا دوپٹے کا پلو جھٹکے سے پھسلا اور پھسل کر اس کے شانوں پر آ رہا تھا۔

''ہائیں۔ یہ بالوں کو کیا کیا آپ نے؟'' مزنہ ٹھیک ٹھاک شاکڈ ہوئی تھی۔

''جہانگیر نے کہا تھا۔'' بیزاری سے کہتے ہوئے اس نے دوپٹا دوبارہ سر پر لے لیا تھا۔

''ہائے اللہ آپی! اچھے خاصے لمبے بال ہوا کرتے تھے آپ کے اور اب دیکھیں ذرا۔'' مزنہ کا افسوس تھا کہ جاتا ہی نہیں تھا۔ اس کے یوں افسوس کرنے پر خولہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور دیکھتی رہی۔

''مزنہ!'' پھر ہلکے سے پکارا۔

''ہوں۔''

''تم نے جہانگیر سے میری شادی کی مخالفت کیوں نہیں کی؟'' بغور اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں کیا کہہ سکتی تھی بھلا؟'' مزنہ الجھی اور پھر لاجواب سی ہوگئی تھی۔

''میں نے تو کہا تھا مزنہ، میں نے اسٹینڈ لیا تمہارے لیے۔''

''آپ بڑی تھیں آپی۔ آپ کہہ سکتی تھیں، آپ کر سکتی تھیں۔'' اور اس بہانے نما جواب پہ خولہ کے لبوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھری تھی۔

''کیا ہے آپی! جہانگیر بھائی تھوڑے سے بددماغ ہی تو ہیں اور تو ان کے پاس وہ سب کچھ ہے جس کی کوئی بھی لڑکی خواہش کرتی ہے۔ آپ ایسے ہی دل چھوٹا کرتی رہتی ہیں۔ ایسی عورتیں بھی ہیں جو پٹ کر بھی اپنے مرد کے ساتھ ہی رہتی ہیں۔''

اچھا طریقہ تھا بات بدلنے کا۔ کچھ اور نہ ہو تو لیکچر شروع کر دو۔ وہ اب فلاں، فلاں کر کے مثالیں پیش کر رہی تھی۔ بندہ پوچھے کہ بھئی وہ ''لڑکی''، تم کیوں نہ ہو گئیں۔ خولہ اس کے ملتے لبوں کو دیکھتی تھی اور سوچتی تھی۔ سارے اس جیسے بے وقوف تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔

☆......☆......☆

جاب کرنے کی بات ایک ہی دن تک نہ رہی تھی۔ یہ پھر جہانگیر کا روزمرہ کا ورد بن کر رہ گئی تھی۔ خولہ کی ہمت تھی جو برداشت کرتی تھی لیکن پھر بھی وہ جاب کرنے کے لیے رضامند نہیں تھی۔ وہ جہانگیر کو یہ لت نہیں لگانا چاہتی تھی۔ پیسہ کمانا اس کا فرض نہیں تھا، کوئی مشکل حالات ہوتے تو وہ کیوں نہ ساتھ دیتی لیکن یہ حالات اس نہج پر کسی طور نہ پہنچے تھے۔ اس نے پھپھو کا حوالہ دے کر دیکھ لیا، جہانگیر کا جواب تھا۔

''امی کے پاس تم سے پہلے بھی میڈ ہوا کرتی تھی اب بھی میڈ ہی رہے گی۔''

''لیکن جہانگیر۔ جیسی کیئر میں پھپھو کی کرتی ہوں کوئی دوسرا تو نہیں کر سکتا ناں۔'' اس نے دلیل دی۔

''اوہ کم آن خولہ! بندے کو سپروائز کرنا آنا چاہیے بس۔ ورنہ کون سا ایسا کام ہے جو نوکروں سے کروایا نہیں جا سکتا۔''

''یا خدا! وہ کیسے اس شخص کو سمجھائے۔ عقل کی ساری پٹیاں تو جیسے وہ حفظ کیے بیٹھا تھا۔'' خولہ نے بے ساختہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھاما تھا۔

''اب اس میں سر پکڑنے والی کون سی بات ہو گئی۔'' وہ بے طرح سے بگڑا۔

''جہانگیر! میں جاب نہیں کرنا چاہتی۔'' اب کے وہ دوٹوک ہو کر بولی تھی۔

''تمہیں شرم نہیں آتی یہ بات کہتے ہوئے۔ کبھی ان بھٹے پر کام کرتی عورتوں کو دیکھا ہے؟ دو، دو بچوں کو لیے کیسے وہ مزدوری کرتی ہیں اور تم...... تم شکر نہیں کرتیں کہ پڑھی لکھی ہو، کیا کرنا ہے تمہیں، محض اسکول میں چند بچوں کو پڑھانا ہی تو ہے۔ اس میں بھی نخرے ہیں، تم سے بہتر تو وہ جاہل عورتیں ہی ہیں جو کم از کم اپنے شوہر کا ساتھ تو دیتی ہیں۔'' وہ بھڑک ہی تو اٹھا تھا۔

خولہ نے بے ساختہ منہ پر ہاتھ رکھا تھا۔ یہ تو اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ یوں بھڑکے گا۔

''جہانگیر!'' ہو سکتا تھا کہ وہ اسے دو چار اور کھری کھری سناتا کہ یک دم فرخندہ نے مداخلت کی تھی۔ ان کی آواز سن کر خولہ نے بے ساختہ اپنی جگہ چھوڑ دی تھی۔

''وہ نہیں کرنا چاہتی جاب تو تم کیوں اسے مجبور کرتے ہو۔'' وہ بھی برہم تھیں۔ وہ بھی خولہ کی ہم نوا تھیں اور نہیں چاہتی تھیں کہ خولہ یوں خوار ہو۔

''آپ بھی اسی کا ساتھ دے رہی ہیں، میرا تو کسی کو کوئی خیال ہی نہیں۔'' پیر پٹختا طیش سے کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکلا تھا۔ دروازہ اس زوردار آواز سے بند ہوا کہ آواز دل پر جا کر لگی۔

فرخندہ نے خولہ کو دیکھا جس کی سفید ہوئی رنگت اس کی حالت کی بہترین ترجمان تھی لیکن فرخندہ کو سمجھ نہیں آیا کہ وہ اسے تسلی دیں تو آخر کس زبان میں، کس طریقے سے دیں کہ تسلی واقعی میں تسلی بن کر دل پر اترے۔اور آج کا ہونے والا معرکہ اس معرکے کا عشرِ عشیر بھی نہیں تھا جو تب ہوا جب احمد صاحب کو اس مسئلے کا علم ہوا۔بات کو ان کے علم میں لانے والی کوئی اور نہیں خود فرخندہ تھیں۔ان کا خیال تھا کہ وہ جہانگیر سے بہتر طریقے سے بات کر سکتے تھے اور یہ کہ وہ اس پر دباؤ ڈال کر اس سے بات منوا بھی سکتے تھے اور یہ خیال کتنا خام ثابت ہوگا وہ اگر جانتی ہوتیں تو کبھی۔ہاں کبھی یہ بات احمد صاحب کے علم میں نہ آتی۔

☆......☆......☆

''پھپو! آپ کو ابو کو نہیں بتانا چاہیے تھا۔'' خولہ سخت پریشان تھی۔اس کی لاعلمی میں فرخندہ بھائی کو فون کر چکی تھیں۔

''کیوں، کیوں نہیں بتانا چاہیے تھا، وہ بھی تو بے نتھا بیل ہو رہا ہے اور احمد بھائی بڑے ہیں ہمارے۔ان کو نہیں بتائیں گے تو کیا پڑوسیوں کو بتائیں گے۔'' پھپو کو اس کی پریشانی نے تاؤ دلایا تھا۔

''آپ تو جیسے اپنے بیٹے کو جانتی ہی نہیں؟'' وہ بھی بل کھا کر بولی تھی۔

''ابو کی بات ضرور ہی مانے گا وہ۔ہونہہ۔'' لہجے میں ناراضی واضح تھی۔

''مانے یا نہ مانے، اسے یہ تو معلوم ہوگا ناں کہ کوئی اسے پوچھنے والا، اس سے سوال کرنے والا ہے۔ایسے کیسے وہ اپنی مرضی چلا سکتا ہے۔گھر کا ماحول خراب کر کے رکھ دیا ہے اس گدھے نے۔''

''پھپو! آپ سمجھ کیوں نہیں رہیں۔اسے اور غصہ آئے گا۔وہ بری طرح سے ری ایکٹ کرے گا۔مجھے طعنے دیتا رہے گا اور گھر کا ماحول جو ذرا سا قابو میں ہے ناں وہ بھی جاتا رہے گا۔پھر آپ کر لیجیے گا سارے مسائل حل۔''

''اب وہ کیا ماموں سے منہ ماری کرے گا۔کچھ تو لحاظ کرے گا ہی ناں، میں ہوں ابھی۔زندہ ہوں، دیکھوں گی کیسے وہ تمہیں طعنے مارتا ہے۔'' خولہ سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے بیٹھی تھی اور فرخندہ تیز تیز بولے جا رہی تھیں۔

''ماموں سے تو جیسے اس نے پہلے کبھی منہ ماری کی ہی نہیں ناں۔'' سر اٹھا کر وہ بیزار لہجے میں بولی تھی۔

''خولہ!'' پھپو نے اس پر ایک گھوری ڈالتے ہوئے سخت تنبیہی لہجے میں کہا تھا اور وہ ہونٹ بھینچ کر خاموش ہو گئی تھی۔وہ ان کے بیٹے کو ان سے زیادہ جانتی تھی۔یہ آج اس پر انکشاف ہوا تھا۔وہ جہانگیر کو انڈر اسٹیمیٹ کر رہی تھیں۔

☆......☆......☆

وہ آفس سے گھر آیا تو ماموں کو دیکھ کر ہی اس کا ماتھا ٹھنکا تھا، رہی سہی کسر اس خاموشی اور سنگینی نے پوری کر دی تھی جو گھر کے تینوں افراد کے چہروں پر نیون سائن کی طرح چمک رہی تھی۔ڈنر کے لیے اسی کا انتظار ہو رہا تھا اور اسی نیون سائن کی طرح دمکتی خاموشی کے ساتھ

کھانا تناول کیا گیا تھا۔

وہ کھانا کھاتے ہی اٹھ کر لاؤنج میں چلا گیا تھا۔اس کے پیچھے پیچھے ہی فرخندہ اور احمد صاحب بھی لاؤنج میں ہی آ گئے تھے۔وہ بظاہر ایک دوسرے سے باتوں میں مصروف تھے لیکن جہانگیر کوئی بچہ تھا بھلا؟ جو بات کو پک نہ کرتا مگر پھر بھی وہ خاموش تھا اور چاہتا تھا کہ بات کریں تو ماموں ہی کریں۔خولہ ان کو چائے سرو کرنے کے بعد وہاں رکی نہیں تھی اور جب وہ جہانگیر کو چائے دے رہی تھی تو جہانگیر کی سرد گہری نظروں نے اسے بتا دیا تھا کہ اب کیا ہونے والا تھا۔وہ سرد نظریں، کپکپی میں بدل کر اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی تھیں۔وہ ٹھنڈے پڑتے ہاتھوں کے ساتھ وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

''تمہیں کس چیز کی کمی ہے جہانگیر۔جو تم خولہ کو جاب کے لیے مجبور کر رہے ہو؟'' احمد صاحب نے نہایت سبھاؤ، تحمل مگر بنا تمہید کے بات شروع کی تھی۔اس سوال کو جہانگیر نے چائے کے ساتھ سرو کی گئی کوئی بدذائقہ چیز سمجھ کر حلق سے اتارا تھا۔اس نے صوفے سے ٹیک لگائی، چائے کی پیالی سامنے موجود میز پر رکھی اور انہی ٹھنڈی نگاہوں سے ماموں کو دیکھا۔

''یہ میرا اور......میری بیوی کا معاملہ ہے۔''

نگاہیں تو جو ٹھنڈی تھیں سو تھیں۔الفاظ بھی ٹھٹرا کر رکھ دینے کی صلاحیت سے مالا مال تھے۔لہجہ گستاخ تھا۔احمد صاحب کے چہرے نے یک دم رنگ بدلا تھا۔

''تمہاری بیوی......میری بیٹی پہلے ہے۔'' ترنت جواب دیا گیا تھا۔

''تو وہ جب تک آپ کے گھر میں تھی جیسے آپ نے چاہا اور جیسے اس نے چاہا، اس نے زندگی گزاری۔یہ میرا گھر ہے اور جیسا میں کہوں گا اسے ویسا ہی کرنا ہوگا۔'' غرور تھا تو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس بات کا تھا۔

''تمہاری بیوی ہے، زر خرید تو نہیں۔'' احمد صاحب کو تکلیف ہوئی تھی۔وہ ان کی اولاد تھی۔''اور ضروری تو نہیں کہ تمہارا گھر ہے تو تمہاری ہی خواہشات پر عمل بھی ہوگا۔وہ ایک انسان ہے، اپنا ایک الگ تشخص رکھتی ہے۔اس کی ایک سوچ ہے اور......''

''خولہ......خولہ!'' اس نے احمد صاحب کو بات مکمل نہ کرنے دی تھی اور زور سے خولہ کو آواز دی تھی۔

''جی۔'' چند لمحوں بعد وہ نمودار ہوئی تھی۔رنگ فق اور جسم، جان چھوڑتا ہوا۔

''اپنا بیگ پیک کرواور اپنے باپ کے ساتھ ان کے گھر چلی جاؤ۔جہاں پہ تم ایک الگ تشخص کے ساتھ، آزادانہ زندگی گزار سکو۔'' لہجے میں طنز تھا نہ کاٹ، بے حد سہل سے انداز میں فرمان جاری کیا گیا تھا۔

''جہانگیر!'' فرخندہ اس زور سے بولیں کہ گلے میں خراش پڑ گئی تھی۔

''بس!'' احمد صاحب تنتنا اٹھے تھے۔

''بیگ پیک کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ میرے گھر میں میری بیٹی کے لیے ہر چیز موجود ہے۔'' جہانگیر کی آنکھوں میں براہِ راست دیکھتے ہوئے انہوں نے سخت لہجے میں بات کی تھی۔

''چلو خولہ!'' اور آگے بڑھ کر خولہ کا ہاتھ تھاما تھا۔ اور خولہ، وہ اتنی بے یقینی کے ساتھ جہانگیر کو دیکھ رہی تھی کہ حد نہ تھی۔ ضرب، تقسیم، جمع، تفریق۔ سب کر کرا کے یہ تھی اس کی وقعت...... اور بے یقینی کی آگ نے اس کے سارے آنسو جلا ڈالے تھے، وہ ہق دق اسے دیکھ رہی تھی اور فرخندہ...... وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے روئے جا رہی تھیں۔ انہوں نے بھی خولہ کو نہ روکا تھا، وہ جان گئی تھیں کہ خولہ اور جہانگیر...... دونوں مس میچ تھے۔ اور شادی کو بھلا عرصہ ہی کتنا ہوا تھا۔۔۔ محض دس ماہ۔

☆......☆......☆

رات معمول کی مانند سیاہ تھی، خاموش تھی۔ تارے حسبِ عادت چمکتے تھے، چاند ہر روز کی طرح روشنی بکھیرتا تھا۔ تو پھر...... پھر...... اسے کیوں نہیں یہ چمک، یہ روشنی محسوس ہوتی تھی۔ اسے صرف رات کی سیاہی سب چیزوں پہ حاوی ہوتے ہوئے کیوں محسوس ہوتی تھی۔ اسے کیوں لگتا تھا کہ یہ خاموشی۔ چاروں اور پھیلی خاموشی اسے کھا جائے گی، ہڑپ کر لے گی، نگل جائے گی۔

آج کے واقعے کے بعد سے اسے دکھ ہوا تھا۔ اسے بے عزتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ خوفزدہ زیادہ تھی۔ وہ اس وقت زندگی کی مشکل اور بدنما کیفیات کا سامنا کر رہی تھی۔ اسے ایک delimma درپیش تھا اور وہ برے طریقے سے اس کا شکار ہوئی تھی۔ جہانگیر کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تھی مگر طلاق جیسے بھاری لفظ کو بھی سننے سے انکاری تھی۔ تو یہ طے ہوا کہ وہ خوفزدہ زیادہ تھی۔

جب سے احمد صاحب اسے لے کر آئے تھے، پورے گھر میں سناٹا اپنی بانہیں پھیلائے چکر کاٹتا پھر رہا تھا۔ بھائیں، بھائیں کرتی خاموشی گھر کی راہداری میں، صحن میں، ہال میں حتیٰ کہ ان تین کمروں میں بھی جہاں وہ تین نفوس موجود تھے، سناٹا اپنے پورے معنوں کے ساتھ موجود تھا اور اس خاموشی میں سوئی کی ٹک، ٹک بھی گھڑیال کی ٹن ٹن لگتی تھی۔ یہ جھوٹ نہیں تھا کہ اسے باپ کے گھر آ کر بے حد سکون ملا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ ہاں...... ایسا ہی ہونا چاہیے تھا تو اس کا انتقام جیت گیا۔ ابو...... آج ہار گئے تھے اور خولہ کو ایک کمینی سی تسلی اپنے پورے بدن پر اترتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

''تو اب معلوم ہوا آپ کو...... اب پتا چلا کہ کس قدر غلط فیصلہ تھا یہ...... مزنہ کو اگر بچایا تھا تو میں...... میں کیا کسی کوڑے کے ڈھیر سے ملی تھی آپ کو؟ جو ہوا بہت اچھا ہوا تھا۔ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔'' ایک گہری سانس بھر کر اس نے ہوا میں موجود آکسیجن کو ہی اپنے اندر نہیں کھینچا تھا۔ اس نے جیسے سکون کشید کیا تھا۔ وہ خوف کی سی کیفیت جیسے اچانک زائل ہونے لگی تھی، معدوم سی ہوتی جا رہی تھی۔ وہ صحن میں جانے کی غرض سے کمرے سے باہر نکلی تھی۔ اور جب باہر نکلی تو نظر کچن کی طرف اٹھی تھی۔ جہاں پر لائٹ آن تھی اور اس نے ابو کو دیکھا، وہ کچھ ڈھونڈ رہے تھے۔ خولہ حیران ہوئی۔ انہوں نے مزنہ یا اسے کیوں نہ آواز دی تھی، بے اختیار وہ کچن کی طرف بڑھی تھی۔

''ابو!'' آواز میں حیرت تھی۔

احمد صاحب نے سر اٹھایا، اسے دیکھا اور خولہ کو کچھ غیر معمولی سا محسوس ہوا تھا۔

''آپ کو کچھ چاہیے تھا؟'' وہ آگے بڑھ آئی۔

''ہاں، پانی لینے آیا تھا۔ دوا کھانی تھی۔'' اسے محسوس ہوا کہ وہ غائب دماغی سے بول رہے تھے، انہیں پانی لینا تھا تو وہ کیبنٹ کیوں کھولے کھڑے تھے۔ خولہ نے انہیں حیرانی سے دیکھتے ہوئے پانی کا گلاس بھر کر دیا۔ وہ چونکے۔

''ہاں، پانی، پانی......'' کچھ ہکلاتے ہوئے کہہ کر انہوں نے اس کے ہاتھ سے پانی لیا تھا۔ خولہ اب بھی ناسمجھی سے انہیں دیکھ رہی تھی اور سمجھنے کی بہترین کوشش میں تھی۔

''دوا کہاں ہے آپ کی؟''

دوا لیے بنا پانی پیتے دیکھ کر اس نے پوچھا تھا۔

''دوا؟ اوہ۔ میں بھول گیا، وہ تو کمرے میں ہے۔'' وہ پھر سے چونکے تھے اور خولہ نے تکلیف سے انہیں دیکھا، وہ یقیناً بے حد پریشان تھے۔ اس نے بے بسی سے اپنی آنکھیں بند کیں، ذرا سا توقف کیا اور پھر انہیں پکڑ کر ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بٹھایا۔ ہاتھ سے گلاس لے کر سائیڈ پر رکھا اور ان کے قدموں کے پاس بیٹھی۔

''ابو!'' اس نے ان کے سرد بوڑھے ہاتھ اپنے گرم ہاتھوں میں لیے تھے۔

''ابو! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ کیوں اس قدر پریشان ہیں، جانتے تو ہیں جہانگیر کو۔ کیسے بھڑک اٹھتا ہے وہ، غصہ اترے گا ناں تو خود ہی عقل میں بات آ جائے گی، یوں پریشان مت ہوں ابو۔'' اس نے لہجے کو بشاش بنا کر بات کی تھی مگر پھر بھی...... پھر بھی معلوم نہیں کیوں لہجہ بیچارگی لیے ہوئے تھا۔ اسے یہ نہیں کہنا تھا مگر وہ کہہ رہی تھی۔

''بڑی زیادتی کی ناں میں نے تمہارے ساتھ خولہ بچے، ہے ناں......'' احمد صاحب نے اس کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ نکال کر اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیا تھا۔

اور بس...... ان کا اعتراف، اعتراف نہ تھا، تیز دھار آلہ تھا، کوئی خنجر تھا یا شاید پھر بھالا۔ آر پار ہو گیا تھا۔

''نہیں ابو!'' وہ آواز کی لرزش پہ قابو نہ پا سکی تھی۔

''کسی اور سے شادی ہوتی تو بھی ممکن تھا کہ وہ جہانگیر سے زیادہ bitter ثابت ہوتا تو......؟''

''اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ایک اچھا، بہت اچھا...... بہترین ساتھی ثابت ہوتا۔ میں جہانگیر کی طبیعت سے واقف تھا خولہ بچے پھر بھی...... پھر بھی......'' انہوں نے بے بسی سے اپنا سر نفی میں ہلایا تھا۔ خولہ کے آنسو بہہ پڑے۔

''جو ہوا نہیں......اس پر سوچیں کیوں ابو! جو ہو رہا ہے اس کا حل تلاش کرنا چاہیے ناں۔''اس نے بچوں کے سے لہجے میں کہا تھا۔

''نہیں خولہ! نہیں بچے۔اب اور نہیں، جہانگیر کو اگر تمہیں رکھنا ہے تو عزت سے رکھنا ہو گا۔میں اب کمپرومائز نہیں کروں گا، میں پہلے ہی غلطی کر چکا ہوں، اب مزید نہیں......مزید نہیں۔''وہ کہہ کر رکے نہیں تھے، اٹھ کر چلے گئے تھے۔

اور خولہ......کتنی ہی دیر وہ یوں ہی پنجوں کے بل زمین پر بیٹھی رہی تھی۔اس کے ہاتھوں پر اب بھی ان بوڑھے ہاتھوں کا سرد لمس تازہ تھا اور پھر اس نے مڑ کر ابو کے کمرے کی طرف دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔وہ تو ان کو بتانا چاہتی تھی، کہنا چاہتی تھی، ان کے سینے پر سوار ہو کر ہاتھ نچا نچا کر طعنے دینا چاہتی تھی کہ انہوں نے اس کی زندگی برباد کر دی......اور اب ہوا کیا؟ وہ کیا کہہ رہی تھی ان سے۔

نم چہرے پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ ابھری اور اگلے ہی لمحے اس نے بے بسی سے سر کو نفی میں جھٹکا تھا۔چند لمحے اسی طرح گزرے تھے پھر وہ کرسی کا سہارا لے کر اٹھی۔آہستہ قدموں سے، جھکے سر کے ساتھ چلتے ہوئے وہ لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر صحن میں نکل گئی تھی۔اور یوں چلتے ہوئے وہ کوئی بھٹکی ہوئی روح لگتی تھی۔جب صحن میں لگے جھولے پر بیٹھ کر اس نے آسمان کو دیکھا تو......رات تو معمول کی مانند ہی سیاہ تھی، تارے حسبِ عادت چمکتے تھے، چاند ہر روز کی طرح روشنی بکھیر رہا تھا اور اسے لگتا تھا کہ سارے منظر پر حاوی، اندھیرے کی طرح چھائی یہ خاموشی اسے کھا جائے گی، نگل جائے گی، ہڑپ کر لے گی، سالم کا سالم، پورے کا پورا۔

جھولا آہستہ آہستہ ہلتا تھا۔چیں چیں کی آواز سے ماحول کی خاموشی چیخ سی جاتی تھی اور اس پر بیٹھا وجود اتنا ساکت اور خاموش تھا کہ قریب قریب مردہ لگتا تھا۔

☆......☆......☆

اس کے چہرے پر کچھ اور تھا یا نہیں......مگر آنکھوں میں کاجل ضرور بھر بھر کر ڈالا گیا تھا۔معصوم چہرہ، آنکھوں میں کاجل اور مناسب لباس، وہ اچھی لگ رہی تھی۔سب سے بڑھ کر معصوم۔

''آپی! میں ٹھیک لگ رہی ہوں ناں۔''مزنہ کا لہجہ ذرا سی گھبراہٹ لیے ہوئے تھا۔آج اسے دیکھنے کچھ لوگ آ رہے تھے، پہلی بار تھی سو وہ ذرا سی گھبرائی ہوئی تھی۔خولہ نے مسکراتے ہوئے اس کے پہلو میں گرے دوپٹے کا پلو اٹھا کر اس کے سر پر ٹکایا تھا۔یہ کاجل بھی خولہ نے ہی لگایا تھا۔

''نہیں، بالکل اچھی نہیں لگ رہی تم۔''وہ شرارت سے بولی۔

''آپی!''وہ ٹھنکی تھی اور خولہ ہلکے سے ہنس دی۔

''اچھی لگ رہی ہو اور چلو اب جلدی کرو۔''پھر اسے ساتھ لیے ہی وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھی۔

ماحول خوشگوار تھا۔یوں محسوس ہوتا تھا کہ مزنہ کو دیکھتے ہی ان لوگوں نے پسند کر لیا تھا۔خولہ نے ہی سب کو چائے سرو کی تھی۔

''آپ میریڈ ہیں ناں؟'' اس نے لڑکے کی والدہ کو چائے پکڑائی تو انہوں نے سوال کیا تھا۔

''جی۔'' وہ ہلکے سے مسکرائی۔

''کیا کرتے ہیں آپ کے ہسبینڈ؟''

''ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتے ہیں۔'' اس نے اب کبابوں کی پلیٹ ان کے آگے کرتے ہوئے کہا تھا۔

''تو آپ یہاں ابو کے گھر چند دن رہنے آئی ہیں؟''

''جی۔'' وہ بہ مشکل کہہ پائی تھی۔

آنٹی کا سوال نامہ ہی ختم نہیں ہو رہا تھا اور ان کے سادہ سے سوال خولہ کے گلے کا پھندا بنتے جا رہے تھے۔ چائے سرو کرنے کے بعد وہ وہاں رکی نہیں تھی۔ تیز تیز قدموں کے ساتھ چلتے ہوئے وہ کچن میں آ گئی تھی۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر معلوم نہیں اس نے کس چیز کو روکا تھا۔ وہ گھبرا گئی تھی۔ اسے یہاں آئے ہوئے تقریباً ایک ماہ ہو چلا تھا اور معاملہ وہیں کا وہیں۔ ابو رابطہ کرتے تھے، نہ جہانگیر پوچھتا تھا، پھپو کے فون کرنے پر بھی جہانگیر نے پابندی لگا رکھی تھی۔ وہ پھر بھی کبھی کبھار کر ہی لیتی تھیں لیکن ان کی خواہش سے، چاہنے نہ چاہنے سے کیا فرق پڑتا تھا اور اب...... اب ایک نیا مسئلہ درپیش تھا۔ اس پہلو سے، اس اینگل سے تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اور اسے یقین تھا کہ ابو نے بھی نہیں سوچا ہوگا۔ لوگ تو اعتراض کرتے ہیں، شادی شدہ بیٹی گر گھر آ کر بیٹھ جائے، چاہے وجہ کچھ بھی ہو، ان کی بلا سے، لوگ تو اعتراض کرتے ہیں۔ اور جیسے آج پہلے ہی دن آنٹی نے سوالات کی بھرمار کر دی تھی۔

خولہ کو یقین تھا کہ یہ بات انہیں پسند نہیں آئے گی۔ وہ آخر کب تک، کب تک جھوٹ بول سکتے تھے، اگر بات طے ہو گئی، شادی تک جا پہنچی تو تب...... تب کیا ہوگا؟ اسے ایک دم ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے، بے اختیار اس نے آگے بڑھ کر اپنے لیے پانی کا گلاس بھرا تھا اور بیٹھ کر غٹا غٹ اسے چڑھا گئی تھی۔

اسے کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ بات مسئلہ نہیں۔ بہت بڑا مسئلہ بن کر سامنے آنے والی تھی۔ اس بات کی قوی امید تھی کہ مزنہ کی بات یہاں طے ہو جانی تھی۔ یہ ان لوگوں کا احمد صاحب کے گھر پانچواں چکر تھا اور ہر دفعہ وہ آنٹی سے بچتی رہی تھی اور اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس کا بچنا بھی آنٹی کی نظر میں آ چکا تھا۔

''کیا بات ہے بھائی صاحب۔ میں جب بھی آئی خولہ کو یہیں دیکھا؟ کوئی مسئلہ ہے کیا؟'' انہوں نے سیدھے سیدھے احمد صاحب سے سوال پوچھ ہی لیا تھا۔ احمد صاحب یک دم جواب نہ دے سکے۔ خولہ کا رنگ فق ہوا تھا اور مزنہ نے بے اختیار سر جھکایا تھا۔

''اب آپ سے کیا چھپاؤں۔ تعلق داری ہونے والی ہے، میں جھوٹ بولنا گوارا نہیں کرتا۔ بس اس کے شوہر کے ساتھ کچھ پرابلمز چل رہی تھیں تو میں اسے یہاں لے آیا۔'' احمد صاحب نے ٹھہر ٹھہر کر بات مکمل کی تھی۔

آنٹی کا ماتھا ٹھنکا۔

’’کیسی پرابلمز بھائی صاحب؟‘‘

’’بس یوں سمجھئے کہ سیریس مسئلہ ہی ہے۔بس دعا کریں کہ بچی کے حق میں بہتر ہو۔‘‘

’’آپ کی بہن کے گھر بیاہی ہوئی ہے نا خولہ؟‘‘

’’جی،جی۔‘‘

’’تو پھر بھی نوبت یہاں تک پہنچ گئی۔‘‘

’’بس! بھتیجا خر دماغ ہے،بات کو سمجھتا ہی نہیں۔اب وہ خولہ کو مجبور کرتا ہے کہ یہ جاب کرے۔حالانکہ کمی کسی چیز کی نہیں۔تو میں اسی بات پر لے آیا اسے۔میری بچی کیا سڑکوں پر خوار ہونے کے لیے ہے؟‘‘

’’یہ تو اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے کہ اس کے لیے یوں بیٹی کو گھر بٹھا لیا جائے۔سسرال میں،شوہر کے ساتھ سو طرح کے سمجھوتے کرنے ہی پڑتے ہیں۔‘‘ آنٹی کا لہجہ اب کے بدلا ہوا تھا۔مزنہ اور خولہ نے ایک دوسرے کو بے اختیار دیکھا۔احمد صاحب اس بات پر یک دم کچھ نہ کہہ سکے تھے۔

’’اب اگر خدانخواستہ کل کو مزنہ کو کوئی مسئلہ ہو گیا تو تب بھی آپ یہ ہی کریں گے کیا؟‘‘ اور اب اُن کے لہجے کو صحیح طور پر لفظوں میں بیان کیا جا سکتا تھا۔وہ سخت تھا۔

’’ارے نہیں نہیں۔ایسی کوئی بات نہیں ہے۔آپ دراصل جہانگیر کو جانتی نہیں ہیں،وہ بے حد سخت مزاج ہے اور خولہ نے تو بہت کچھ سہا ہے۔اب ہر غلط،ناجائز بات برداشت بھی تو نہیں کی جا سکتی ناں۔‘‘ احمد صاحب نے وضاحت دی تھی،دے تو دی تھی مگر بے سود۔

’’اب بات لگنے کو بری ہی لگے گی۔لیکن سسرال میں غلط،ناجائز برداشت کرنے کو ہی سمجھوتا کہتے ہیں۔ہماری ساری عمر بھی ایسی ہی باتیں برداشت کرتے کرتے گزری ہے۔‘‘ وضاحت کو تو جیسے چٹکیوں میں اڑا دیا گیا تھا۔

اور ہاں...... بات واقعی ہی بری لگی تھی......ایک کو نہیں سب کو......وہاں ناگوار سی خاموشی سرعت سے پھیلی اور پھیل کر پورے ماحول پر چھا گئی تھی۔یہ اچھا نہیں ہوا تھا۔یقیناً یہ اچھا نہیں ہوا تھا۔

☆......☆......☆

’’ابو کو یوں ساری بات کھل کر نہیں کرنی چاہیے تھی آپی۔‘‘ وہ مزنہ تھی جو کہ پریشان سی تھی۔وہ خولہ کے گھٹنے پر سر رکھے بیٹھی تھی۔مہمانوں کے جانے کے بعد سے احمد صاحب اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔آج رات کا کھانا کسی نے بھی نہیں کھایا تھا،مزنہ کی اس بات پر خولہ نے آہستگی سے اس کے بالوں کی بکھری لٹوں کو سنوارا تھا۔

''چندا! ابو کب تک ان لوگوں سے چھپاتے، کب تک؟ بات تو آخر کھلنی ہی تھی۔'' لہجہ دھیما مگر آنچ دیتا تھا۔

''میں یہ تو نہیں کہہ رہی تھی کہ ابو بات چھپاتے مگر یوں ساری بات کھل کر بھی نہ کرتے، اچھا تاثر تو نہیں لے کر گئے ناں وہ یہاں سے۔''

''ہم......م۔م۔ٹھیک ہے لیکن مزنہ جو لوگ کسی کی پرابلم کو سمجھ نہ سکیں۔ اصل بات کو جانے، سمجھے بغیر......وہ کسی کی بیٹی کو ہی قصور وار ٹھہرائیں تو ان لوگوں کی ذہنیت کیا ہوگی؟ وہ تو یوں بات کر رہی تھیں جیسے مجھے کانٹا چبھا اور ابو نے مجھے لا کر گھر بٹھایا، اصل معاملہ کیا ہے، اس کی نوعیت کیا ہے، یہ جانے بغیر انہوں نے فتویٰ لگا دیا۔ اور کیا صرف لڑکی کو ہی کمپرومائز کرنا چاہیے، مرد کا یا اس کے گھر والوں کا کوئی شیئر نہیں ہوتا میریڈ لائف میں؟'' وہ اب بھی اس کے بال سنوار رہی تھی اور لہجہ اب بھی وہی دھیما تھا۔

''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔'' مزنہ ذرا سے توقف کے بعد بولی تھی۔ خولہ نے اسے اٹھایا۔ شانوں سے پکڑ کر رخ اپنی طرف موڑا۔

''اور اب اگر ایسے لوگ پیچھے ہٹ جائیں، رشتے سے انکار کر دیں تو کیا ایسے لوگوں کا اپنے گھر رہنا ہی ٹھیک نہیں۔'' خولہ بے حد پیار سے پوچھ رہی تھی اور وہ محض پوچھ نہیں رہی تھی۔ وہ اسے ذہنی طور پر اس دھچکے کے لیے تیار رہنے کا عندیہ بھی دے رہی تھی۔ مزنہ فوری طور پر بول نہ سکی تھی بس ہونٹ بھینچ کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

خولہ نے تسلی والے انداز میں اس کے گال کو تھپتھپایا اور اٹھ کر چلی گئی تھی۔ مسئلے کا ایک مثبت پہلو گو کہ اس نے ڈھونڈ ہی لیا تھا لیکن پریشان وہ بھی تھی۔ ایسا اگر پہلی بار ہوا تھا لیکن......اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ یہ آخری بار ہی ہوا تھا۔ لوگوں کی ذہنیت اور ان کی زبانیں۔ ان دونوں کا فی زمانہ کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

☆......☆......☆

''جہانگیر!'' امی نے اسے اپنے کمرے میں آواز دی تھی اور آواز سنتے ہی اس کے چہرے پر ناٹ اگین جیسے تاثرات ابھرے تھے۔ وہ ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ بیزار سا منہ بناتے ہوئے اس نے ٹی وی بند کیا، منہ کھول کر سانس باہر نکال کر سو دفعہ کی کہی بات کو پھر سے سننے کے لیے خود کو تیار کیا تھا اور اب یہ 101 ویں بار تھی۔

''جی؟'' دروازے پر ہی کھڑے ہو کر بے حد ڈھیلے انداز میں جی بولا گیا تھا۔

''ادھر آؤ۔'' فرخندہ نے ڈپٹا۔

''امی پلیز۔'' وہ بیزار ہوا۔

''جہانگیر! کب تک، کب تک ایسا چلے گا آخر؟ کچھ تو شرم کرو۔ ماموں کے احسانات کا ہی لحاظ کر لو۔''

فرخندہ پریشان تو تھیں ہی وہ اب تپی ہوئی بھی تھیں۔

''ماموں کے احسانات کا لحاظ کر کے ہی ان کی بیٹی سے شادی کی تھی۔'' بے حد لاپروا انداز میں کہتے ہوئے اس نے ڈرائی

فروٹ کی پلیٹ میں سے کاجو اٹھا کر فضا میں اچھالا اور پھر منہ سے اسے کیچ کیا تھا اور اب منہ ہلاتے ہوئے وہ ماں کو مزے سے دیکھ رہا تھا۔

''جہانگیر! کسی کی بچی کے ساتھ ایسا مت کرو۔ کل کو اگر تمہاری بھی بیٹی ہوئی اور......''

''اوہ کم آن امی۔ اچھا لے آؤں گا اسے۔ ابھی میں بہت مصروف ہوں بہت لوڈ ہے کام کا، ٹائم نہیں ہے ابھی میرے پاس۔'' بات کاٹ کر کہتے ہوئے اس نے ایک اور کاجو فضا میں اچھال کر منہ سے کیچ کیا تھا اور فرخندہ حیرانی سے اسے تکنے لگیں۔ بھلا خولہ کو گھر واپس لانے کے لیے بھی اسے ٹائم چاہیے تھا۔ یہ بھی بھلا کوئی کرنے کی بات تھی۔

''جہانگیر!'' انہوں نے حیرت سے ہی اسے پکارا۔

''امی پلیز۔'' اور وہ جان چھڑا کر باہر نکل آیا تھا۔ اگر امی نے یہ بات 101 مرتبہ دہرائی تھی تو اس نے بھی 101 مرتبہ واں بہانہ گھڑا تھا۔ وہ خولہ کو گھر لانے والا نہیں تھا، ماموں لے کر گئے تھے اچھا ہے سارے ارمان، سارے شوق پورے کر لیں اپنے۔ پھر دیکھا جائے گا کہ اس مسئلے کا کچھ کرنا بھی ہے کہ نہیں اور اگر کرنا ہے تو کیا کرنا ہے آخر......

جیبوں میں ہاتھ ڈالے، منہ چلاتا ہوا وہ اپنے کمرے میں آیا تھا۔

''بہت بے وفا ہو بیوی تم بھی۔ مرد پر تو چلو بے وفائی سوٹ کرتی ہے لیکن عورت ہو کر بھی تم نے مڑ کر پوچھا تک نہیں۔'' وہ اب اپنی اور خولہ کی انلارج شادی کی فوٹو کے سامنے رک کر بڑبڑایا تھا۔ شکوہ کیا تھا......تو وہ اندر خانے اسے مس بھی کرتا تھا۔

☆......☆......☆

معلوم تو پہلے سے تھا کہ یہی ہونا ہے مگر جب ہونی اپنی ہونی پر آئی تو سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

''جب بڑی بہن گھر نہیں بسا سکی تو چھوٹی کیا کرے گی؟'' انکار اس بات میں لپیٹ کر منہ پر مارا گیا تھا۔ مزنہ کا ری ایکشن شدید تھا۔ وہ کمرے میں بند تھی اور کھانا تک نہیں کھایا تھا۔ احمد صاحب اور خولہ......وہ اس کے مقابلے میں سمجھدار تھے اور وہ یوں ری ایکٹ بھی نہیں کر سکتے تھے البتہ احمد صاحب کو ایک نئی پریشانی کا سامنا کرنا پڑ گیا تھا۔

''خولہ! اس کو سمجھاؤ۔ یہ کوئی دنیا کا آخری پرپوزل تو نہیں تھا۔''

''ابو! مجھے شرم آتی ہے، میری وجہ سے......''

''کیسی بات کرتی ہو خولہ۔ وہ لوگ ہی چھوٹی ذہنیت کے تھے۔'' احمد صاحب نے تکلیف سے اس کی بات کاٹی۔

''ابو!'' خولہ نے اپنا سارا حوصلہ جمع کر کے انہیں پکارا تھا۔

''میں، واپس۔'' اور جملہ ادھورا رہ گیا۔

''خولہ!'' ابو نے یک دم اس کا سر اپنے سینے سے لگایا تھا۔ ''نہ بچے۔ تم بھاری نہیں ہو مجھ پر۔'' وہ دکھ سے بولے تھے اور خولہ نے

http://kitaabghar.com

اتنا سارا......ڈھیر سارا، کڑوا، زہر ملا پانی اپنے اندر خود ہی اتارا اور خود ہی اس میں ڈوب کر ایک بار پھر سے مرگئی۔

☆......☆......☆

یہ ایک ہوٹل کا بڑا اور پرتعیش کمرا تھا اور اس وقت نسبتاً نیم تاریک سا دمکتا تھا۔ قطار میں بنی کھڑکیوں پر پردے برابر تھے۔ ان برابر کیے ہوئے سفید پردوں کے پار اندھیرا، رات کی گواہی تھا۔ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر ایک cylindrical لیمپ دھرا تھا۔ جس کی مدھم سفید روشنی کمرے کو مکمل تاریک ہونے سے بچائے ہوئے تھی۔

کمرے میں کوئی خوشبو سی تھی جو بل کھا کر چکراتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ روشنی کی طرح ہی مدھم مگر اپنا پتا دیتی ہوئی۔ شاید وہ اس بکے سے اٹھ رہی تھی جو کہ لیمپ کے پاس ہی رکھا ہوا تھا۔ جیسمین اور گلاب کے پھول۔ اس نیم تاریک کمرے میں آنکھیں جب دیکھنے کے قابل ہوں تو معلوم ہوتا تھا کہ وہاں خوشبو، مدھم، ٹھنڈی روشنی اور خنکی ہی نہیں تھیں۔ وہاں کوئی اور بھی تھا۔ ایک وجود۔ نیم جاں سا۔ کسی خوف میں مبتلا مغربی دیوار کے ساتھ یوں کھڑا تھا کہ جیسے ابھی کے ابھی ڈھے پڑے گا۔ وہ کوئی دلہن تھی شاید......نہیں......وہ یقیناً ایک دلہن ہی تھی لیکن اس کا لباس سرخ نہ تھا۔ وہ نیوی بلو کلر کے گھیر دار فراک میں ملبوس تھی کہ جس کے گھیر پہ کوئی قریب چار انچ چوڑی پٹی کی صورت سلور گرے کام ہوا ہوا تھا۔ باقی کا سارا فراک سادہ تھا۔ دوپٹے پہ جا بجا ٹکے سلور گرے موتی اور قریب کوئی دو انچ چوڑی پٹی کی صورت کام تھا۔ وہ میک اپ اور جیولری سے آراستہ دلہن نہ تھی۔ وہ منفرد تھی۔ گلے میں وائٹ گولڈ کی چین اور کانوں میں وائٹ گولڈ کے ہی ذرا بڑے چوکور شکل کے ٹاپس، اس کی اسکن گلو کر رہی تھی۔ روز پنک cheeks کے ساتھ وہ ہونٹوں پر کورل پنک لپ اسٹک لگائے ہوئے تھی۔ آنکھوں پر اسموکی میک اپ اور کاجل کی گہری دھار۔ بالوں کا اسٹائل side bun اور bun کے بالکل اوپر چند کلیاں اٹکی ہوئی تھیں۔ لمبی پلکوں کو مسکارے سے سجا رکھا تھا۔ وہ بہت دل کش دکھتی تھی۔ ابھی ٹھیک اسی پل میں اس کی دل کشی کو خوف ڈھانپتا ہوا نظر آتا تھا۔ وہ سہمی ہوئی تھی۔

ابھی ذرا دیر پہلے ہی تو نکاح ہوا تھا اور......

''یہ......یہ میں نے کیا کر دیا کیا؟'' وہ منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے گھسٹتی ہوئی بے دم سے انداز میں نیچے بیٹھتی چلی گئی تھی۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

''کیا کر دیا یہ میں نے......'' اور اب کی بار اس نے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھاما تھا۔ تکلیف ایسی تھی جیسے سانس نکلتی نہ ہو۔ جو اسے کبھی نہیں کرنا تھا۔ اور یہ طے تھا کہ ایسا نہیں کرنا تھا اسے۔ وہ ہو گیا تھا۔ ہو چکا تھا۔

''یہ......یہ کیا ہو گیا؟'' اس کے گلے سے پھنسی مگر بھرائی ہوئی آواز نکلی اور اس کے ساتھ ہی آنسو آنکھوں سے لڑھک کر ٹھوڑی تک آ گئے۔ اور پھر وہ ٹپ ٹپ قطروں کی صورت گرنے لگے، بہنے لگے اور یوں گر کر، بہہ کر وہ اس تکلیف کو پوری طرح سے بیان کرتے تھے جو کہ اس وقت، اس چہرے پر موجود تھی۔ اور پھر یک دم وہ چونکی اور چونکانے والی چیز......دروازہ کھلنے کی آواز تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز

http://kitaabghar.com

پر اس کی حالت اور خراب ہوئی تھی۔ وہ مزید سہی تھی......وہ منہ پر ہاتھ رکھے، بے یقینی سے دروازے کی سمت دیکھ رہی تھی۔

ایک ہیولہ سا نمودار ہوا اور اس ہیولے کے سائے نے اس کے سارے وجود کو چھپا کر رکھ دیا تھا۔ جوتوں کی چاپ ابھری اور سایہ گھٹتا گھٹتا بالکل معدوم ہوا اور عین اس کے سامنے آرکا۔ وہ خود میں اتنی ہمت نہ پاتی تھی کہ نظر اٹھا کر اس کی سمت دیکھ سکے۔ وہ اپنی نظروں کو اس کے جوتوں پر گویا چپکی پاتی تھی۔ وہ اس کے سامنے اکڑوں بیٹھا اور اس نے بیچارگی سے آنکھیں بند کی تھیں۔ وہ اس کے چہرے پہ بہنے والے آنسو اس کی گیلی لرزتی پلکوں اور کانپتے ہونٹوں کو دیکھتا رہا......اور پھر انگلی بڑھا کر اس کے چہرے کی نمی کو محسوس کیا۔ جیسے ہی انگلی نے اس کے چہرے کو چھوا، اس کے رونے میں شدت آئی تھی۔ اس نے دانتوں تلے ہونٹوں کو دبا کر، انہیں کانپنے سے روکنا چاہا مگر ناکام رہی۔

''ہمایوں......'' اور اس کے منہ سے ازحد لاچاری، بے بسی سے کانپتا ہوا فقط یہ نام نکلا تھا۔

☆......☆......☆

جو کام جہانگیر کرنے پر راضی نہ تھا اور جس ایک کام کے لیے احمد صاحب بھی اپنی انا کا بت کھڑا کر کے اڑ گئے تھے۔ وہ ایک کام، وہ فیصلہ تقدیر نے کروا چھوڑا تھا۔ ایک بار پھر سے اسے مزنہ کے لیے، مزنہ کی وجہ سے ہی مار کھانی پڑی تھی۔ معلوم نہیں دنیا کم ظرف لوگوں سے بھر گئی تھی یا کہ ایسے لوگوں نے ان کا ہی گھر دیکھ لیا تھا۔ مزنہ کے لیے جو بھی کوئی پروپوزل آتا انہیں خولہ کی موجودگی آنکھ کا کنکر بن کر چبھنے لگتی، کھٹکنے لگتی۔ یوں جیسے خولہ کوئی آسیب تھی۔ کوئی متعدی بیماری تھی۔ زیادہ تر لوگ اسی ایک وجہ پر پیچھے ہٹے تھے اور مزنہ......وہ روز بروز خاموش ہوتی جا رہی تھی۔

گو کہ خولہ کے ساتھ اس کا رویہ بدلا نہ تھا مگر وہ پہلے جیسا بھی نہیں رہا تھا۔ وہ اس سے بہت کم بات کرتی۔ اور خولہ ایک بار پھر سے زندگی کے اس مقام پر آکھڑی ہوئی کہ جہاں سے راستہ دوراہے میں بدل جاتا ہے، ادھر یا ادھر......فیصلے کی گٹھڑ ایک بار پھر اسی کے سر تھی۔ مجبوری تھی اور یہ ہی مجبوری احمد صاحب کی انا پر ضرب بن کر پڑتی تھی۔ وہ کمزور پڑ رہے تھے تو اس سے پہلے کہ کوئی خود منہ بول کر اس سے کہتا۔ اور اس سے پہلے کہ مزنہ برداشت کرتے کرتے بالآخر ایک روز اس کے سامنے پھٹ پڑتی، اسے طعنہ مارتی، وجہ قرار دیتی اور اس کی خود کی عزت، دھڑام سے خود اسی کے پیروں میں آن گرتی تو یہ کہ سمجھ کا استعمال کر لینا چاہیے تھا۔ عقل کا دروازہ کھول کر دیکھ لینا چاہیے تھا کہ بقا کا کوئی ایک آدھ راستہ بچا ہے یا نہیں۔ چاہے اس رستے پر چلنا کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو گا مگر یہ خود کی عزت سے زیادہ پیارا تو نہیں تھا۔

میاں، بیوی میں ایک پردہ ہوتا ہے اور ضرور ہوتا ہے اور وہ ہے عزتِ نفس۔ خولہ نے خود ہی اپنی عزتِ نفس کے پردے کو تار تار کر دیا تھا۔ بڑا مشکل کام تھا، محبت میں منہ چڑھے دریا پار کرنے آسان ہوتے ہیں اور اگر بن محبت کے ایسا کوئی دریا پار کرنا پڑ جائے تو؟ اترنا آسان ہرگز نہیں ہوتا اور پاؤں ڈالنا سخت کام......اور اس نے یہ بھی کر لیا، کر دکھایا۔

''میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں خولہ!'' اس کی تیاری دیکھ کر احمد صاحب نے کہا تھا تو سارے اعتراضات کے باوجود وہ ایک بار پھر

http://kitaabghar.com

مزنہ کی محبت میں اسے ہار رہے تھے۔

''نہیں ابو!'' وہ تکلیف سے مسکرائی۔

''یہ راستہ...... طے ہونے کے واسطے میرے پاؤں مانگتا ہے۔ آپ کب تک ساتھ دیں گے؟ آپ کو کیوں خود کے ساتھ تھکاؤں؟'' اس نے نرمی سے ان کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ وہ بے بسی سے اسے دیکھتے رہے۔ اور پھر ان کا ہاتھ اپنی جیب تک گیا اور جب باہر آیا تو اس میں ایک چیک تھا۔

''نہیں ابو!'' وہ بدکی۔

''خولہ بچے! مجھے یہ کرنے دو۔ اس سے تو انکار مت کرو۔'' وہ بھیگی آواز میں بولے تھے۔

''ابو! مجھے جب ضرورت ہوگی تو میں مانگ لوں گی۔ لے لوں گی، میری امانت سمجھ کر آپ اپنے پاس رکھیے۔'' اس نے ان کا چیک والا ہاتھ دوبارہ انہی کی جیب کے اندر کر دیا تھا اور جب وہ مزنہ سے ملی تو وہ رو رہی تھی۔

''جب میری شادی ہو جائے گی تو آپ پھر سے ادھر آجانا آپی!'' روتے روتے ایک بچکانہ سی بات اس نے کہی تھی اور خولہ زور سے ہنس دی تھی۔ ایک بھیگی سی ہنسی۔

''ٹھیک ہے۔'' اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے، اپنے آنسو اندر اتارتے ہوئے خولہ نے جواب دیا تھا۔ مزنہ کو دیکھتے ہوئے اسے معلوم نہیں کیوں یہ یاد آیا تھا۔ ''ابو نے کہا تھا کہ مزنہ چھوٹی ہے، برداشت نہ کر پائے گی۔'' ابو نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ واقعی برداشت نہ کر پاتی۔ اس کے اپنے ساتھ جواب ہو رہا تھا۔ وہ کون سا اس سے برداشت ہو سکا تھا۔ لیکن سوال یہ کہ اسے کون سی برداشت کی گھٹی پلا دی گئی تھی۔ آخر کون سی؟

☆......☆......☆

اس کے ہاتھ سے سامان چھوٹ کر زمین پر جا گرا تھا۔ شدید دھچکا تھا یہ۔ وہ بے حد شاک سے انہیں دیکھتی رہی۔

''پھپھو!'' چیخنے کے سے انداز میں وہ ان کی طرف بھاگی تھی۔

''کیا ہوا ہے آپ کو؟'' اور جب وہ گھر آئی تو پھپھو کی حالت دیکھ کر وہ ایک صدمے کا شکار ہوئی تھی۔

''خولہ!'' فرخندہ نے بچوں کی طرح بازو پھیلائے اور خولہ نے انہیں بانہوں میں لے لی۔ وہ زاروقطار رو رہی تھی۔ ان کی تو شکل ہی بدل چکی تھی۔ بے حد کمزور نظر آ رہی تھیں وہ۔

''جہانگیر نے ذرا بھی پروا نہیں کی آپ کی؟ آپ دوائیں نہیں لیتی رہیں؟'' وہ دکھ، حیرانی اور پریشانی سے روتے روتے پوچھ رہی تھی۔

http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com

''دوائیں تنہائی اور غموں کا علاج نہیں کرتیں بیٹا۔'' روتے ہوئے فرخندہ نے جواب دیا تھا۔خولہ یکدم لاجواب ہوگئی تھی۔کتنی ہی دیر وہ منہ پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہی۔ان کو سنتی رہی، وہ کبھی ہچکیوں سے رونے لگتیں،کبھی جہانگیر پر غصہ کرنے لگتیں،کبھی خولہ کے آنے پہ خوشی کا اظہار کرتیں تو دوسرے ہی لمحے ناخوش بھی نظر آنے لگتیں۔

''بس کریں پھپھو! آخر یہ میرا گھر تھا، مجھے یہیں آنا تھا۔''

''وہ پھر سے تمہیں مجبور کرے گا خولہ۔''

''دیکھی جائے گی۔''ایک گہری سانس بھر کر اٹھتے ہوئے کمر کے گرد دوپٹہ کستے ہوئے وہ بولی تھی۔پھپھو تو پھپھو،گھر کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔

''تم کیا کرنے لگی ہو؟''اسے یوں کھڑا ہوتے دیکھ کر فرخندہ اچنبھے سے بولیں۔وہ نام کا مسکرائی اور پھر ان کے قدموں کے پاس بیٹھ کر چہرہ اونچا کر کے پھپھو کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''گھر سنبھالنے لگی ہوں پھپھو۔''

☆......☆......☆

اپنے پاس موجود چابی سے وہ دروازہ کھول کر اندر آیا تھا اور آتے ہی صحن کو دیکھ کر ٹھٹکا تھا۔معمول سے ہٹ کر کچھ تھا کیا؟ وہ سمجھ نہیں پایا۔(صفائی انسانوں والے طریقے سے کی گئی تھی) وہ ذرا سا الجھا،رکا اور پھر''فار گیٹ اٹ'' والے انداز میں سر جھٹک کر اندر کی طرف بڑھ گیا تھا۔

گھر میں خاموشی کا راج تھا۔اس نے چابیاں کارنس پر رکھیں اور ایک نظر سارے گھر پر دوڑائی۔یہاں بھی کچھ غیر معمولی تھا،کیا۔پھر سے سمجھ نہ آیا تھا۔وہ امی کو آواز دیتے دیتے رکا تھا۔یکدم اسے خیال آیا تھا کہ عموماً وہ اس کے آنے تک جاگ رہی ہوتی ہیں۔آج لگتا تھا کہ سو گئی ہیں اور یہ بھی خلافِ معمول تھا۔وہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا ان کے کمرے تک آیا۔آہستگی سے دروازہ کھول کر دیکھا۔وہ بے سدھ سو رہی تھیں۔جہانگیر نے اسی نرمی کے ساتھ دروازہ بند کر دیا کہ جس نرمی سے کھولا تھا۔

ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے وہ اپنے روم میں آیا۔ٹائی اتار کر بیڈ پر پھینکی،خود بھی گرنے کے سے انداز میں بیڈ پر بیٹھا اور جوتے اتارنے لگا۔جوتے اتار کر جب وہ انہیں شو ریک میں رکھنے لگا تو جیسے ایک اور بات گرفت میں آئی تھی۔جوتوں کے جوڑے سارے ترتیب سے بالکل سیدھے،بنا گرد کے رکھے ہوئے تھے اور ایسا آج خولہ کے جانے کے بعد پہلی مرتبہ ہوا تھا۔وہ اب کی بار چونکا۔سیدھا ہو کر اس نے بے اختیار بیڈ کی طرف دیکھا تھا۔بیڈ شیٹ ملازمہ روزانہ ٹھیک کر کے جاتی ہی تھی لیکن کوئی نہ کوئی کونہ لٹک رہا ہوتا تھا اور آج......بنا سلوٹ کے ایک ترتیب سے،مناسبت سے بیڈ شیٹ ٹھیک کی گئی تھی۔کوئی کونہ لٹک نہیں رہا تھا۔اس نے فوراً بیڈ کراؤن کی طرف

دیکھا۔ وہاں بھی روزانہ کی طرح ڈسٹ موجود نہیں تھی۔

''ویٹ آ منٹ۔'' وہ بڑبڑایا اور آنکھیں سکیڑ کر کچھ سوچنے لگا۔ ایک خیال سا ذہن میں چکر کھانے لگا تھا، وہ چند لمحے تذبذب کا شکار ہو کر اپنے خیال کو ''خوش فہمی'' کا نام دیتا رہا اور پھر چیک کرنے کے واسطے خیال پر یقین کا ٹھپہ لگانے کے واسطے وہ کچن کی طرف گیا۔

''ہا۔'' اور کچن کو دیکھ کر، بے ساختہ خوشی سے اس کے منہ سے نکلا تھا۔

''تو آپ آ ہی گئیں۔'' دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈال کر وہ مسرت سے بولا تھا۔ ایک سرشار کر کے رکھ دینے والی خوشی نے پورے جسم میں تیز رفتاری سے چکر کھایا تھا۔

''لیکن آپ ہیں کہاں؟'' دوسری بات یہ ہی ذہن میں آئی تھی، صحن میں نہیں تھی، یہاں بھی کہیں نہ تھی تو پھر؟ اور بے ساختہ اس نے وال کلاک دیکھا۔ تو پھر وہ چھت پر ہی تھی۔ اس ٹائم وہ چھت پر واک کیا کرتی تھی۔ جہانگیر مسکراتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھا تھا۔

☆......☆......☆

وہ جانتی تھی وہ گھر آ چکا ہے اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ اس کی موجودگی سے بے خبر بھی نہیں رہے گا۔ دونوں ہاتھ گرل پہ سختی سے جمائے وہ ایک بیچارگی کی سی کیفیت میں کھڑی تھی۔ اذیت جسم کے بخیے ادھیڑ رہی تھی، جسم کو ریشوں میں بدل رہی تھی۔ آسان نہ تھا اس کا سامنا کرنا۔ وہ رونا چاہتی تھی لیکن دل کو ایک سخت خوف نے جکڑ رکھا تھا۔ وہ اب، اب کیا کرے گا اس کے ساتھ۔ طعنے۔ زہریلی باتیں۔ بے عزتی۔ وہ اس پر ہنسے گا، اس طرح کہ مر جانے کو جی چاہے گا، وہ عزت کا ایک احساس بھی اس کے پاس نہ رہنے دے گا۔ کوئی ایک ایسی بات بھی نہیں کہ جس سے اس کا جھک جانے والا سر کبھی اٹھ سکے گا اور پھر۔ پھر یکدم اس کا دل دھک کر کے رہ گیا تھا۔ جسم پر ایک کپکپی سی دوڑی تھی۔ اس کی پشت پر موجود سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ ابھر رہی تھی اور وہ چاپ لمحہ بہ لمحہ واضح سے واضح تر ہوتی جا رہی تھی۔ ساعت بہ ساعت قریب سے قریب تر......اور وہ......اس نے آنکھیں بند کر کے سانس روک لی۔

کتنے اور کڑوے جملے؟ کتنی اور تکلیف؟ کتنا زہر؟ کتنی اذیت؟ کتنی اور بے عزتی؟ جیسے جیسے قدموں کی چاپ ابھر رہی تھی، ویسے ویسے اس کے ہاتھوں کی گرفت کستی جا رہی تھی اور پھر......پھر چاپ قریب ترین واضح ترین ہو کر عین اس کی پشت پر ساکت ہو گئی تھی۔ اس قدر قریب کہ وہ اپنی پشت پہ، کسی دوسرے وجود کی حدت محسوس کر سکتی تھی۔ بے اختیار اس نے آنکھیں کھولی تھیں، اس کا گلا خشک ہو رہا تھا اور وہ اسے تر بھی نہیں کر پا رہی تھی۔

''تھینک گاڈ کہ تم آ ہی گئیں۔'' جہانگیر نے یہ کہتے ہوئے یک دم اس کا رخ اپنی جانب کر کے اسے گلے سے لگایا تھا۔ اور وہ......؟ بھک سے اس کا ذہن اڑ گیا تھا۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ دو قدم اس سے دور ہوتے ہوئے اس نے کچھ کہنا چاہا مگر حلق جواب دے گیا تھا۔ وہ اب بھی بے یقینی سے ہی اسے دیکھ رہی تھی اور وہ یوں دور ہٹی تھی جیسے کرنٹ لگا ہو۔ جہانگیر اس کی حالت کا اندازہ کر

سکتا تھا، پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر، وہ سر جھکا کر ہنس دیا تھا اور پھر آہستگی سے اس نے دو قدم کا فاصلہ عبور کیا۔ اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس کی حیرانی سے لبریز آنکھوں میں دیکھا۔

''میں نے تمہیں بہت مس کیا خولہ!'' وہ سچ کہہ رہا تھا۔ یہ اس کے لہجے، اس کے چہرے سے عیاں تھا اور یہ ایک اور وار تھا۔ خولہ کے پیٹ میں گھونسا سا پڑا تھا۔ اس نے منہ کھول کر پھر سے کچھ کہنا چاہا اور ایک بار پھر سے ناکام رہی۔ ہونٹ بھینچتے ہوئے اس نے رخ موڑا تھا۔ وہ ابھی، اس وقت، یوں اس شخص کے سامنے کم از کم آنسو تو ہرگز نہیں بہانا چاہتی تھی، رخ موڑے کچھ کڑوا کڑوا سا پیتے ہوئے وہ یونہی کھڑی رہی۔

''خولہ!'' جہانگیر نے اس کے ہاتھوں کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور اس نے چہرہ موڑ کر سرخ ہوتی آنکھوں کے ساتھ اس کو دیکھا......اور دیکھتی رہی، یوں جیسے اس کی کہی بات کا یقین کرنا چاہتی ہو۔

''تو تم نے مجھے مس کیا؟''

''ہاں۔ اور جن کو مس کیا جاتا ہے، ان کے ساتھ یہ کیا جاتا ہے جہانگیر؟ چھ ماہ، چھ ماہ۔'' دکھ اور غصہ جمع ہو کر لہجے سے چھلکا اور وہ بات مکمل نہ کر سکی۔ اس سوال پر جہانگیر نے ایک گہری سانس بھری۔

''خولہ! میں ماموں کے سامنے جھک نہیں سکتا تھا۔ جب وہ کسی معاملے میں دخل اندازی کرتے ہیں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ مجھے نیچا دکھانا چاہتے ہوں، احسانات جتا کر اپنی مرضی مجھ پر مسلط کرنا چاہتے ہوں۔'' وہ اسے حقیقت بتا رہا تھا۔ واقعی میں وہ ایسا محسوس کرتا تھا۔ خولہ نے بے اختیار آنکھیں بند کر کے تکلیف سے سر کو جھٹکا۔

وہ کیا اب اس شخص کو......اس شخص کو بتائے چھ ماہ کی تکلیف......اذیت......

''ٹھیک ہے ابو کو نہ سہی۔ تم مجھ سے تو کہہ سکتے تھے ناں واپس آنے کے لیے۔''

''تم آنا نہیں چاہتی تھیں تو میں کیوں کہتا۔''

''جہانگیر! تم نے خود مجھے بھیجا تھا۔ ان فیکٹ نکالا تھا، میں اپنی مرضی سے نہیں گئی تھی۔'' اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اس کا گریبان پکڑ لیتی، کیا کرنا اس طرح کی چاہت کا۔

''میں تمہارے سامنے بھی جھکنا نہیں چاہتا تھا۔''

اور اس جواب پہ خولہ یکدم ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ وہ اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی تھی۔ یوں جیسے آج کے بعد اسے اس شخص کے ساتھ زندگی گزارنے کا کلیہ سمجھ میں آ گیا، وہ نیم وا ہونٹوں اور تعجب سے بھری آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔

''بھوک لگ رہی ہے۔'' چند لمحوں بعد جہانگیر نے سر کھجا کر کہا تھا۔ وہ ایک بار پھر سے اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

''تم چلو میں آتی ہوں۔'' خولہ نے ہاتھ نرمی سے چھڑوائے۔

''ساتھ کیوں نہیں چلتی ہو؟'' وہ جاتے جاتے یک دم مڑا تھا۔

''آتی ہوں جہانگیر!'' اور وہ زچ نظر آئی تھی۔

ساتھ کیسے چلتی؟ اس کا مقام متعین کر دیا گیا تھا اور اسے وہ سارے آنسو بھی تو بہانے تھے جو اندر غبار کی طرح چھاتے ہی چلے جا رہے تھے۔ اگر اچھا نہیں تھا تو اتنا برا اور دردناک بھی نہیں تھا جو تب ہوتا اگر جہانگیر طعنے دے دے کر اس کی زندگی اجیرن کر دیتا۔ اس تکلیف کے مقابلے میں یہ، یہ کچھ بھی نہ تھا۔ وہ ہنس کر برداشت کرنے کو تیار تھی۔ خولہ نے آسمان کی طرف دیکھا۔

''مصلحتوں کو سمجھا نہیں جا سکتا میرے اللہ۔ لیکن یہ سچ ہے، حقیقت ہے کہ بساط سے زیادہ آزمائش نہیں اترتی آسمان سے۔'' چند آنسو گال پر لڑھکے اور پھسل کر اس کا چہرہ بھگو گئے۔

نفرت کے مقابلے میں یہ مشروط سی محبت کافی تھی۔ زندگی بھر کے لیے۔

☆......☆......☆

جہانگیر نے سی وی بنانے کے لیے اس سے ڈاکومنٹس مانگے تو اس نے بنا کچھ کہے، ڈاکومنٹس دے دیئے تھے۔ جہانگیر خود ہی اپلائی کرتا رہتا۔ اس کے نمبر پر کالز آتیں تو اسے معلوم ہوتا تھا، جاب انٹرویو کی اس سے زیادہ جہانگیر کو فکر ہوتی تھی۔ اس کے ڈریس کی، گفتگو کی، accent کی، انگلش کی، کس سوال کا کیا جواب دینا ہے اور کس طرح دینا ہے۔ وہ اسے گائیڈ کرتا رہتا، معلوم نہیں یہ اس کی ناکامی تھی یا قسمت۔ ابھی تک وہ کامیاب نہ ہو سکی تھی۔

''یار خولہ کیا ہے؟ کہاں بیٹھ کر ایم ایس کیا ہے تم نے۔'' جہانگیر جھنجھلا جاتا اور وہ سوائے دل جلانے کے اور کچھ نہیں کرتی تھی۔

یہ انہی دنوں کی بات تھی کہ ایک ملکی اور غیر ملکی اشتراک سے چلنے والے اسکول میں ویکینسیز اوپن ہوئی تھیں اور جہانگیر کی قسمت اسے سفارش مل گئی تھی۔ اس کے باس کے ایک دوست اسکول کے director تھے، خولہ کا کام بس ایک اچھا انٹرویو دینا تھا اور بس......اور پھر جس دن اسے اپائنٹمنٹ لیٹر ملا تو جہانگیر بے حد خوش تھا۔ وہ اسے ڈنر پر لے گیا تھا۔ لیکن......لیکن یہ کہ وہ اس کی خوشی اور اس ڈنر کا کیا کرتی۔ اس کا دل بجھ چکا تھا۔ یہ مجبوری تھی اور بس۔ وہ تو سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی کہ کس طرح سے وہ گھر اور جاب کو سنبھال پائے گی۔ یہ مشکل تھا اور وہ عادی نہ تھی۔

کینڈل لائٹ ڈنر تھا، ماحول پر خوشگواریت تھی۔ میز پہ بہترین نعمت کھانے کی شکل میں موجود تھی۔ اس کا لائف پارٹنر سامنے بیٹھا رغبت اور تیزی سے کھاتا ہوا بولتا جا رہا تھا۔ ایک پرفیکٹ ماحول، پرفیکٹ سچویشن......لیکن وہ، وہ کیا کرتی، اس ماحول کا۔ اس پر تکلف کھانے کا، ایک مکمل رومینٹک منظر کا، جب دل ہی بیزار ہو چکا تھا تو اس سب کا کیا کیا جاتا؟ آخر کیا؟

☆......☆......☆

''مزنہ! کیا ہوگیا ہے تمہیں؟ یہ اتنا سیریس ایشو تو نہیں ہے جس پر یوں ری ایکٹ کیا جائے۔'' وہ آج بطورِ خاص اتنے عرصے بعد اسے سمجھانے، بات کرنے آئی تھی۔ احمد صاحب نے ہی اسے بلوایا تھا۔

''مجھ سے ابو کی پریشانی نہیں دیکھی جاتی آپی!''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر تمہاری حالت ان سے زیادہ خراب ہے۔''

اس سوال کا جواب مزنہ کے پاس نہیں تھا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ خولہ کے جانے کے بعد بھی مزنہ کو ابھی تک ریجیکشن کا سامنا تھا۔ سمجھ نہیں آتی تھی کہ کمی کوئی نہ تھی۔ خوب صورت وہ خولہ سے زیادہ تھی، پڑھی لکھی تھی۔ خاندانی نجابت بھی تھی پھر بھی...... پھر بھی اسے ریجیکشن کا سامنا تھا۔ کوئی کہہ جاتا لڑکی پڑھی لکھی مگر کم عمر چاہیے۔ بندۂ خدا جو لڑکی پوسٹ گریجویٹ تک جائے گی وہ منہ میں چوسنی تو نہیں لے کر جائے گی۔ کوئی اس کے بے حد مناسب قد کو چھوٹا کہہ کر ریجیکٹ کر جاتا۔ غرض کہ کسی شہزادے کی ماں کے معیار پر وہ ابھی تک اتری نہ تھی اور کبھی یہ ہوتا کہ احمد صاحب کو ہی پروپوزل پسند نہیں آتا۔ سو اب یہ بات پریشان کن ہو چلی تھی۔ احمد صاحب تو جو پریشان تھے سو تھے ہی، مزنہ کی حالت کو بجا طور پر ڈپریشن کا نام دیا جا سکتا تھا۔

''شادی ایک مسئلہ ہے مزنہ! لیکن اتنا بڑا بھی نہیں کہ اس کے لیے یہ حالت بنائی جائے۔ ایک وقت مقرر ہے اور جب وہ مقررہ وقت کو کن کا حکم ملے گا تو اس ساعت سے ایک گھڑی کم، نہ ایک گھڑی زیادہ۔ وہ اسی مقررہ وقت پر ہو کر رہے گا، کوشش تو کر رہے ہیں تو اب اللہ پر توکل کرنا چاہیے ناں۔ یقین رکھو اللہ بہت اچھا کرے گا تمہارے لیے۔'' مزنہ کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے وہ بے حد پیار اور نرمی سے اسے سمجھا رہی تھی اور مزنہ کا جواب آنسو تھے۔ خولہ نے ایک گہری سانس کھینچ کر اپنے ہاتھ ہٹائے تھے۔ وہ اب سسکیوں سے رو رہی تھی۔

''آئی ایم سوری آپی! میں نے آپ کو ہرٹ کیا تھا ناں۔ گو کہ میں نے آپ کو یہاں سے چلے جانے کو نہیں کہا تھا لیکن میں نے رکنے پر بھی مجبور نہیں کیا۔ سو میرے ساتھ یہ تو ہونا ہی تھا۔''

''کیا بکواس ہے مزنہ! کیسی فضول سی سوچ ہے، میرا یہاں سے جانا اسی طرح سے ہی لکھا تھا، وہ بات تو محض ایک بہانہ تھی، تم......تم نے ایسا کیسے سوچ لیا۔'' اس نے خفا ہوتے ہوئے فوراً کہا تھا۔

''پھر بھی آپی......''

''شٹ اپ مزنہ۔''

اور مزنہ بے اختیار ہونٹ کاٹتے ہوئے خاموش ہوئی تھی۔ وہ چند لمحے اس کا رویا رویا چہرہ دیکھتی رہی۔

''چلو اٹھو۔'' اور پھر یک دم کھڑے ہو کر اس کا ہاتھ کھینچا۔

''کیا؟'' وہ حیران ہوئی۔

''اٹھو۔کہیں باہر چلتے ہیں۔''

''میرا موڈ......''

''تھپڑ ماروں گی اب اگر انکار کیا تو۔"''وہ اب کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے، چہرہ اس کے چہرے کے برابر لا کر بولی تھی۔لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

''پزا، شوارما، آئس کریم یا......؟''

''پزا۔''مزنہ نے بے اختیار کہا تھا اور کہہ کر یک دم کھسیا بھی گئی۔

''ہاہاہا۔''خولہ دل کھول کر ہنسی تھی۔پزا مزنہ کی شدید ترین کمزوری تھا۔

☆......☆......☆

''مسز جہانگیر! آپ ذرا میرے آفس آئیں۔''سخت لہجے میں کہہ کر مس مفتی وہاں سے چلی گئی تھیں۔وہ تو کہہ کر چلی گئیں لیکن خولہ کی سانس خشک کر گئی تھیں۔وہ چند لمحے اسی حالت میں بیٹھی رہی، اسٹاف روم میں اور بھی ٹیچرز موجود تھیں جو کہ اس کی بدلی رنگت والے چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔یہ کوئی پہلی مرتبہ اس کے ساتھ ہونے نہیں جا رہا تھا بلکہ یہ معمول کا حصہ تھا۔دن میں ایک بار، ایک مرتبہ تو لازمی ہی اسے پرنسپل کے آفس میں حاضری دینی پڑتی تھی اور ایسا ان غلطیوں کی وجہ سے تھا جو آئے روز اس سے معلوم نہیں کیسے، بنا اسے بتائے بنا کوئی خبر دیئے ہی سرزد ہو جایا کرتی تھیں۔

کبھی کسی بچے کی ڈائری گم کر دی، کبھی کسی کی نوٹ بک ان چیکڈ رہ گئی۔کبھی copy checking میں غفلت، کبھی کلاس روم مینجمنٹ کے مسائل اور کبھی ٹائم مینجمنٹ کے۔گو کہ اس قسم کے مسائل سے ہر اس شخص کو دوچار ہونا پڑتا ہے جو کہ پہلی مرتبہ اسکول ٹیچنگ کر رہا ہو مگر خولہ کا مسئلہ یہ تھا کہ ایک ماہ گزر جانے کے باوجود وہ ابھی تک اپنی غلطیوں پہ قابو نہ پا سکی تھی اور اسی چیز کی بنا کر وہ مس مفتی کی good book میں نہ تھی۔

مس مفتی ایسی منتظم اعلیٰ تھیں کہ جن کو محض اچھے کام اور devotion ہی سے متاثر کیا جا سکتا تھا۔ایک تو خولہ کی سفارشی اپائنٹمنٹ اور اوپر سے اس کی پرفارمنس۔یہ سب کافی تھا اسے مس مفتی کی نظروں میں گرانے کے لیے......اور ابھی ایک عدد کڑوا، تلخ جام ڈانٹ کی شکل میں اسے پینا تھا۔وہ مرے مرے قدموں سے ان کے آفس تک گئی تھی۔اس کے اجازت لینے پر مس مفتی نے اسے ایک نظر دیکھا اور جس نظر سے دیکھا تھا وہ اس کی ٹانگوں کو بے ہمت کر دینے کے لیے کافی تھا۔قریب پہنچنے پر انہوں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اس کے بیٹھتے ہی انہوں نے ایک بچے کی ڈائری ٹیبل کی سطح پر سلائڈ کرتے ہوئے اس کے آگے کی تھی۔اس نے ناسمجھی سے ڈائری کو دیکھا اور پھر پرنسپل کو......اور مس مفتی کی نظروں نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ دوبارہ ڈائری کی طرف دیکھے۔اس نے ڈائری کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔

صفحے آگے پیچھے کیے لیکن اپنی غلطی نظر نہیں آئی تھی۔

''ڈیٹس دیکھیے مسز جہانگیر ڈیٹس۔'' اسے مس مفتی کی سخت آواز سنائی دی تھی۔ ان کی نظریں اسے ہی فوکس کیے ہوئے تھیں اور جب اس نے ڈیٹس دیکھیں تو......تو اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔ بچے کی ڈائری دو دن سے نہیں لکھی تھی اور اب وہ ان سے یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ بچہ غیر حاضر رہا تھا۔ وہ یقیناً حاضر ہی رہا تھا، جبھی اس کی ڈائری یوں اس کے سامنے رکھی گئی تھی۔ بے ساختہ اس نے منہ پر ہاتھ رکھا تھا، یقیناً بچے کے گھر سے ہی شکایت آئی تھی۔

''مسز جہانگیر! آپ کے گھر میں کوئی ٹینشن ہے کیا؟ کوئی اسٹریس؟ آئی ایم سوری۔ اگر میں پرسنل ہو رہی ہوں تو لیکن آپ کی کارکردگی نے مجھے پرسنل ہونے پر مجبور کیا ہے۔'' اب مس مفتی کا لہجہ نسبتاً نرم تھا۔ خولہ کو سخت شرمندگی محسوس ہوئی۔ وہ کچھ دیر کے لیے ایسے ہی سر جھکائے بیٹھی رہی۔

''میں آپ کو سوری نہیں بولوں گی مس مفتی۔ میں اب اپنی پرفارمنس سے ثابت کروں گی کہ مجھے واقعی اس بات پر شرمندگی ہے۔ میں وضاحت بھی نہیں دوں گی کیونکہ میری وضاحت آپ کو بہانے سے زیادہ اور کچھ محسوس نہ ہوگی اور جہاں تک بات ہے اسٹریس کی تو میری کوشش ہوگی کہ اگر کوئی پریشانی ہے بھی تو اسے گھر ہی چھوڑ کر آؤں، اسکول تک نہ لے کر آؤں۔'' اور جب وہ یہ بات کہتی تھی وہ سنجیدہ اور پرعزم سی دکھتی تھی۔ پریشانیاں تو بہت تھیں اس کی زندگی میں۔ مس مفتی چند لمحے اسے دیکھتی رہیں یوں جیسے جانچنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

''let's see'' ایک گہری سانس بھر کر انہوں نے اسے کہا تھا۔

☆......☆......☆

''یہ کیا ہے؟'' جہانگیر نے سالن کے ڈونگے سے چمچ بھر کر ذرا سا اونچا کیا اور پھر چمچ سے شوربہ ڈونگے میں گراتے ہوئے پوچھا تھا۔ خولہ کھانے کی میز پر چپاتیاں رکھ رہی تھی۔ اس نے جہانگیر کو ایک نظر دیکھا اور پھر بڑے سکون سے جواب دیا۔

''سالن۔''

''سالن؟ یہ تو سالن جیسی کوئی چیز محسوس ہو رہی ہے۔'' اس نے دوبارہ سے چمچ اٹھا کر شوربہ گراتے ہوئے کہا۔ شوربہ بے حد پتلا تھا۔

''تو پھر آج یہی سالن نما چیز کھانی پڑے گی۔'' کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے وہ بولی تھی۔ سکون میں اب بھی فرق نہیں آیا تھا۔

''کہاں گئے وہ چائنیز۔ اٹالین اور اعلیٰ دیسی کھانے؟'' وہ طنز کر رہا تھا۔

''اگر ایسے کھانے کھانے کا شوق ہو رہا ہے تو کک رکھ لیں۔'' خولہ کا لہجہ بھی طنزیہ ہی تھا۔ فرخندہ خاموشی سے ان دونوں کی گفتگو سن رہی تھیں۔

''کیوں تمہارے ہاتھ کے ذائقے کو کیا ہوا؟'' وہ اب تلخ ہوا تھا۔ خولہ نے ہونٹ بھینچ کر اس بات پر اسے دیکھا۔

''وہ ہاتھ کا سارے کا سارا ذائقہ بورڈ مار کر کی سیاہی پی گئی جہانگیر۔'' وہ تکلیف اور غصے سے بولی تھی اور بول کر رکی نہیں۔ اٹھ کر کھانا کھائے بنا ہی چلی گئی۔ جہانگیر نے پہلے تو حیرت سے اس کے جواب کو سنا اور پھر حیرت ہی سے اس کی حرکت کو دیکھا تھا۔

''کچھ زیادہ ہی زبان نہیں چلنے لگی اس کی؟'' وہ ناگواری سے بڑبڑایا تھا۔

''وہ......دو دو ذمے داریاں نہیں سنبھال پا رہی ہے جہانگیر! جاب کے لیے تم نے اسے مجبور کیا، اب اس بات پر سمجھوتا کرو نا ں تم۔'' فرخندہ نے نرمی سے اسے سمجھایا تھا۔

''کرنے والے کر لیتے ہیں امی۔ یہ ہے ہی سست، ماموں نے بھی بیٹیوں کو بس عیش کرنا ہی سکھایا ہے۔'' اس کے اس قسم کے جواب پر فرخندہ چپ ہو کر رہ گئی تھیں۔ کچھ کہا یا سمجھایا اسے جاتا ہے جو سمجھنے پر تیار ہو۔ اسے نہیں جو ہر معاملے کو محض اپنی ہی نظر سے دیکھنے کا عادی ہو۔

☆......☆......☆

گاڑی سبک رفتاری سے بل کھاتی سڑکوں پہ چل رہی تھی۔ گاڑی کے باہر منظر بھاگتے تھے، دوڑتے تھے، زندگی چلتی تھی اور اندر......اندر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے زندگی رک سی گئی ہو، ٹھہر سی گئی ہو۔ خولہ اور احمد صاحب مزنہ کے لیے ایک پروپوزل دیکھنے گئے تھے۔ وہ لوگ مزنہ کو پسند کر چکے تھے اور احمد صاحب بے حد پر امید ہو کر ان کے ہاں گئے تھے لیکن جتنے وہ پر امید تھے اتنے ہی مایوس ہو کر لوٹے تھے۔ وہ لڑکا نہیں ''مرد'' تھا اور گھر جا کر انہیں معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک شادی بھگتا چکا تھا۔

''ابو!'' خولہ نے نرمی سے پکارا۔ ڈرائیو کرتے ہوئے احمد صاحب نے ایک سانس بھر کر اسے دیکھا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا ابو۔'' اس نے اب کے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر تسلی دی تھی۔

''معلوم نہیں خولہ! یہ سب ٹھیک ہونے کا وقت کب آئے گا۔ کیا تب کہ جب میں نہ رہوں گا۔''

''ابو! اب ایسی بات تو نہ کریں پلیز۔'' خولہ کے دل پر ہاتھ پڑا تھا۔

''کیا کروں خولہ! مزنہ کے لیے میں تمہاری جیسی غلطی دہرانا نہیں چاہتا۔ وہ اتنی حوصلہ مند نہیں ہے، میں نہیں سننا چاہتا اس کے منہ سے کہ یہ ابو نے میرے ساتھ کیا کیا؟ اور جتنا میں اس کے لیے اچھا کرنا چاہتا ہوں، اتنا ہی اسے برداشت کرنا پڑ رہا ہے گو کہ وہ یہ سب سہہ نہیں سکتی۔'' وہ اپنے دھیان میں مگن، اپنی ہی پریشانی میں بولے جا رہے تھے، یہ دیکھے بنا کہ ان کی بات پر کس طرح سے خولہ کی رنگت بدلی تھی۔ کس طرح دل کو پہنچنے والی تکلیف اس کے چہرے پر عیاں ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ چند لمحے باپ کا بوڑھا، پریشان چہرہ دیکھتی رہی اور پھر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر وہ شیشے سے باہر دیکھنے لگی کہ جہاں زندگی دوڑتی تھی اور اس بھاگتی دوڑتی زندگی کو دیکھ کر وہ سوچتی تھی۔ وہ ابو سے ایک سوال پوچھنا چاہتی تھی کہ......''اسے کون سی برداشت کی گھٹی پلائی گئی تھی۔ بھلا بتائیں تو سہی۔'' لیکن یہ سوال خاموشی کی زبان میں

http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com

پوچھا جانے والا وہ سوال تھا کہ جسے کبھی آواز نصیب نہیں ہونا تھی۔

قسمت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو قسمت سے لڑنا، اس کے مخالف چلنا جانتے ہیں۔ ان کے لیے نہیں جو اس کے آگے سر جھکا دیتے ہیں۔ مدد تو ان کی خدا بھی نہیں کرتا جنہیں خود اپنی مدد کا خیال ہی نہیں ہو۔

☆......☆......☆

وہ اس دن ہونے والا پہلا جھگڑا تو ضرور تھا لیکن آخری ہرگز بھی نہیں۔ آئے روز کے جھگڑے اب روز کا معمول تھا۔ managing skills ہر کسی میں نہیں ہوتیں اور اگر ہوتی بھی ہیں تو وہ اتنی شارپ نہیں ہوتیں کہ وہ دو دو چیزوں کو ایک ہی وقت میں سنبھال سکے۔

خولہ کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ دونوں ذمے داریاں جیسے over lap کر رہی تھی۔ وہ جاب اور گھر کو سنبھال نہیں پا رہی تھی۔ سو دونوں کام ہی خراب چل رہے تھے۔ خولہ بنیادی طور پر گھر، گرہستن تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جنہیں گھر کا کچن سب سے پیارا ہوتا ہے جو ایک وقت میں کئی کھانے بنانے کو ہی اپنی خاصیت گردانتی ہیں، اس کی ٹائپ وہ نہیں کہ جیسی جہانگیر چاہتا تھا۔ مانا کہ شوہر کے حقوق بہت سے ہیں لیکن کسی کی ذات کو، اس کے تشخص کو اپنے ہاتھ میں لینا، یہ یقیناً اس کا حق نہیں ہے تو جب آپ کسی کو اس حد تک مجبور کر دیں کہ اپنی ہی ذات، اپنی ہی فطرت کے خلاف الٹ چلنا شروع کر دے تو پھر یہ تو ہونا ہی تھا۔

جھگڑا دراصل اختلاف رائے یا پھر مزاحمت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ خولہ ہر وقت tense رہنے لگی تھی اور اسی ٹینشن نے اسے وہ ہمت دی تھی کہ وہ بات بے بات جہانگیر کے سامنے پھٹ پڑتی تھی۔ اسکول، گھر، مزنہ کا مسئلہ، ذاتی مسائل اور اگر اس سے توجہ ہٹتی تو جہانگیر کوئی نہ کوئی ایشو کھڑا کر دیتا تھا۔ اسے بیوی سے جاب بھی کروانی تھی اور گھر میں ہر چیز پرفیکٹ بھی چاہیے تھی۔ خود وہ جب گھر آتا تو نکڑ والی دکان سے ایک پاؤ دہی لانا بھی عذاب لگتا تھا اور خولہ...... اس میں کیا جنات جیسی طاقت تھی۔ وہ انسان تھی اور پھر ایک عورت، وہ گھر بھی سنبھالے، جاب بھی کرے، ساری پریشانیاں بھی برداشت کرے اور آخر میں منہ پر ایک مسکراہٹ سجا کر اچھی، مزے دار، بھاپ اڑاتی خوشبو والی چائے بھی پیش کرے...... تو خولہ کو ایک نہ ایک دن جہانگیر کی باتوں سے تنگ آنا ہی تھا اور جس دن وہ تنگ آئی، وہ دن، وہ تاریخ آ چکی تھی۔

جھگڑے کی ابتدا ہو چکی تھی اور یہ ایک تواتر کے ساتھ مسلسل ہونے لگا تھا لیکن خولہ یہ جانتی تھی کہ زندگی میں مشکلات بس یہیں تک نہیں تھیں۔ اسے کیا معلوم کہ زندگی نے تو ابھی اس کی ناک کی لکیریں نکلوا کر دم لینا تھا، زندگی نے اس کے لیے یوں بن جانا تھا کہ جیسے سیدھی راہ پر آگے جانے کے واسطے۔ الٹی چال سے چلنا ہو۔

☆......☆......☆

وہ اسکول سے بچوں کی فائلز کا ڈھیر اٹھا کر لائی تھی جسے اسے چیک کرنا تھا۔ اسی فکر میں اس نے شام کا کھانا بھی ڈھنگ سے نہیں کھایا تھا۔ جلدی سے برتن سمیٹے، میز صاف کی اور چائے بھی نہ بنائی تھی اور ان فائلز کو لے کر بیٹھ گئی تھی۔ فرخندہ نماز کے لیے اٹھ گئیں اور جہانگیر ٹی وی لاؤنج میں تھا اور جب وہ قریب گیارہ بجے کمرے میں آیا تو وہ ابھی تک فائلز میں ہی غرق تھی۔ اس نے ایک نظر خولہ پر ڈالی اور پھر وارڈروب کی طرف بڑھ گیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ خولہ نے صبح کے لیے کون سے کپڑے استری کیے تھے اور جب اس نے الماری کھولی تو اس کا ذہن بھک سے اڑ گیا۔ وہاں ایک بھی لباس استری کیا ہوا نہیں تھا اور جس زور سے اس نے پٹ بند کیے تھے اس سے کہیں اونچی آواز میں وہ غرایا تھا۔

"what the hell is this?"

خولہ بری طرح سے ڈری اور قلم اور فائل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرے۔ صفحات بکھر گئے تھے۔

"کیا ہوا ہے؟" وہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

"کیا آپ مجھے بتائیں گی کہ صبح کے لیے کون سا لباسِ شاہی پریس کر کے رکھا ہے آپ نے؟" غصے میں وہ اتنا تمیزدار ہو جایا کرتا تھا کہ اس کی یہی تمیز الٹے ہاتھ کا جھانپڑ مارتی تھی۔

"اوہ نو۔" خولہ نے آنکھیں میچ کر بے آواز کہا اور پھر اسے دیکھا۔ دیکھا کیا بس یہ اندازہ لگاتی رہی کہ فیول کتنا ہے اور وہ مزید کتنا بھڑک سکتا ہے۔

"میں کر دوں گی ابھی جہانگیر۔" اور پھر اپنے تئیں نرمی سے ہی کہا تھا۔ وہ الگ بات کہ نرمی کے بجائے، بیزاری زیادہ ٹپکتی تھی لہجے سے۔

"ہاں۔ کر دوگی۔ رات گئے تک تم یہ فضول فائلز چیک کرتی رہوگی۔ پھر نیند کا غلبہ اتنا شدید ہوگا کہ تم یہ کام صبح پر ڈال دوگی اور جب صبح ہوگی تو دوسرے کام تمہیں مجبور کریں گے کہ الٹی سیدھی استری پھیر کر کپڑے میرے منہ پر مار دو۔" اس نے بہت اچھا تبصرہ پیش کیا تھا۔

"تو اور کیا کروں میں۔ جہانگیر! میں تھکنے لگی ہوں۔ مجھ سے، مجھ سے نہیں ہوتا یہ، ابھی تو بچے نہیں ہیں کل کو فیملی ہوگی تو......"

"ہونہہ، بچے۔" اس نے اتنے درشت انداز میں بات کاٹی تھی کہ وہ ہکا بکا ہو کر اسے دیکھنے لگی تھی۔ کیا مطلب تھا آخر اس بات کا؟

"تو کیا فیملی نہیں ہوگی؟ ظاہر ہے ایک نہ ایک دن تو......"

"کان کھول کر میری بات سن لو خولہ۔" جہانگیر کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ حقیقت میں وہ اس کے کان کھول کر ہی اسے یہ بات سناتا۔

"جب تک میرے پاس اسٹیٹس، گھر، گاڑی اور اتنے پیسے نہیں آ جاتے کہ میں اپنے بچوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ معیارِ زندگی دے سکوں۔ تب تک، تب تک میں فیملی پلان نہیں کروں گا اور آج کے بعد...... آج کے بعد خبردار جو میں نے یہ بکواس سنی تمہارے منہ سے۔

http://kitaabghar.com

پہلے ہی مینیج نہیں ہو رہا اور اوپر سے اضافہ کر لو، ہونہہ۔'' بات کہہ کر اس نے دیکھا نہیں کہ سننے والے پر اثر کیا ہوا تھا۔ منہ تک چادر تان کر وہ کھولتے ہوئے انداز میں سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔

''لائٹ آف کر دو۔'' ایک اور نیا حکم جاری ہوا تھا۔ خولہ میکانکی انداز میں اٹھی اور لائٹ آف کر دی۔ اس کے بعد وہ وہاں رکی بھی نہیں تھی۔ وہ کمرے سے باہر نکلی اور پھر داخلی دروازہ کھول کر لاؤنج سے بھی باہر صحن میں نکل گئی تھی۔ وہ سیڑھیوں پر گرنے کے سے انداز میں آ بیٹھی تھی۔

چند لمحوں تک وہ بالکل خالی ذہن کے ساتھ بیٹھی رہی اور پھر اس نے مڑ کر اندر کی سمت دیکھا تھا، یوں جیسے یقین کرنا چاہا ہو کہ وہ سب......سب اس سے ہی کہا گیا تھا۔

''تو کیا، تو کیا وہ زندگی کی اس خوشی سے بھی محروم کر دی گئی تھی۔'' حالت ایسی تھی جیسے کمر پر زور سے ضرب پڑی ہو۔ اس وقت تو سیدھا کھڑا رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ پھر بے یقینی، یقین میں ڈھلی اور تکلیف بن کر پورے جسم میں دوڑ گئی تھی۔

''یا اللہ!'' وہ سسک اٹھی تھی۔ اس نے بے ساختہ آسمان کو دیکھا۔

''نہیں، نہیں، یہ......یہ برداشت سے زیادہ ہے۔'' اور وہ اپنی مناجات آنسوؤں کی سیاہی سے لکھ کر درج کروانے لگی تھی۔

''وھوالسمیع البصیر۔''

''اور ہاں، بے شک وہ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔''

☆......☆......☆

وہ ساری رات اس نے کیسے گزاری؟ کیسے گزاری؟ یوں جیسے پیروں کے نیچے سے زمین یکدم ایک جلتا توا بن گئی تھی۔ تکلیف اس قدر زور آور تھی کہ وہ پوری طرح سے تڑپ بھی نہ سکی تھی اور وہیں مر گئی، ہاں۔۔۔ خولہ احمد جسے اب تک کوئی چیز ڈھا نہ سکی تھی، مار نہ سکی تھی۔ وہ اس رات مر گئی۔ مر ہی تو گئی تھی۔ بس جی لیا اس نے زندگی کو، جتنا جینا تھا، گزار لی اور کیا ہونا رہ گیا تھا اس کے ساتھ اب۔ باقی بچا ہی کیا تھا۔ خوشی......خوشی کہاں تھی اس کے لیے؟ کہیں بھی نہیں۔ اس نے سمجھ لیا، جان لیا اور پھر مان بھی لیا۔

اس بھری دنیا میں، وسیع کائنات میں، بہت سے انسان یوں ہی پیدا ہوتے ہیں اور ایسے ہی مر جاتے ہیں، بنا یہ جانے بنا چکھے بنا یہ ٹیسٹ کیے کہ خوشی، خوشی کیا ہوتی ہے، کہاں سے ملتی ہے؟ کب ملتی ہے اور جب ملتی ہے تو کیا ہوتا ہے؟ کیسا لگتا ہے، کیسا محسوس ہوتا ہے؟ تو اس بھری دنیا میں بہت سے انسان، ایسے ہی پیدا ہوتے ہیں اور ایسے ہی مر جاتے ہیں۔ تو ایک وہ بھی سہی......خولہ بھی سہی......کیا فرق پڑتا ہے؟

زندگی سے خوشی چھیننی پڑتی ہے اور چھیننے کے لیے ہمت چاہیے، حالات کے خلاف لڑنے کا حوصلہ چاہیے۔ مشکلوں کے آگے سر جھکا دینے والوں کو کچھ نہیں ملتا۔ دریا پار وہ ہی اترتے، ساحلوں کی ریت پہ قدموں کے نشان وہ ہی ثبت کرتے ہیں کہ جن کے بازو جانفشانی

سے پانی کا سینہ چیرتے ہیں اور یہ یونہی تو نہیں ہو جاتا ناں......مر مر کر جی اٹھنا ہی زندگی ہے، اپنی ہی خاک سے سورنگوں والا پرندہ بن کر زندہ ہونا ہی زندگی ہے، اپنے ٹوٹے ہوئے پروں کو قابلِ پرواز بنانا ہی زندگی ہے کہ دانہ دانہ مل کر ہی کھیت بنتا ہے اور خوشی؟ خوشی کس کا نصیب ٹھہرتی ہے؟ اس انسان کی آنکھوں کا کہ جس نے دانہ دانہ بونے کی مشقت اٹھائی۔

☆......☆......☆

وہ اس رات کی صبح اسکول نہیں جا سکی تھی۔ اپنی سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے اس نے فجر کی اذان سنی تھی اور وہ محض اذان نہیں تھی۔ ایک دروازہ تھا، راستہ تھا، امید کی کرن تھی۔ حوصلے کا پہلا مطلب اور سہارے کا دوسرا نام تھا۔ وہ روشنی تھی، اس کے بازوؤں میں حالات کے خلاف لڑنے کی طاقت نہ تھی، قوت نہ تھی لیکن اس کے اٹھتے ہاتھوں میں اتنا دم ضرور تھا کہ پکار، دعا کی صورت آسمان کے مالک تک جا پہنچتی تھی۔

دعا، انسان کی سب سے بڑی طاقت، سب سے بڑا سہارا......جو کہ گرنے نہیں دیتی، جینے پر مجبور رکھتی ہے، وہ اٹھی، نماز پڑھی اور جب دعا مانگنے لگی تو لفظ سارے جیسے بھک سے اڑ گئے تھے۔ وہاں اب صرف آنسو تھے، شفاف، بے ریا، موتیوں کی سی صورت لڑھکتے، پھسلتے اور اس کے گالوں کو بھگوتے ہوئے آنسو......وھوالسیمع البصیر۔

☆......☆......☆

ہسپتال کا کمرا تھا اور وہ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ اس کی شکل دیکھ کر ہی لگتا تھا کہ حواس تو کب کے رخصت ہو چکے۔ اردگرد لوگوں کی آوازیں تھیں لیکن وہ آوازیں، آوازیں نہیں محسوس ہوتی تھیں۔ یوں جیسے ہزاروں مکھیوں کی بھنبھناہٹ ہو......اور یہ واحد چیز تھی جو وہ محسوس کر رہی تھی۔

ابو کا شوگر لیول ہائی ہو گیا تھا اور جب مزنہ نے اسے کال کی تو وہ اسکول میں تھی۔ اسکول سے ہی اس نے جہانگیر کو کال کی تھی اور جب وہ پہنچی تو سمجھ نہیں آتا تھا کہ کسے سنبھالے، ابو کو یا مزنہ کو۔ اس کے آنے تک جہانگیر، احمد صاحب کو ہسپتال لے آیا تھا اور اب وہ تھی اور ہزاروں مکھیوں کی بھنبھناہٹ۔

''خولہ، خولہ!'' بھنبھناہٹ واضح ہوئی۔ آواز میں ڈھلی اور سماعتوں میں یوں اتری جیسے ہزاروں میل کی دوری سے کسی نے پکارا تھا۔

''خولہ!'' وہ کندھا ہلائے جانے پر چونکی تھی۔ وہ جہانگیر تھا۔

''ماموں اب بہتر ہیں، تم مل سکتی ہو۔'' وہ نرمی سے کہہ رہا تھا۔

وہ چند لمحے اس کے چہرے کو دیکھتی رہی، یوں جیسے اس کے منہ سے ادا ہونے والے الفاظ کو سمجھنا چاہ رہی ہو اور پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا تھا۔ جہانگیر نے تسلی بھرے انداز میں ہلکے سے اس کے کندھے کو تھپکا تھا۔ وہ اب مزنہ اور فرخندہ کی جانب مڑ گیا تھا۔ مزنہ کو فرخندہ نے بازوؤں میں لے رکھا تھا اور وہ ان کے کندھے پر سر ٹکائے روئے جا رہی تھی۔

http://kitaabghar.com

''امی! آپ ماموں کو دیکھ لیں۔'' جہانگیر نے ماں کو مخاطب کیا۔

''میں؟''

''نہیں۔'' فرخندہ کو کہنے پر مزنہ چونک اٹھی لیکن جہانگیر نے فوراً روکا تھا۔

''پہلے رونا بند کرو، منہ صاف کرو اور خود کو سنبھالو پھر جانا ماموں سے ملنے، اتنے میں امی دیکھ کر آتی ہیں اور امی! آپ نے بھی کوئی سین کری ایٹ نہیں کرنا۔'' سختی سے مزنہ سے کہتے کہتے وہ ایک دم ماں کی طرف منہ کر کے بولا تھا۔ فرخندہ سر ہلا کر اٹھی تھیں۔

''جہانگیر بھائی پلیز!'' مزنہ نے بیچارگی سے کہا اور اسے آرام سے دوبارہ سیٹ پر بٹھانے کے لیے جہانگیر کی نظریں ہی کافی تھیں۔

''جب تک تم رونا بند نہیں کرو گی، اندر نہیں جاؤ گی۔'' اس نے سختی سے تنبیہہ کی اور مزنہ اور رونے لگی تھی۔ جہانگیر کے چہرے پر یک دم ''اف'' والے تاثرات ابھرے تھے لیکن اب کی بار وہ خاموش ہی رہا تھا۔

☆......☆......☆

''مزنہ! ابو میڈیسن لے رہے تھے؟'' چائے کی پیالی پکڑاتی مزنہ سے اس نے پوچھا تھا۔

''ہاں، دوا تو باقاعدگی سے لیتے ہیں، آپ کو معلوم تو ہے۔'' وہ جہانگیر کو بھی چائے دیتے ہوئے بولی اور پھر اپنا کپ لے کر وہیں بیٹھ گئی تھی۔ احمد صاحب گھر آ چکے تھے اور اب وہ سب ذرا حالت سکون میں تھے۔

''تو کیا کوئی بد پرہیزی کی تھی؟'' خولہ نے دوبارہ سوال کیا۔ مزنہ نے سر نفی میں ہلا کر جواب دیا تھا۔

''جب وہ دوا بھی لے رہے تھے، احتیاط بھی ابو بہت کرتے ہیں، واک بھی کرتے ہیں تو پھر شوگر لیول ایک دم انتہائی کیسے ہو گیا۔ کیسے؟'' خولہ سخت پریشان تھی۔

جہانگیر نے ایک گہری سانس بھر کر پیالی سامنے ٹیبل پر رکھی اور خولہ کے پریشان چہرے کو دیکھا۔

''ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ اسٹریس ہے، کسی بات کی پریشانی ہے۔'' اس نے بتایا تھا۔ خولہ نے بے اختیار لاشعوری طور پر مزنہ کو دیکھا، مزنہ نے یک دم ہونٹ بھینچے تھے اور جہانگیر مزید کہہ رہا تھا۔

''کوئی بات ہے خولہ؟ ایسی کون سی پریشانی ہے ماموں کو؟'' اس کے یوں پوچھنے پر مزنہ کا ردعمل فوری تھا۔ وہ اٹھ کر وہاں سے چلی گئی تھی۔ جہانگیر نے حیرت سے اسے جاتے دیکھا اور پھر سوالیہ نظروں سے خولہ کو۔ خولہ نے بے ساختہ پیشانی مسلی تھی۔

''ابو، مزنہ کی وجہ سے بہت پریشان ہیں جہانگیر۔''

''مزنہ کی وجہ سے؟'' اس کی حیرت اور بڑھی۔ خولہ نے ہلکے سے اثبات میں سر ہلایا اور اسے بتانے لگی تھی۔

''ٹھیک ہے پریشانی والی بات ہے لیکن اب یوں سر پر سوار کر لی جائے۔'' بات ادھوری چھوڑ کر اس نے نفی میں سر ہلایا۔

http://kitaabghar.com

''پہلے یہ بات میرے ذہن میں نہیں تھی جہانگیر لیکن آج میں بار بار یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی ہوں کہ مزنہ کے بعد ابو کا کیا ہوگا؟ اتنے بڑے گھر میں اکیلے کیسے وہ رہ پائیں گے۔''

''خیر، یہ بعد کی بات ہے، فی الحال تو اہم مسئلہ مزنہ کی شادی ہے، دوسرا مسئلہ اتنا بڑا نہیں کہ اس کا حل نہ تلاش کیا جا سکے۔''

جہانگیر کے یوں کہنے پر خولہ نے ذرا حیران ہوکر اسے دیکھا تھا۔

''پھر بھی جہانگیر مسئلہ تو ہے ناں۔''

''مجھے باہر جاکر پڑھنا ہے خولہ، جرمنی جاؤں گا ایک دو سال تک...... مجھے وہاں جانا ہی ہے تو تب امی اور تم ماموں کے پاس آ جانا، تب تک مزنہ کی شادی ہوگئی تو ویل اینڈ گڈ۔ نہ بھی ہوئی تو ایک دن ہونی تو ہے ہی۔ وقتی طور پر یہ مسئلہ حل ہو جائے گا پھر بعد میں دیکھ لیں گے کہ کیا کرنا ہے۔'' وہ کہہ رہا تھا اور وہ منہ پر ہاتھ رکھے اسے سن رہی تھی۔

''تم نے کبھی ذکر نہیں کیا جہانگیر؟''

''میرا خیال تھا کہ میرے پاس اتنی رقم جمع نہ ہو سکے گی سو یہ سال بھی ضائع ہی جائے گا۔''

''تو اب؟ اب کہاں سے؟''

وہ خولہ کے سوال پر یوں مسکرایا جیسے کسی بچے کی بات پر مسکرایا جاتا ہے۔ جواب اسی مسکراہٹ میں تھا۔ خولہ کی سیلری کہاں استعمال ہوتی تھی؟ کہیں پر بھی نہیں۔ چند لمحوں کے لیے وہ خاموش سی ہوگئی تھی۔ احساس کچھ اچھا نہیں تھا۔

''اور جاب؟ اس کا کیا؟''

''ظاہر ہے چھوڑ دوں گا۔''

''جہانگیر یہ رسک ہے۔'' وہ فوراً بولی تھی۔

''رسک تو ہے لیکن جب واپس آؤں گا تو اس سے بھی اچھی جاب مل جائے گی۔''

''اور وہاں جرمنی میں کیسے گزارہ کرو گے؟''

''ظاہر ہے پارٹ ٹائم جابز اور کیا؟'' اس نے کندھے اچکا کر جواب دیا تھا۔

''بس تمہیں پیچھے مینیج کرنا ہوگا، میں تمہیں پریشان نہیں کروں گا اور کوشش کروں گا کہ کچھ نہ کچھ تمہیں بھی بھجوا دیا کروں لیکن اسٹارٹ میں یہ مشکل ہوگا، ہاں جب سیٹل ہو جاؤں گا پھر اور بات ہوگی۔ اور جب......''

''جہانگیر! مجھ سے ایک ڈیل کرو گے؟'' یکدم خولہ نے عجیب مسکراہٹ سے اس کے رواں لہجے کو کاٹا تھا۔ اس نے نا سمجھی سے خولہ کو دیکھا۔

http://kitaabghar.com

''ٹھیک ہے میں تمہیں کامیاب بنانے کے لیے تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں، ایسی محنت کرنے کے لیے بھی تیار ہوں جو کہ میری ہڈیوں تک کو بھی گھسا دے لیکن......میں لائف ٹائم جاب نہیں کروں گی، جب تم پاکستان آ ؤ گے، اچھی پوسٹ پہ ہو گے تو تب میں جاب نہیں کروں گی۔''

جہانگیر کچھ دیر تک تو اس کی شکل دیکھتا رہا۔

''تمہیں، کیوں اتنی چڑ ہے جاب کرنے سے؟'' وہ حقیقتاً حیران تھا۔

''میری بات مکمل نہیں ہوئی جہانگیر۔'' اور وہ چونکا۔ چونکایا اسے خولہ کے لہجے نے تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔

''مجھے فیملی چاہیے جہانگیر!'' اور پھر سر اٹھا کر وہ نم مگر اٹل لہجے میں بولی تھی۔

☆......☆......☆

مس مفتی اس کا بھیانک ترین خواب بن چکی تھیں۔ اس دن کے بعد سے کیا ہوا؟ کیا اس میں جناتی تبدیلیاں آ گئیں؟ کیا راتوں رات اس نے وہ ''عقل کل'' وہ مہارت حاصل کر لی تھی کہ جس کی بنا پر وہ چار دن میں نہ صرف اپنی تمام تر غلطیوں پر قابو پا لیتی بلکہ مس مفتی کی good book میں بھی شامل ہو جاتی۔

اس بیماری کو تو کوئی گیدڑ سنگھی بھی دستیاب نہیں ہو سکی تھی کہ اگلے دن ہی مس مفتی کو سپر ٹیچر بن کر دکھا سکتی۔ انسان اپنے دماغ کی زرخیزی کے مطابق ہی سیکھ پاتا ہے۔ بالکل اسی طرح سے کہ جس طرح برتن صرف اپنی گنجائش کے مطابق ہی بھرا جا سکتا ہے لیکن کچھ لوگ محنت، ان تھک کوشش۔ ''never give up'' کے اصول پہ چلتے ہوئے try try again کا کلیہ آزماتے ہوئے اور یہ ایمان رکھتے ہوئے کہ ''نہیں ہے انسان کے لیے مگر جتنی وہ کوشش کرے'' کام کرتے ہیں۔ اور ایسے لوگ اگر غیر معمولی ثابت نہ بھی ہو سکیں تو وہ ناکام ہرگز نہیں ہو سکتے۔ اور نہ ہی ہوتے ہیں۔ کامیابی ان کا مقدر ٹھہرتی ہے۔

خولہ کا شمار گو کہ ایسے لوگوں میں نہیں ہوتا تھا۔ وہ بہت جلد تھک جانے والوں میں سے تھی، ہار مان کر ڈھے جانے والوں میں سے تھی۔ اس میں professionalism نہیں تھی۔ کیونکہ وہ professional تھی ہی نہیں، اس کی ٹائپ ہی یہ نہیں تھی لیکن......ہوا کیا۔ کس چیز نے اسے اتنا مجبور کر دیا تھا کہ وہ ان تھک محنت کرنے والی کہلائی جائے، کس چیز نے اس کے اندر اتنی ہمت اور حوصلہ بھر دیا تھا کہ وہ اپنی ہڈیاں تک گھس دینے پر تیار ہو گئی تھی۔ کون سی ایسی گھٹی تھی کہ جس کو چکھ لینے کے بعد وہ اپنے اندر ایسی طاقت موجود پاتی تھی اور جواب بس ایک ہی۔ جہانگیر نے اس سے ڈیل کر لی تھی تو اسے جہانگیر کے فیوچر کے لیے مرنا تھا اور جہانگیر نے بدلے میں اسے زندگی سے گلے ملوانے کا عہد کر لیا تھا۔

اس نے اس دن کے بعد بھی مس مفتی سے بہت سخت قسم کی جھاڑیں کھائی تھیں، بے عزتی برداشت کی تھی، طعنے سہے تھے اور طنز کو

جام سمجھ کر پیا تھا لیکن......لیکن ہمت نہ ہاری تھی۔ وہ یوں بن گئی جیسے کان نہ رکھتی ہو۔ ایسی ہوگئی جیسے احساسات کہیں گروی رکھ کر آئی ہو۔ وہ سپاٹ سے چہرے کے ساتھ بے عزتی سہتی، طعنے کھاتی اور طنز کو پیتی تھی۔ حتیٰ کہ مس مفتی اس سے بے حد چڑنے لگی تھیں۔ یہاں تک کہ وہ اسے it's your last chance تک بھی کہہ چکی تھیں اور خولہ......وہ اندر تک دہل کر رہ گئی تھی۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے، نہیں، بالکل بھی نہیں۔ اسے تو ابھی زندگی سے خوشیاں چھیننی تھیں، اسے ہنسنا تھا، بے فکری کے خوب صورت پل بتانے تھے، اسے دیکھنا تھا کہ زندگی خوب صورت ہے۔ اسے جیتنا تھا۔ اسے یوں ہی مرنا نہیں تھا۔ اسے اپنی فیملی چاہیے تھی۔ اسے ایک فیملی لائف گزارنی تھی اور مس مفتی کہتی تھیں۔

"it's your last chance" مگر......کیسے......کیسے؟ نہیں، یہ لاسٹ چانس نہیں ہوسکتا تھا اور اگر تھا بھی تو وہ اسے ضرور آزمائے گی۔ ضرور۔ اور پھر اس دن بات اتنی بڑی نہ تھی لیکن پے در پے سرزد ہونے والی غلطیوں اور کچھ مس مفتی کی نظر میں آجانے کی وجہ سے وہ بڑی بن گئی تھی۔

"مجھے سمجھ نہیں آتا کہ آپ کے دماغ میں کیا ہے؟ کیا بھوسا؟ کسی بچے کو بھی چار دن سمجھاؤ تو پانچویں دن اس کی عقل میں بات سما جاتی ہے۔ دو دن A لکھنا سکھاؤ تو تیسرے دن وہ A لکھنا سیکھ ہی لیتا ہے مگر آپ......آپ......مسز جہانگیر it's enough now" مس مفتی کا چہرہ سرخ تھا اور وہ سخت بیزار نظر آرہی تھیں۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ امتحان ہونے والے تھے اور پرنسپل صاحبہ نے سب ٹیچرز کو ٹائم فریم دے رکھا تھا کہ اپنا کورس مقررہ مدت میں مکمل کرلیں۔ خولہ سے یہ نہیں ہوسکا تھا اور اس نے میٹنگ میں کہہ دیا کہ کورس مکمل ہے۔ خولہ نہیں جانتی تھی کہ بات چھپی نہیں رہنی تھی۔ ایک بچے کی ماں شکایت لے کر آگئی تھیں کہ "جو چیز آپ نے پڑھائی ہی نہیں......وہ کورس میں کیوں شامل کردی گئی۔"

اور بس......خولہ کو خاموشی سے ہی سننا تھا اور وہ سن رہی تھی۔ اور جب وہ بول بول کر تھک گئیں تو......تو کچھ دیر بعد بس یہ ہی جملہ ادا ہوا۔

"it was your last chance Mrs. Khola!" وہ جب دوبارہ بولیں تو آواز مدھم مگر سخت ہی تھی۔

"تو آپ مجھے فائر کررہی ہیں؟" جھکے سر کے ساتھ کمزور لہجے میں کیے جانے والے اس سوال پر مس مفتی نے بے ساختہ ماتھا رگڑا تھا۔

"میں نے کبھی کسی ٹیچر کے ساتھ ایسا نہیں کیا لیکن......"

اور اس لیکن کے بعد پھر سے خاموشی تھی۔

"کیا میں ایک اور چانس لے سکتی ہوں میڈم؟ صرف ایک اور......پلیز۔" اس کا سر جھکا ہی تھا مگر اب کہ آواز بھاری سی تھی۔ وہ جہانگیر کو کیا کہے گی؟ کیسے سامنا کرے گی۔ اور وہ، وہ کیسے ری ایکٹ کرے گا؟ اس سوچ نے ہی اس کے رونگٹے کھڑے کردیئے تھے۔ اور اسی چیز نے اسے سوال نما درخواست کرنے پر مجبور کیا تھا۔ مس مفتی چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتی رہیں۔ گو کہ وہ سخت مزاج تھیں لیکن بہت سے

http://kitaabghar.com fb.com/sehar.sajid.official kitaabghar.com

پرائیوٹ اسکولز کی منتظم اعلیٰ کی طرح ظالم ہرگز نہیں تھیں۔

"only for this time... Mrs Khola...! only for this time... mark my words."

اور پھر انہوں نے کہا تھا۔ بے حد سخت اور اکھڑے انداز میں۔ خولہ فوری ردعمل ظاہر نہیں کر سکی تھی۔ وہ یوں ہی سر جھکائے چند لمحوں کے لیے ٹھس ہو کر بیٹھی رہی اور پھر۔

''جزاک اللہ۔'' اس نے thank you نہیں بولا تھا کہ یہ اسے ''کم'' لگتا تھا۔ مس مفتی نے انجانے میں اس کی مدد کی تھی لیکن خولہ تو جانتی تھی ناں......اور اس دعا سے بہترین چیز اس کے پاس فی الوقت نہیں تھی۔ بالکل بھی نہیں۔

☆......☆......☆

دوماہ بعد:

''مسز جہانگیر!'' آواز سن کر وہ یوں ہو گئی تھی کہ جیسے پکار کسی انسان کی طرف سے نہیں، ملک الموت کی طرف سے آئی تھی۔ بے اختیار اس نے اپنے یک دم خشک پڑنے والے حلق کو تر کرنا چاہا تھا اور بدقسمتی سے وہ ناکام رہی تھی۔

''السلام علیکم!'' مس مفتی کے قریب آنے پر اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے سلام کیا۔ پھنسی ہوئی آواز میں۔ انہوں نے سر کے اشارے سے جواب دیا اور بولیں۔

''میرے آفس میں آئیں مسز جہانگیر۔'' اور بس، خولہ کی باقی ماندہ ہمت بھی دھڑام سے زمین بوس ہو گئی تھی۔

''جی۔'' اب تو آواز یوں محسوس ہوئی جیسے کسی کنویں سے آئی ہو، وہ چند لمحے ہارے ہوئے انداز میں وہیں کھڑی رہی اور پھر بے حد تھکے تھکے سے انداز میں اس کی پیروی کی تھی اور ان کے آفس پہنچنے تک وہ رونے والی ہو گئی تھی۔

''ناٹ اگین......ناٹ اگین۔'' مسلسل سر ہلاتے ہوئے وہ بڑبڑا رہی تھی۔ تو ایک بار پھر سے......ایک بار پھر سے وہ ناکام رہی تھی۔ اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ نہیں کر سکتی تھی۔ چند منٹ کے وقفے سے وہ ان کے آفس پہنچی تھی۔

اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ کتنی ہی بار، کتنی مرتبہ وہ یوں ان کے سامنے اسی کرسی پر بے عزت ہونے کے لیے بیٹھی تھی۔ تو کیا اب کی بار بھی؟ تو کیا وہ دن کبھی آنا ہی نہیں تھا کہ جب وہ...... یہاں ان کے سامنے سر جھکا کر نہیں۔ سر اٹھا کر بیٹھتی۔ تو کیا اس نے آخری چانس، آخری موقع بھی گنوا دیا؟

مس مفتی چند لمحے اس کے رنگ بدلتے چہرے کو دیکھتی رہیں اور پھر انہوں نے بے ساختہ اپنے تاثرات کنٹرول کیے تھے، ہاتھ بڑھا کر انہوں نے چار پانچ کاپیوں کا ایک بنڈل اٹھایا۔ خولہ نے ان کاپیوں کو دیکھا اور صحیح معنوں میں اسے دھچکا لگا تھا، تو کیا بس اتنی سی کاپیز وہ صحیح طور سے بنا کوئی غلطی کیے چیک کر پائی تھی؟

''بس چار پانچ؟''

''یہ آپ کی ری چیک کی گئی کاپیز ہیں مسز خولہ۔''اورخولہ نے سانس روک کران کی بات کو سنا تھا۔

''اور مجھے یہ کہتے ہوئے بے حد۔''

''افسوس ہورہا ہے......''خولہ نے جملہ اچک کردل میں مکمل کیا۔

''خوشی محسوس ہورہی ہے۔''مس مفتی نے کہا اورخولہ نے یک دم جھٹکے سے سراٹھا کراُن کا چہرہ دیکھا۔

''آپ نے اب کی بار واقعی امپروو کیا ہے۔''وہ مسکرارہی تھیں۔خولہ کا منہ بے ساختہ کھلا تھا۔وہ حیرانی سے ان چار، پانچ کا پیز کو دیکھ رہی تھی۔

''تو......تو یہ؟''اس نے کاپیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ وہ کاپیز ہیں جن میں آپ کی چیکنگ میں چند غلطیاں پائی گئی ہیں۔''وہ نرم لہجے میں ہی بولی تھیں۔خولہ ان کی بات کے دوران اپنی چیکنگ کی غلطیاں دیکھ رہی تھی۔

''مجھے امید ہے کہ آپ ان کاپیوں کی تعداد کو صفر تک لائیں گی۔''وہ اب کہنیاں ٹیبل پر رکھے شگفتگی سے کہہ رہی تھیں۔

''میں پوری کوشش کروں گی مس مفتی! پوری کوشش کہ آپ کو اپنا ہنڈرڈ پرسنٹ دے سکوں۔''عزم نے نئے سرے سے انگڑائی لی تھی۔

''مسز جہانگیر! ٹیچر by birth ہوتا ہے بالکل اسی طرح سے کہ جس طرح سے آرٹسٹ by birth ہوتا ہے۔سب میں معلم بننے کی طاقت ہوتی ہے نہ صلاحیت۔اور ہر کوئی اس قابل بھی نہیں ہوتا کہ وہ اشیا کے تصور کو ذہنوں میں اسی طرح اتار سکے کہ جس طرح وہ تصور حقیقت میں موجود ہے۔ایسے لوگ یقیناً بہت کم ہوتے ہیں۔آپ by birth ٹیچر نہیں ہیں لیکن آپ محنتی ہیں، ہمت نہیں ہاری آپ نے......مجھے آپ پر جتنا بھی غصہ سہی لیکن میں کبھی آپ کو فائر نہیں کرنے والی تھی۔''

اتنی سی بات کہہ کر وہ مسکرائی اور جب مسکرائیں تو ان کی آنکھوں میں شرارت سی ابھری تھی۔خولہ زبردست طریقے سے حیران ہوئی۔اس کا منہ کھلا لیکن کچھ کہہ نہ پائی۔یہ tactics تھا کام لینے کا۔خولہ سر جھٹک کر ہنس دی تھی۔

''میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی۔کبھی نہیں ان شاءاللہ۔''وہ مسکراتے ہوئے بولی تھی اور مس مفتی نے مسکراتے ہوئے ہی سر ہلا کر جواب دیا تھا۔اس دن وہ گھر بے حد طمانیت کے ساتھ لوٹی تھی تو اس نے کر دکھایا تھا۔ہاں کر تو دکھایا تھا مگر۔

☆......☆......☆

http://kitaabghar.com

ہم کو لازم ہے

درد کو زباں دینا

اور درد

پھٹ پڑے حرف کی صورت

اور حرف، گریۂ زخم کی صورت

جسم کے پنوں پر

نمودار ہوتے تو بتاتے

کہ.......!

درد آخر کیسا ہے؟

کہ درد آخر کیسا؟

اسے اسکول میں بھی کامیاب ہونا تھا اور گھر کو بھی خوش اسلوبی سے چلانا تھا اور مصیبت یہ کہ اس میں یہ طاقت نہ تھی اور جب اس نے یہ صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کی تو......نتیجہ سخت مشقت، ان تھک محنت، بے آرام دن اور بے چین نیند بھری راتیں۔ اس کی نیند کا دورانیہ بھی کم ہو چکا تھا۔ آنکھوں کے نیچے حلقے سے نظر آنے لگے تھے کہ جن کو چھپانے کے واسطے اسے پارلر کے چکر کاٹنے پڑتے تھے۔ اور اس کوشش نے، اس روٹین نے اسے خالی کر دیا۔ بے حس بنا دیا۔ آسان لفظوں میں اسے مشین بنا دیا تھا۔ روٹین روبوٹک ہو چکی تھی۔ دن چڑھتا، رات آتی اور پھر سے اگلا دن منہ پھاڑے آن کھڑا ہوتا۔ ایک اور تھکان بھرا دن۔ وہ کئی کئی روز ابو کی طرف جا نہیں پاتی تھی۔ مزنہ سے اس کی کالز کا دورانیہ چند منٹس پہ آ چکا تھا۔ ویک اینڈ زپہ کاموں کا پہاڑ اس کا منتظر ہوتا کہ آؤ اور مجھے سر کر لو۔ جہانگیر اور اس کی زندگی دو مختلف سمتوں میں بھاگنے لگی تھی۔

”leisure“ کہاں تھا؟ کہیں بھی نہیں......درحقیقت زندگی ہی کہیں نہیں تھی۔ بس ایک بھاگ دوڑ کی سی کیفیت تھی۔ وہ مسکرانا بھول گئی۔ رشتوں کے تعلق میں جو لطف ہوتا ہے وہ، وہ لطف بھول گئی تھی۔ بعض اوقات مزنہ یا ابو کا فون آتا تو اس کی نظریں گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ حرکت کرتی رہتیں۔ ذہن میں ”ابھی یہ کرنا ہے، وہ کرنا ہے۔“ یہ ہی چکراتا رہتا تھا اور نتیجہ......وہ ہوں ہاں سے زیادہ بات نہ کر پاتی تھی۔

کبھی کبھی تو اپنے لیے ایک کپ چائے بنانے کی عیاشی بھی میسر نہ پاتی تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ اسمارٹ ہو گئی تھی۔ پارلر کے چکروں نے اس کے حلقے چھپا لیے تھے اور اسے اپ ٹو ڈیٹ بھی کر دیا تھا۔ وہ اب طرح دار دکھتی تھی۔ جہانگیر کی وارڈروب بھی اچھے طریقے

http://kitaabghar.com

سے استری شدہ کپڑوں سے بھری رہتی۔ ہاتھ کا ذائقہ بھی لوٹ آیا تھا۔ گھر بھی چمکنے لگا تھا اور اسے مسکرا مسکرا کر بات کرنا بھی آ گیا تھا۔ دراصل اسے سب کرنا آ گیا تھا بس خود کی ذات کہیں مر گئی تھی، کھو گئی تھی یا پھر شاید دفن ہو گئی تھی۔ اس نے سمجھوتے کی پٹی آنکھوں پر باندھ کر چلنا سیکھ لیا تھا۔ اسے اب رونا نہیں آتا تھا بلکہ رونے کا وقت ہی کہاں تھا اب اس کے پاس۔ کچھ محسوس نہ ہوتا تھا کہ محسوس کرنے کے لیے بھی کچھ فارغ وقت چاہیے۔ جہانگیر کو ٹیکل کرنا بھی وہ سیکھ گئی تھی۔

جس دن گھر میں اچھا کھانا نہ بنتا، وہ بازار سے ہی کچھ منگوا لیتی۔ اسے غصہ آتا یہ چپ کر کے سن لیتی، وہ خود ہی بول بول کر عاجز آ جاتا اور جب عاجز آ جاتا تو خولہ ایک مسکراہٹ چہرے پر سجا کر اسے یوں دیکھتی جیسے کسی بچے کو اس کی نادان حرکت پہ دیکھا جاتا اور سب سے حیرت کی بات۔ اسے سب کچھ طریقے سے سنبھالنا آ گیا تھا۔ جاب بھی اور گھر بھی...... لیکن یہ کہ خولہ احمد، کہیں نہ رہی تھی۔ وہ مسز جہانگیر تھی۔ ماڈ، طرح دار، بات کرنے کے فن سے آشنا اور مسئلے حل کر لینے کی صلاحیت سے مالا مال، وہ اب مسز جہانگیر سے زیادہ اور کچھ نہ تھی۔

☆......☆......☆

ہر چند سہارا ہے تیرے پیار کا دل کو
رہتا ہے مگر اک عجب خوف سا دل کو

معلوم نہیں کس موڈ میں اس نے سیل فون پر یہ غزل پلے کر رکھی تھی۔ سیل فون منڈیر پر دھرا تھا اور اس کے پاس ہی چائے کا خالی مگ...... اور وہ...... دور افق پار کچھ ڈھونڈنے میں مصروف تھی۔ غائب دماغی کی سی کیفیت تھی۔ مغنیہ کے ادا ہونے والے الفاظ بھی سماعتوں میں ڈھل کر ذہن میں آ کر الجھ سے جاتے تھے اور پھر ایک بگڑی ہوئی شکل بن کر تصور میں ابھرتے تھے۔ وہ کچھ سوچنا چاہتی تھی مگر سوچ نہیں پا رہی تھی۔ عجب سی ہی کیفیت تھی۔ سمجھ میں آتی تھی نہ پکڑ میں......

''ہر چند'' مغنیہ ایک بار پھر مصرعہ دہرانے لگی تھی کہ یک دم آواز آنا بند ہو گئی۔ اس نے بے ساختہ گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ جہانگیر تھا۔ ایک گہری سانس بھر کر خولہ نے چہرہ سیدھا کیا تھا۔ آج فراغت اضافی سرکاری چھٹی کی وجہ سے نصیب ہوئی تھی۔

''کیا سڑی ہوئی غزلیں سنتی رہتی ہو تم بھی؟''

اس بات پہ اس نے جہانگیر کو دیکھا اور دیکھتی رہی اور پھر ایک بے اختیار سی طنزیہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر نمودار ہوئی۔

''ہونہہ......'' جیسے تاثرات ابھرے، مگر اس نے کہا کچھ نہیں۔

''کچھ کام تھا؟'' وہ یوں بولی جیسے اسے یوں جہانگیر کا مخل ہونا پسند نہیں آیا تھا۔

''نہیں کچھ خاص نہیں۔ بور ہو رہا تھا تو سوچا تمہیں دیکھوں کیا کر رہی ہو؟'' اس کی بات کے دوران وہ سر جھکائے کھڑی منڈیر کا کنارہ کھرچتی رہی۔ اتنا بھی احساس نہیں ہوا کہ جہانگیر بات ختم کر چکا ہے اور وہ بات ختم کر کے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اسے دیکھ رہا

تھا۔ چند لمحوں بعد جب اسے غیر معمولی سا احساس ہوا تو اس کے ہاتھ کی حرکت یک دم رکی تھی۔ جہانگیر کچھ کہہ رہا تھا شاید۔ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ بس خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ خولہ کو سمجھ نہ آیا کہ اب کیا کہے۔'' اس نے بے ساختہ نظریں جھکائی تھیں۔

''تم بہت بدل گئی ہو خولہ۔'' بہت دیر بعد وہ بولا تھا۔

''اچھا تو......'' عجب بگڑا سا انداز تھا۔

''خاموش......مگر خوبصورت۔'' اس کے انداز پر مسکراتے ہوئے وہ بولا تھا۔ خولہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے پر مجبور ہوئی تھی۔ وہاں نرمی تھی، حلاوت تھی، جذبات تھے۔، وہ چند لمحے اسی طرح اسے دیکھتی رہی اور پھر ایک تکلیف کی لہر نے اس کے کندھوں کو اچانک ہی جکڑ لیا تھا۔

اس نرمی......اس حلاوت کو ختم ہوتے ایک سیکنڈ بھی نہ لگتا اگر وہ آج جاب چھوڑ دیتی، اس کی مرضی کے خلاف اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا سوچ لیتی۔ تو تب۔ تب بھی کیا یہ آنکھیں یوں ہی نرمی کا تاثر برساتی رہتیں۔ جواب بے حد واضح تھا۔ اور اذیت یک دم ہی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

جہانگیر کچھ اور بھی کہہ رہا تھا اب......لیکن ایک بار پھر سے وہ منڈیر کا کنارہ کھرچتی۔ اور سماعتوں کو بہرہ پاتی تھی۔

☆......☆......☆

''آپ مزنہ کی بہن ہیں؟'' وہ چائے کی پیالی میز پر رکھ رہی تھی، اس سوال پر چونکی اور سیدھا ہو کر حیرت سے اس نے سوال کرنے والی کو دیکھا۔

''جی! مگر آپ......؟''

''میں اور مزنہ کلاس فیلو رہے ہیں، اس لیے آپ کو دیکھا تو ایک دم پہچان لیا۔'' اس کی بات کو کاٹ کر اس لڑکی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔ وہ مزنہ کا پروپوزل دیکھنے آئے تھے اور وہ لڑکے کی چھوٹی بہن مہ جبین تھی۔

''اچھا، اچھا،'' خولہ نے خوش دلی سے کہا۔

''کالج میں تھیں آپ اس کے ساتھ؟''

''جی۔ اتنی دوستی تو نہیں تھی لیکن مزنہ اپنی آنکھوں کی وجہ سے پوری کلاس میں مشہور تھی۔'' مہ جبیں اب کہہ رہی تھی۔ اس کے یوں کہنے پر وہ ہنس دی تھی۔

''ہاں مزنہ کی آنکھیں بے حد خوبصورت ہیں۔'' خولہ نے اعتراف کیا تھا۔

''اسی لیے تو میں نے آپ کو پہچانا۔'' اس کی بات پر خولہ نے ہلکا سا سر ہلا کر جواب دیا تھا۔

''میں بھائی کی تصویر لا کر دکھاتی ہوں آپ کو۔'' کچھ جوش سے کہہ کر وہ اٹھ کر چلی گئی تھی۔ وہ جس کا پرپوزل دیکھنے آئے تھے۔ وہ بذاتِ خود جرمنی میں سیٹل تھا، باقی سب تو اچھا ہی دکھ رہا تھا اب اگر وہ خود موجود ہوتا تو زیادہ اچھا رہتا۔ ابو کے چہرے سے بھی اسے یہی محسوس ہوا تھا کہ انہیں فیملی پسند آئی تھی۔ لیکن لڑکا...... خیر وہ...... مہ جبیں کی امی سے باتوں میں مشغول تھی کہ مہ جبیں بھائی کی تصویر لے کر آ گئی تھی۔ اس نے تصویر خولہ کی طرف بڑھائی تھی اور خولہ نے دل میں یہ دعا مانگتے ہوئے کہ ''یا اللہ! اب لڑکا بھی فیملی کی طرح اچھا ہی ہو۔'' تصویر پکڑی تھی...... اور...... اور وہ بہت ہینڈسم نہ سہی تو نظر انداز کیے جانے والا بھی نہیں تھا۔

''ٹھیک تھا، عام مردوں جیسا'' خولہ نے اسے ناپسند نہیں کیا تھا۔ خود دیکھ کر اس نے تصویر ابو کی طرف بڑھا دی تھی۔

''آپ چاہیں تو بھائی کی ID آپ کو دے دیتی ہوں، آپ اسکائپ پر بات بھی کر لیجیے گا اور دیکھ بھی لیجیے گا۔'' مہ جبیں نے کہا تھا۔

خولہ نے بے ساختہ ابو کو دیکھا انہوں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا تھا۔

''میرے خیال میں یہ ہی مناسب رہے گا۔ آپ مجھے ID دے دیں، ہم بات کر لیں گے۔'' خولہ کے کہنے پر مہ جبیں نے اسے ID لکھ کر دی تھی اور پھر...... پھر وہ بے حد اچھے اور خوشگوار موڈ کے ساتھ ان کے ڈرائنگ روم سے نکلے تھے۔ طمانیت کا احساس حاوی تھا کہ چلو شکر ہے کہیں تو کچھ بات بنتی نظر آئی۔ مہ جبیں اور اس کی امی انہیں دروازے تک چھوڑنے آئی تھیں اور جیسے ہی وہ دروازے سے نکل کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھنے لگے تو خولہ کی نظر یکدم سامنے موجود گھر کے گیٹ کی طرف پڑی تھی۔ وہاں ایک گاڑی آ کر رکی تھی اور کسی کو اتار کر زن سے آگے بڑھ گئی تھی۔ اور جب گاڑی سے اترنے والے کا چہرہ واضح ہوا تو...... تو وہ مس مفتی تھیں۔

''اوئے......'' وہ بے ساختہ حیران ہوئی۔ ''مس مفتی۔''

جتنی حیران وہ ہوئی تھی اتنا ہی بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تھا۔ مس مفتی نے بھی اچنبھے سے مڑ کر دیکھا تھا۔

''مسز جہانگیر!'' اور پھر انہوں نے زیرِ لب دہرایا۔ خولہ مسکراتے ہوئے ان کی طرف بڑھی تھی۔ یہ محض اتفاق تھا۔

''آپ یہاں رہتی ہیں؟'' ہاتھ ملانے کے بعد اس نے پوچھا تھا۔

''میرا تو گھر ہے لیکن آپ یہاں کیا کر رہی ہیں مسز جہانگیر؟'' ان کے لہجے میں محسوس کی جانے والی خوشگواریت تھی۔

''میں......'' وہ ذرا سی رکی اور پھر ان کو یہاں آنے کا مقصد بتانے لگی۔

''اوہ...... اچھا! اب آئی ہیں تو چائے پیے بغیر تو میں جانے نہیں دوں گی۔'' مس مفتی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

''ارے نہیں نہیں مس مفتی، میرے ساتھ میرے ابو بھی ہیں اور ہمیں واپس بھی جانا ہے تو......''

''نہیں پھر کبھی نہیں بلکہ ابھی اور اسی وقت......'' انہوں نے جیسے اس کی اگلی کہی جانے والی بات بوجھ کر جواب دیا تھا۔

''مس مفتی......'' خولہ ذرا متامل تھی۔

وہ اسے یوں متامل دیکھ کر احمد صاحب کی طرف بڑھیں اور اگلے دو منٹ میں وہ انہیں اپنے ساتھ لے کر گھر کے اندر داخل ہو رہی تھیں۔آج اچھا دن تھا زندگی کا شاید یا پھر خوشگوار دن۔وہ۔مہ جبین کے گھر سے بھی بہت اچھے موڈ کے ساتھ نکلی تھی اور اب...... مس مفتی کے گھر...... وہ آدھا گھنٹا اس کے لیے بے حد خوشگوار رہا تھا۔وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مس مفتی اتنی ہنس مکھ ہوں گی۔بے اختیار اس نے سوچا کہ آج صبح اس نے کس کا منہ دیکھ لیا تھا جو دن اتنا اچھا گزر رہا تھا۔

''اپنا ہی دیکھا ہوگا اگر جہانگیر کا ہوتا تو دن ایسا تو ہرگز نہیں گزرتا۔''اور خود کے سوال کا خود ہی جواب دیتے ہوئے وہ اِک بار پھر سے ہنس پڑی تھی۔

''میں بھی ناں!''سر جھٹک کر زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے اس نے کہا اور مس مفتی کی طرف متوجہ ہوئی تھی جو اسے کسی قسم کے رولز کی ترکیب بتا رہی تھیں۔

❀ ❀

ناول **نار** ابھی جاری ہے۔اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **10** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

رنگارنگ کہانیوں سے سجا، خوبصورت اور دلکش

سوہنی ڈائجسٹ

SohniDigest.Com

اگر آپ بھی لکھ رہے ہیں اور اُردو قارئین کی تلاش میں ہیں تو اپنی کہانیاں Inpage میں کمپوز (ٹائپ) کر کے پورے اعتماد کے ساتھ سوہنی ڈائجسٹ میں بھیجئے۔نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

ابھی sohnidigest@gmai.com پر ای میل کریں۔

http://kitaabghar.com

قسط نمبر 3

"May I come in?" دروازے میں سے جھانکتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔میڈم فوکل گلاسز لگائے، سر جھکائے کچھ لکھنے میں مشغول تھیں۔ پوچھے جانے پہ سر اٹھایا۔اسے دیکھا اور پھر مسکرا کر سر کے اشارے سے جواب دیا تھا۔

"کیسی ہیں آپ؟" خولہ نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں مسز جہانگیر......آپ کیسی ہیں......؟" مصروف سے انداز میں جواب آیا تھا۔

"آپ بزی ہیں تو میں پھر آ جاؤں گی......" وہ اُن کی مصروفیت محسوس کرتے ہوئے بولی۔

"ارے نہیں......آپ کہیے......"

"میں آپ سے بہن کے پروپوزل کے سلسلے میں بات کرنے آئی تھی۔ اس دن بتایا تھا ناں میں نے آپ کو......"

"جی......بالکل آپ پوچھیے جو بھی آپ کو پوچھنا ہے۔" وہ اب کے پوری طرح سے اس کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

"ہمیں تو ان کی فیملی پسند آئی ہے۔ابو کی لڑکے سے اسکائپ پہ بھی بات ہوگئی ہے۔ میں بس تسلی کرنا چاہ رہی تھی کہ وہ لوگ کیسے ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ خاندانی، اچھی شریف فیملی ہے؟ آپ تو زیادہ بہتر جانتی ہوں گی۔" اور خولہ جب بات کر رہی تھی تو اس کے لہجے میں اِک ہچکچاہٹ تھی۔ یوں جیسے معلوم نہ ہو کہ سامنے موجود شخصیت کیا......ردعمل ظاہر کرے گی۔ اس کی بات سن کر مس مفتی نے فوکل گلاسز اتار کر ٹیبل پر رکھے اور دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں پھنسا کر کہنیاں میز پر رکھتے ہوئے اسے دیکھا۔

"مسز جہانگیر! فیملی تو واقعی ہی میں اچھی ہے۔ اب اگر آپ مجھ سے جبیں کے بھائی کی بابت استفسار کریں تو میں، کچھ کہہ نہیں سکتی۔ کیونکہ وہ کافی سالوں سے جرمنی میں سیٹل ہے۔اس لیے میں اس بات سے لاعلم ہوں کہ لڑکا کیسا ہے یا کیسا ثابت ہوگا۔ باقی فیملی بظاہر تو اچھی ہی ہے۔" سنجیدہ سے انداز میں انہوں نے بات مکمل کی تھی۔ خولہ کے چہرے پر یک دم اطمینان سا پھیلا تھا۔

"بہت شکریہ......مس مفتی......" اس نے مسکرا کر کہا تھا۔

"My pleasure!" انہوں نے بھی مسکرا کر ہی جواب دیا تھا۔

☆......☆......☆

چراغ دین کے لیے دین......کسی کتاب، کسی سنت کا نام نہیں تھا۔ چراغ دین کے لیے دین، صرف اور صرف مولوی اللہ رکھے کا

http://kitaabghar.com

نام تھا۔خود تو وہ فقط کلمہ پڑھنا جانتا تھا، وہ بھی غلط تلفظ کے ساتھ۔قصور تو شاید چراغ دین کا بھی نہیں تھا کہ ساری بات شعور کی تھی اور مصیبت یہ کہ یہاں پھر ''شعور'' کا نام بھی مولوی اللہ رکھا ہی تھا۔ چراغ دین کے گھر میں کوئی چیز بعد میں آتی تھی، مولوی اللہ رکھے کے ہاتھ کا لکھا تعویز پہلے۔بھینس مرگئی......خشک ہوگئی، نئی بھینس لی۔فصل کو کیڑا لگ گیا یا پھر چراغ دین کوز کام...... ہر کام کا ایک ہی جادوئی حل تھا اور وہ تھا کیا......جی ہاں......مولوی اللہ رکھا۔ چراغ دین اپنی عقل تو نہ رکھتا تھا۔وہ مولوی اللہ رکھے کی آنکھوں سے دیکھتا تھا،اس کے کانوں سے سنتا تھا اور جو منہ میں گوشت کا ایک لوتھڑا تھا وہ بھی وہ ہی کہتا تھا جو مولوی اللہ رکھا چاہتا تھا۔فصل کا ایک حصہ مولوی صاحب کو جاتا تھا۔ہر جمعرات کا کھانا دیسی مرغ، دیسی گھی میں ہی بھنا ہوا،بشمول زردے کی پلیٹ کے مولوی صاحب کے گھر چراغ دین بہ نفسِ نفیس خود پہنچا کر آتا۔مہینے میں ایک بار مولوی صاحب، چراغ دین کے گھر پھیرا ضرور لگاتے تھے...... بداثرات دور کرنے کے لیے اور اپنے لعابِ دہن والا پانی گھر کے کونوں میں چھڑکنے کے واسطے، یوں سمجھیے کہ چراغ دین کی آدھی کمائی اس کا گھرانا کھاتا اور باقی آدھی مولوی صاحب اور ابھی ختم درود کی داستان تو میں نے کہی ہی نہیں...... چراغ دین کا بس چلتا تو وہ مولوی اللہ رکھے کو سر پر اٹھا کر پھرتا اور قدم اٹھانے سے پہلے پوچھتا......

''اعلیٰ حضرت! پیر صاحب، پیر کھبّے رکھنا ہے یا سجّے......'' شعور ہپناٹائز ہو چکا تھا اور عقل گروی رکھ چھوڑی تھی اس نے......اس کے گھر کی برکتیں......رونقیں سب (نعوذ باللہ) مولوی جی کے دم سے تھیں......وہ نہ ہوتے تو چراغ کا بنتا کیا......اِک مولوی صاحب کی ذات تھی کہ جنہوں نے (نعوذ باللہ) اس کے گھر سے ہر قسم کی بلاؤں کو دور کر رکھا تھا۔ابھی سال بھر پہلے کی تو بات تھی کہ اس کا بیاہ ہوا تھا اور آج......آج وہ صاحب اولاد ہو چکا تھا۔جب کھیتوں پہ کام کرتے چراغ دین کو یہ خبر ملی تو وہ دوڑا دوڑا، بھاگا بھاگا گیا تھا۔بھلا کہاں؟ گھر؟ ارے نہیں......مولوی اللہ رکھے کے پاس...... بچے کو گھٹی دینی تھی اور اس کا نام بھی تو تجویز کرنا تھا مولوی صاحب نے فال نکال کر۔اور مولوی صاحب؛ ان کے لیے وہ دن بڑا بھاگوان ثابت ہوتا تھا کہ جب بھی گاؤں میں کسی بھی گھر میں ولادت ہوتی تھی۔وارے نیارے ہو جایا کرتے تھے۔ایسے میں جب چراغ دین انہیں بلانے آیا تو وہ کچے دھاگے سے ہی تو بندھے......لشتم پشتم چراغ دین کے ساتھ دوڑے آئے۔گھر پہنچنے کے بعد سب سے پہلے بچہ مولوی صاحب کی گود میں ڈالا گیا۔مولوی صاحب نہ جانے کتنی دیر زیرِ لب ورد کرتے رہے اور پھر بچے کے چاروں جانب پھونکیں مارتے رہے۔اتنی دیر میں بچہ بھوک سے بلکتا رہا مگر جب تک مولوی صاحب کا دم پورا نہیں ہونا تھا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ بچے کو کچھ پلایا جا سکے۔مولوی صاحب نے اپنا دم پورا کیا......پھر زور سے پھونک مار کر بچے کو آئندہ زندگی کی تمام تر بلاؤں سے محفوظ کیا اور پھر جلالی آواز میں کہا۔

''شہد لاؤ......'' شہد لایا گیا۔مولوی صاحب نے بچے کو شہد چٹایا...... پھر کان میں اذان دی اور چراغ دین کے حوالے کرتے ہوئے بولے۔

''بیٹا مبارک ہو چراغ دین!'' اور چراغ دین فرطِ مسرت اور فرطِ احترام سے جھک جھک جاتا تھا۔

''پیرومرشد......نام بھی بتا دیجیے کہ کون سا نام میری اولاد کے لیے ٹھیک رہے گا۔ بھاری نہیں پڑے گا۔''

''چراغ دین......'' مولوی صاحب کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔

''مسجد آنا......وہاں تمہیں بتائیں گے کہ کون سا نام صحیح رہے گا۔ حساب کتاب بھی تو لگانا ہے ناں ابھی......'' وہ اب اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہہ رہے تھے۔

''جی مولوی صاحب......جو حکم......جیسا آپ کہیں......'' اور چراغ دین کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ وہاں اپنا جسم رکھے کہ جہاں مولوی صاحب اپنا پیر رکھتے تھے......وہ مسجد تک گیا تھا، مولوی صاحب کو ان کے حجرے کے اندر تک چھوڑ کر آیا تھا۔ مع اس ساز وسامان کے اور کل جب وہ نام کا پوچھنے آتا تو تب بھی کون سا خالی ہاتھ آنا تھا تو جب کل آئی اور چراغ دین چیزوں اور نیاز کے اِک ڈھیر کے ساتھ مولوی صاحب کے حجرے میں پہنچا تو......مولوی صاحب نے کہا تھا۔

''تمہارے بیٹے پہ ''اح'' سے شروع ہونے والا نام موزوں رہے گا۔ دوسرا کوئی نام رکھو گے تو بیٹا یا تو بیمار رہے گا یا پھر ساری عمر پریشانیوں میں گھرا رہے گا۔'' اوراب چراغ دین کی کیا مجال کہ وہ کوئی اور نام رکھتا......اس نے اپنے بیٹے کا نام ''احمد مجتبیٰ'' رکھا تھا۔

☆......☆......☆

اس نے اِک لمبے عرصے کے بعد ابو کے چہرے پر اتنا سارا اطمینان دیکھا تھا۔ وہ ہنستے ہوئے نظر آئے تھے اور بے فکری کا رنگ ہنسی پر غالب تھا......اور معلوم نہیں کیوں اس نے خود بھی خود کو اتنے عرصے بعد اتنا پُرسکون محسوس کیا تھا۔ چند لمحے وہ ان کے مسکراتے چہرے کو دیکھتی رہی اور خود کے لیے سکون کشید کرتی رہی۔

''ابو آج مجھے سمجھ آیا کہ محبت ہمیشہ بے توازن ہی ہوتی ہے۔ جیسے آپ کی مزنہ کے لیے اور میری آپ کے لیے......توازن کا بھلا کیا کام محبت سے۔'' سر جھٹک کر اس نے سوچا اور مڑ گئی۔ مزنہ کی منگنی تھی جو ابو یوں اتنے پُرسکون نظر آئے تھے۔ جہانگیر کے ساتھ بھی ان کے تعلقات میں بہتری آئی تھی۔ اور یہ تب سے ہوا تھا کہ جب وہ بیمار پڑے تھے۔ خولہ مصروف سے انداز میں بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے کچن کی طرف گئی تھی کہ جہاں بہت سے کام اس کے منتظر تھے۔

☆......☆......☆

اس نے کامدار دوپٹا مزنہ کے سر پر ٹھیک کیا اور پھر اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ مزنہ نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا، خولہ مسکرا دی۔ اس نے ابو کی طرح مزنہ کو بھی اتنے ہی عرصے بعد یوں مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ ورنہ قریب تھا کہ وہ ڈیپ ڈپریشن کا شکار ہو جاتی۔

''خوش ہو؟'' اس کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ کر خولہ نے پوچھا۔

''خوشی کا معلوم نہیں......لیکن مطمئن ضرور ہوں۔'' نظریں اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے مزنہ نے جواب دیا تھا۔

وہ ایک بار پھر سے مسکرا دی تھی۔

''مہ جبین کے بھائی کا تو معلوم نہیں......لیکن مہ جبین ضرور تمہاری آنکھوں پر فدا ہے۔'' خولہ نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگاتے ہوئے اسے چھیڑا تھا۔

''لو بھلا......اس کا کیا فائدہ ہوا؟'' مزنہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔اور پھر ان دونوں کا قہقہہ گونجا تھا۔

''بندہ معقول لگتا ہے مزنہ......!'' خولہ نے اب کے سنجیدگی سے ہی کہا تھا۔

''مجھے کیا پتا؟ میں نے کون سا اس سے بات کی ہے؟'' مزنہ ابھی تک شرارت کے موڈ میں تھی۔خولہ نے اب کے ہنسی دبائی۔

''آج بڑی ہری ہری سوجھ رہی ہیں تمہیں؟'' مسکرا کر کہتے ہوئے اس نے ایک دھپ اس کے کندھے پر لگائی۔

''اب بھی نہ سوجھے آپی......'' چند لمحوں بعد مزنہ نے کہا تھا۔اس کے لہجے میں کچھ تھا کہ جس نے خولہ کے دل کو جکڑا تھا۔

''اللہ ہمیشہ تمہیں خوش رکھے۔'' خولہ نے بے ساختہ اس کا ماتھا چوم کر دعا دی۔

☆......☆......☆

منگنی کا فریضہ انجام ہو جانے کے بعد گھر میں اِک بے ترتیبی سی پھیلی ہوئی تھی۔جا بہ جا پیروں کے نیچے آ کر مسلی جانے والی پھولوں کی پتیاں ڈرائنگ روم میں موجود صوفوں کے کشن اپنی جگہ سے ہلے ہوئے...... ہال کرسیوں سے اٹا پڑا تھا اور ان کرسیوں اور گول میزوں کی حالت صاف بتاتی تھی کہ وہاں کھانا کھایا گیا تھا۔فرش کی چمک کو جوتوں کی مٹی نے دھندلا رکھا تھا۔کچن میں برتنوں کا اِک جمِ غفیر تھا اور کام والی صبح آ کر دھونے کا کہہ کر غائب ہو چکی تھی۔ایسے میں......اس اُلٹے پڑے، بے ترتیب گھر میں...... اِک جانب سے بار بار قہقہوں اور ہنسی کی آوازیں آتی تھیں۔وہ اِک خوشگوار دن تھا......مزنہ نے جیولری اتار دی تھی لیکن ابھی تک وہ اسی جوڑے میں تھی۔خولہ نے بھی چینج نہیں کیا تھا۔جہانگیر کا کوٹ صوفے پر اُلٹا پڑا تھا اور اس نے ڈریس شرٹ کے بازو فولڈ کر رکھے تھے۔ٹائی ڈھیلی اور گریبان کا اوپری بٹن بھی کھول رکھا تھا۔احمد صاحب نے بھی شلوار سوٹ کے اوپر پہنی واسکٹ اتار کر کرسی کے بازو پر ڈال رکھی تھی۔اور اب آرام دہ حالت میں بیٹھے تھے،فرخندہ بھی دونوں پاؤں اوپر کر کے صوفے پر براجمان تھیں۔ان کے پہلو سے چپکی مزنہ بیٹھی تھی اور خولہ......وہ ابھی ابھی چائے کی ٹرے لے کر آئی تھی۔سب کو باری باری کپ پکڑانے کے بعد وہ مزنہ کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔وہ ہنس رہے تھے،خوش گپیوں میں مصروف تھے۔آج کی تقریب کو ڈسکس کیا جا رہا تھا۔سبھی کی رائے مزنہ کی سسرال والوں کے بارے میں اچھی تھی۔وہ مطمئن تھے کہ یہ اطمینان اِک عرصے بعد نصیب ہوا تھا۔

''احمد بھائی......مزنہ کی شادی کے بعد تو آپ اکیلے ہو جائیں گے۔'' فرخندہ نے اچانک پوچھا۔اس سوال پہ اِک محسوس کی جانے والی اداسی وہاں سرعت سے پھیلی تھی۔ماحول پر یک دم خاموشی حاوی ہوئی تھی۔

http://kitaabghar.com

''بیٹیوں کو تو بیاہنا ہی ہوتا ہے ناں فرخندہ......'' چند لمحوں بعد وہ ذرا دھیمے لہجے میں بولے تھے۔

''نہیں، احمد بھائی...... میں آپ کو اکیلا نہیں رہنے دوں گی۔ آپ ہمارے ساتھ رہیں گے۔'' فرخندہ جذباتی ہو رہی تھیں۔ احمد صاحب ہنس دیے۔

''اچھا جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا۔ ابھی سے کیوں ہلکان ہو رہی ہو تم......'' بہن کا سر شفقت سے تھپکتے ہوئے وہ بولے۔ مزنہ کا دل بھر آیا تھا۔ اسے یوں رونے کے لیے آمادہ دیکھتے ہوئے خولہ نے اس کی پسلی میں کہنی ماری۔ ''سی'' کر کے اس نے گھور کر بہن کو دیکھا۔ خولہ نے مسکرا کر اسے نہ رونے کا اشارہ کیا تھا۔

''ابو...... پھپھو ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ہم اکیلا تو نہیں چھوڑ سکتے ناں آپ کو......'' وہ چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولی۔

''جہانگیر کا ارادہ جرمنی جانے کا ہے، اب مزنہ کی شادی کے بعد ہی جا سکے گا تو تب میں اور پھپھو یہاں آ جائیں گے۔'' خولہ نے انہیں اگلی بات سے آگاہ کیا تھا۔

''دیکھو کیا ہوتا ہے...... اللہ بہتر کرے، میرا گھر میری بیٹیوں کا ہی ہے، جو جب بھی آئے، کون روک سکتا ہے بھلا......'' انہوں نے مسکرا کر کہا۔

جہانگیر نے اِک خاموش نظر ماموں کے چہرے پر ڈالی تھی۔ اسے کیوں محسوس ہوتا تھا کہ ماموں کی شفقت احسان تھا؟ کیوں؟ وہ بے اختیار سوچنے پر مجبور ہوا تھا۔

☆......☆......☆

مزنہ کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی تھی۔ اس کے منگیتر کو شادی سے چند دن پہلے جرمنی سے واپس آنا تھا۔ دونوں گھرانوں میں شادی کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ اور مزنہ کا تھا کون جو تیاری کرتا۔ سو مصروفیت ہی مصروفیت تھی۔ خولہ کے علاوہ اور تھا ہی کون؟ وہ تو اب صحیح معنوں میں پہاڑ تلے تھی۔

وہ باپ کے گھر ہی آئی ہوئی تھی لیکن ویک اینڈ پر اسے اپنے گھر جانا پڑتا تھا اور پھر سارے ہفتے کے کام نپٹا کر سوموار کو اسکول سے سیدھی ابو کے گھر...... گھر آتے ہی کھانا کھایا اور پھر بازار جانے اور وہ جانے...... مزنہ اور وہ تیاری کرتے کرتے بے حال ہو چکی تھیں۔

''اگر ہم یوں ہی سڑکوں پر خوار ہوتے رہے ناں آپی! تو لکھوا لیں مجھ سے، میرا سارا رنگ روپ شادی والے دن بھک سے اڑ جائے گا۔'' اسے اپنی بیوٹی کی فکر لاحق تھی اور بری طرح سے ہی لاحق تھی۔

''تو میں کیا کروں؟ میں کسے لے کر بازاروں میں گھومتی پھروں...... اکیلی جانے سے تو رہی اور اوپر سے شاپنگ بھی تو تمہاری ہی ہے۔'' خولہ بھی تپی ہوئی تھی۔ دونوں ہاتھ شاپنگ بیگز سے بھرے۔ وہ فٹ پاتھ پہ چلتی جا رہی تھیں...... تھکاوٹ کا احساس

شدید تھا اور سر درد سے بھاری ہو رہا تھا۔

''یار آپی! کچھ تو کرو......میں کالی ہو رہی ہوں، کیا سوچے گا وہ......؟''

''وہ......؟'' خولہ کو ٹھیک ٹھاک قسم کا دھچکا پہنچا تھا۔

''اس کی فکر ہے اور جو بہن ذلیل ہو رہی ہے وہ......؟ اس کی کوئی پروا، کوئی فکر...... پہلے اسکول نپٹاؤ پھر گھر اور اب شاپنگ......اور محترمہ کو فکر کس کی ہے۔ ''وہ'' کی......'' خولہ بھنّا ہی تو گئی تھی۔

مزنہ نے چوزے جیسے منہ بنا کر اسے دیکھا تھا جو کہ شاپنگ بیگز پیروں کے پاس ڈھیر کر کے، لڑنے کے سے انداز میں دونوں ہاتھ کمر پر ٹکائے اسے سخت نظروں سے گھور رہی تھی۔

''اچھا......اب یوں تو نہ گھوریں......آگے ہی میری جان فنا ہو رہی ہے، آپ اس میں مزید اضافہ تو نہ کریں......''وہ'' ......کیا کہے گا کہ......'' ٹھنک کر کہتے ہوئے آخر میں جان بوجھ کر وہ ہونٹ کو لٹکا کر بولی تھی۔ اور خولہ نے اس کے یوں کہنے پر اسے ایسی نظروں سے گھورا کہ جیسے کہتی ہو......پھر ''وہ'' ہی......

اس کے گھورنے پہ مزنہ بے اختیار ہنسی تھی اور اس کے ہنسنے پہ خولہ بھی سر جھٹک کر مسکرا دی تھی اور پھر جھک کر پیروں کے پاس پڑے شاپنگ بیگز اٹھائے اور ایک بار پھر سے وہ دونوں روانی سے باتیں کرتے ہوئے مزید خوار ہونے کے لیے اِک دم تیار تھیں۔

اچھا بھلا سب کچھ صحیح چل رہا تھا۔ وہ خوشی خوشی مزنہ کی شادی کی تیاریوں میں مگن تھی کہ اچانک......دل کو کسی نا معلوم سے احساس نے جکڑ لیا تھا۔ عجب، عجب طرح کے وہم تنگ کرتے تھے اور وہ سہم سہم جاتی تھی۔ معلوم نہیں کیوں یہ اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔ ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ہنستے ہنستے یک دم اس کے ہونٹوں کی ہنسی غائب ہو جاتی اور دل پر خوف اپنے پنجے پھیلا کر سے جکڑ لیتا تھا۔ خوف......؟ کیسا خوف؟ یہ ہی تو سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ تو کیا وہ مزنہ کی شادی کے باعث ٹینشن میں تھی یا پھر اسے ابو کی پریشانی تھی۔ ان کے اکیلے رہ جانے کے خیال سے ایسا تھا؟ لیکن یہ دونوں معاملات ایسے تو نہ تھے کہ جن کا حل نہیں نکالا جا سکتا، مزنہ کو بھی سب لڑکیوں کی طرح ایک نہ ایک دن بیاہنا ہی تھا تو پھر خوف کیسا......رہ گیا احمد صاحب کا معاملہ تو اس کا وقتی حل بھی نکالا جا سکتا تھا بعد کی بعد میں دیکھی جاتی تو پھر......پھر ایسی حالت کیوں......؟ اور یہ ''کیوں'' کا جو سوال تھا اس کا جواب کہیں پر بھی نہیں ملتا تھا۔ اس کے چاروں طرف ہر وقت یہ ہی ''کیوں، کیوں'' ہوتی رہتی تھی اور وہ سہم سہم جاتی، دل میں جو اِک خوشی کا جذبہ تھا، وہ جیسے اچانک مر گیا تھا۔ وہاں بس اِک انجانا ان دیکھا سمجھ میں نہ آنے والا خوف براجمان تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ دنیا اس کے سامنے سلو موشن میں چلنے والی پکچر تھی یا پھر وہ ہی کہیں پیچھے رہ گئی تھی۔ کیا یہ اسٹریس تھا؟ اس تھکا دینے والی روٹین کی وجہ سے...... جسے وہ شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں اختیار کیے ہوئے تھی۔ اسٹریس تھا...... یا پھر کوئی ذہنی حالت وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ خولہ یہ حالت کسی سے ڈسکس بھی نہیں کرنا چاہتی تھی کہ خوشی کا موقع تھا اور وہ کسی کو پریشان بھی نہیں کرنا چاہتی

تھی، چاہے خود پریشانی اس کے وجود پر ضربیں لگا لگا کر اسے ادھ موا کرتی رہے، وہ کسی سے بھی یہ بات ڈسکس کرنے والی نہیں تھی۔ وہ مزنہ سے ڈسکس کرنے لگتی تو مزنہ کا ہنستا چہرہ اس کے ہونٹوں کو "شش" کرتے ہوئے خاموش رہنے کا اشارہ کرتا تھا۔ اور پھر...... پھر اس کا دل چاہتا کہ وہ دہاڑیں مار مار کر روئے۔ اتنا روئے اتنا روئے کہ دل پر چھایا غبار، آنسوؤں کے ساتھ ڈھل ڈھل کر پھٹ جائے...... وہ بھی بے فکری سے اک اک لمحہ انجوائے کرنا چاہتی تھی۔ اونچے اونچے بے مقصد قہقہے لگانا چاہتی تھی۔ خوش ہونا چاہتی تھی کہ خوشی کا ہی موقع تھا۔ لطف اٹھانا چاہتی تھی لیکن...... لیکن اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ اس کے قہقہے اپنی موت آپ مر گئے تھے۔ ہنسی پیٹھ پھیر کر کہیں بھاگ گئی تھی۔ خوشی اسے جیسے گڈ بائے فار ایور کہہ چکی تھی۔ تو کیا زندگی کبھی بھی...... اسے کبھی بے فکری کا معنی اوڑھ کر نہیں ملے گی؟ کیا کبھی بھی نہیں......؟ اس کا دم اور گھٹنے لگتا...... اتنا کہ آنکھوں سے آنسو بھی خفا ہونے لگتے۔

"تو کیا وہ کسی قسم کے ذہنی مرض کا شکار ہو رہی تھی؟" اور اگلی ذہنی رو اسے نئے سرے سے خوف میں مبتلا کر کے رکھ دیتی تھی۔ یوں جیسے وہ دو نقطوں کے درمیان کھینچا گیا ایک خط تھی۔ پہلے نقطے کا نام بھی خوف اور دوسرے کا بھی...... وہ بس انہی دو نقطوں کے درمیان کسی گیند کی طرح لڑھکتی رہتی...... اور جیسے جیسے مزنہ کی شادی کے دن قریب آ رہے تھے یہ احساس شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ اتنا کہ اب دوسروں پہ بھی عیاں ہونے لگا تھا۔

"تم تھک گئی ہوناں خولہ......! آرام کر لو چند دن...... مت کرو اتنا کام......"

"مزنہ! تم نے میری بیٹی کو خوار کر کے رکھ دیا۔ دیکھو تو کیسے رنگت ہی بدل کر رہ گئی ہے اس کی تو......" ابو کہتے...... پھپھو اسے دودھ، بادام کھلانے کے چکروں میں رہتیں اور وہ...... وہ ان سب کو سمجھانے میں ناکام تھی کہ آخر...... آخر اس کا اصل مسئلہ کیا تھا۔

☆......☆......☆

شاپنگ کا کام ختم ہوا تو...... ایک دو دن کے وقفے سے گھر میں ڈھولک رکھی گئی تھی۔ خولہ نے ابھی تک اسکول سے چھٹیاں نہیں لی تھیں۔ سو اس کی مصروفیت کا وہ ہی عالم تھا۔ اور اب تو اس نے اس کا آسان حل بھی ڈھونڈ ہی نکالا تھا۔ وہ پھپھو کو لے کر ابو کے گھر میں ہی آ گئی تھی۔ شادی میں دن ہی کتنے رہ گئے تھے۔ مزنہ کے منگیتر کو بھی ایک دو دن میں پاکستان آ جانا تھا۔

اس وقت بھی وہ سب کو چائے سرو کر رہی تھی اور بے طرح مصروف دکھائی دیتی تھی۔ چہرہ سنجیدہ، رنگت زرد اور آنکھوں کے نیچے واضح محسوس کیے جانے والے حلقے، ہونٹ خشک......

"تو کیا اسے پانی پینے کا بھی ہوش نہیں تھا؟" یہ سب جہانگیر اسے دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ اور وہ جب کسی کام کی غرض سے دوبارہ کچن کی طرف مڑی تو جہانگیر بھی اس کے پیچھے ہی گیا تھا۔ وہ کچن میں ملازمہ کو کچھ کہنے میں مشغول تھی اور اس کا آنا نوٹس نہیں کر سکی تھی۔ جہانگیر نے یک دم اس کا ہاتھ پکڑا، ہاتھ میں موجود پلیٹ کو شیلف پر رکھا اور اسے کھینچتے ہوئے باہر لایا۔

http://kitaabghar.com

''جہانگیر، جہانگیر افوہ......ہوا کیا ہے؟ اُف......کچھ بتاؤ تو سہی......جہانگیر کیا کر رہے ہو، یا خدایا......'' وہ اس کی سنے بغیر کھینچتا ہوا اسے چھت پر لے آیا تھا اور پھر اپنی پشت پر موجود اس کے وجود کو کھینچ کر اپنے سامنے لا کھڑا کیا۔ اب کی بار وہ کچھ یوں بولی نہ تھی بلکہ خفگی بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ یوں جیسے سوال کرتی ہو۔

''آخر مسئلہ کیا ہے؟''

''تمہیں کیا ہوا ہے خولہ......؟'' وہ دو قدم نزدیک ہوا۔ خولہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''مجھے کیا ہوا ہے؟'' اور پھر الٹا سوال پوچھا۔

''حالت دیکھی ہے اپنی؟ کیسی ہوتی جا رہی ہو؟ شادی میں تم دلہن کی بہن کم اور ماسی زیادہ نظر آؤ گی۔'' وہ غصے سے کہہ رہا تھا۔

''آں......اور تم کب چاہو گے کہ تمہاری بیوی ماسی لگے، ہے ناں......؟'' وہ ہلکی سی شگفتگی سے بولی تھی۔

''شٹ اپ خولہ! یار کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ اسکول سے چھٹیاں کیوں نہیں لے لیتیں تم......؟ کیوں خود کو اتنا تھکا رہی ہو؟ نہیں ہوتا تم سے تو دفع کرو اسکول کو......'' وہ ناراضی اور جھنجلاہٹ سے بول رہا تھا۔ اور خولہ اسے دیکھتی رہ گئی۔ دیکھو تو بھلا......کہہ کون رہا تھا؟

''مجھے تم عزیز ہو خولہ......'' وہ اب اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیے مدھم لہجے میں بولا۔ اور خولہ......اس کی آنکھوں میں یک دم ہی اِک بے نام سی جلن اتر آئی۔ اس نے ایک سلگتی سی نظر سے جہانگیر کو دیکھا۔

''آئینہ دیکھنے کی بھی فرصت ہے تمہیں یا یہ کام بھی میں ہی کر دوں؟ تاکہ تم کم از کم اپنی حالت تو ملاحظہ کر سکو!'' وہ اب دو انگلیوں میں اس کے بالوں کی لٹ کو پکڑے، اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ خفگی اس کے لہجے سے چھلک چھلک پڑتی تھی۔ آنکھوں کی جلن نے سرطان کی مانند پورے جسم کا احاطہ کیا تھا۔ دھیرے دھیرے، آہستہ آہستہ، جوں جوں وہ اس کی خاطر، اس کی فکر میں ایک ایک جملہ بولتا چلا جا رہا تھا۔ ویسے ویسے وہ سلگتی جا رہی تھی۔

''جاب چھوڑ دو خولہ......! میں یہ تو نہیں چاہتا تھا کہ تمہیں یوں دیکھوں؟'' اور وہ بے اختیار، بے ساختہ اِک پُرتپش مسکراہٹ مسکرائی۔

''نہیں جہانگیر......! اب تو جاب میرے لیے مسئلہ ہی نہیں رہی، میں عادی ہو چکی ہوں، یہ اب میرے لیے ایسے ہی ہے جیسے زندگی کا کوئی دوسرا معمول......جیسے......جیسے تین وقت کا کھانا......مجھے اب فرق نہیں پڑتا اور رہ گئی چھٹیاں لینے کی بات......تو لے لوں گی آف......آخر لینا ہی ہے ناں اور اس تھکاوٹ کا کیا ہے......چار دن کی بات ہے، دن گزر جائیں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ اسی تپتی مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے براہ راست پلکیں جھپکے بنا۔

''شیور......؟'' جہانگیر نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

''شیور......!'' اس کے چہرے پر طنزیہ سے تاثرات ابھرے اور انہی تاثرات کے ساتھ اس نے جہانگیر کا ہاتھ تھپتھپایا تھا۔

''اچھا، ابھی تم نیچے نہیں جاؤ گی...... میں تمہارے لیے اچھی سی چائے کا کہہ کر آتا ہوں اور میرے آنے تک تم یہاں سے ہلو گی تک بھی نہیں...... چاہے کوئی جتنی بھی آوازیں دیتا رہے، اوکے؟'' وہ پیار سے کہہ رہا تھا اور اِک اوران دیکھا، نظر میں نہ آنے والا پھپولا خولہ کے جسم پر نمودار ہوا تھا۔ اِک اور تکلیف کی لہر...... اس نے مسکرانے کا تکلف کیا اور اثبات میں سر ہلایا۔

''ہلنا نہیں......'' اسے ایک بار پھر سے وارن کیا گیا تھا۔ اور خولہ تپتے وجود اور اسی پُرتپش مسکراہٹ کے ساتھ اس کی پشت کو دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو...... تنہائی کا فائدہ اٹھا کر ایک دم نمودار ہوئے تھے۔

''ہونہہ......!'' وہ خود پر ہنسی۔

''تو جہانگیر اعجاز، تو جب تمہاری مرضی ہوگی جیسے تم چاہو گے۔ جب تمہیں اچھا لگے گا اور جب تمہیں برا...... تو تم ویسے ویسے ہی مجھ سے محبت کرو گے میری پروا کرو گے...... ٹھیک! تو پھر میری مرضی......؟ میری منشا؟ میری زندگی اور اس کی خواہشات؟ وہ کیا ہوئیں......؟ سارے اختیارات تمہارے...... اور خواہشات بھی کیا تمہاری؟ اچھا! تو محبت اسے کہتے ہیں اور پھر اس کا نام ہے، پہلی دفعہ ذائقہ چکھا ہے اور زبان کہتی ہے کہ اللہ نہ کرے کہ دوبارہ یہ ذائقہ نصیب ہو...... ٹھیک ہے، جب تمہارا دل چاہا، تم نے اپنی زندگی میں مجھ کو جگہ دی اور اب جب میرا دل راضی ہوگا تو تب میں اپنے دل میں تم کو جگہ دوں گی...... یوں ہے تو یوں ہی سہی...... تمہاری محبت اور پروا دونوں ہی بے اہم ہیں اب میرے لیے، وہ یوں کہ مجھے نہ صرف پیروں پر کھڑا ہونا آ گیا ہے بلکہ میں نے تو دوڑنا بھی سیکھ لیا ہے جہانگیر......! اور تم...... تم تو کہیں پیچھے ہی رہ گئے ہو...... بہت پیچھے...... میری زندگی میں تو بس اِک خواہش بچی ہے، محض اک ہی خواہش...... میری اولاد اور اسی خواہش کے واسطے میں نے اپنا آپ وقت کے پیروں تلے رکھ چھوڑا...... کہ آؤ اور لمحہ لمحہ مجھے روندتے چلے جاؤ...... پتا نہیں محبت کہتے کسے ہیں...... اگر اسے تو بڑی ہی کڑوی شے ہے یہ......''

''چائے......'' اس کے بدن کو گرم گرم لہروں کی صورت ڈھانپتی سوچوں کا تانا بانا اس آواز سے ٹوٹا تھا۔ اس نے چونکے بنا بے تاثر نظروں سے جہانگیر کو دیکھا اور چائے کی پیالی پکڑی تھی۔ جہانگیر کچھ کہہ رہا تھا...... کیا؟ وہ بھلا کیوں سنتی...... ہاں...... کیوں؟

''عورت بڑی سخت چیز ہوتی ہے، پتھر ہے پتھر...... دل کا دروازہ نہیں کھولتی، چاہتی ہے کہ اسے ویسے چاہا جائے جیسے کہ وہ چاہے جانا پسند کرتی ہے، جس مرضی سے اور گر یوں نہ ہو تو سارے دروازے بند، قفل ڈال کر چھوڑتی ہے یہ، لاکھ سر پٹختے رہو، نہیں کھولنا تو بس نہیں کھولنا...... موم ہونا کہاں آتا ہے اسے...... اس کے برعکس مرد کے دل میں گنجائش کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ وہ جیسے تیسے ہی سہی محبت ہو نہ ہو ساتھ رہنے والی عورت کے لیے گنجائش نکال ہی لیتا ہے، گنجائش یوں اس کے دل میں موجود رہتی ہے جیسے دھڑکن...... اور عورت...... سمجھوتے کے نام پر ساری زندگی گزار دے گی، خالی رہنا پسند کر لے گی مگر محبت...... من مرضی سے ہی کرے گی۔

☆......☆......☆

''ابو......'' وہ یک دم بوکھلائی سی آئی تھی۔

''یا اللہ خیر کیا ہوا خولہ!'' ابو اس سے زیادہ حواس باختہ ہوئے۔

''نہیں نہیں سب ٹھیک ہے ابو، وہ میں آپ کو یاد کروانے آئی تھی کہ آج مزنہ کے......'' اسے یک دم یاد آ رہا تھا اور وہ بھاگی بھاگی ابو کے پاس آئی تھی۔

''ہاں، ہاں......! یاد ہے مجھے، آج فلائٹ تھی ناں اس کی۔''

''تو......! تو ملنے نہیں جانا کیا؟''

''کمال کرتی ہو خولہ......! ابھی تو بچہ آیا ہوگا......اسے تھوڑا آرام تو کرنے دو......کل چلیں گے ہم لوگ......''

''تو پھر فون پہ ہی مہ جبیں سے پوچھ لوں؟''

''کیا پوچھو گی؟''

''خیریت ہی پوچھنی ہے ابو......! وہ لوگ یہ نہ سوچیں کہ ہم نے پوچھا تک نہیں......''

''ہاں، ٹھیک ہے، فون کر لو مناسب رہے گا۔'' ان کے جواب دیتے ہی وہ مزنہ کے کمرے کی طرف مڑی تھی۔ اپنا سیل فون اس نے مزنہ کے پاس ہی رکھ چھوڑا تھا۔ ورنہ اتنی مصروفیت میں وہ تو کب کا سیل گم کر چکی ہوتی......مزنہ سے سیل فون لے کر اس نے کال ملائی تھی۔ مہ جبیں کے نمبر پر......دوسری طرف بیل جا رہی تھی مگر کوئی اٹھا نہیں رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک ٹرائی کرنے کے بعد اس نے کوشش یہ سوچ کر ترک کر دی کہ مہ جبیں مصروف ہوگی اور پھر ایک ٹیکسٹ میسج بھیج دیا تھا۔

''بھائی خیریت سے پہنچ گئے ناں؟'' اور مزنہ کو بتا کر سیل فون اسی کے حوالے کرتے ہوئے باہر نکل آئی تھی۔

بعد میں مزنہ نے اسے بتایا تھا کہ کافی دیر بعد مہ جبیں کا ایک لفظی جواب آیا تھا۔ ''ہاں......''

☆......☆......☆

چائے کا مگ پکڑے وہ کسی گوشۂ عافیت کی تلاش میں تھی کہ جہاں بیٹھ کر وہ سکون سے چائے پی سکے......پینے تو وہ چائے ہی آئی تھی لیکن......سوچوں کے سفر پہ چل نکلی تھی۔ دور سے دیکھو تو یوں لگتا تھا کہ چائے کا مگ دونوں ہاتھ میں پکڑے وہ عہدِ رفتہ کا کوئی سنگی مجسمہ ہو۔

''آپی......!'' اور وہ بری طرح ڈری تھی۔ رنگت یک دم اتنی پیلی پڑی کہ مزنہ حیران ہو گئی۔

''کیا ہوا؟'' وہ اب اس کے ہاتھ سے چائے کا مگ پکڑ کر سائیڈ پر رکھتے ہوئے بولی اور اپنے دوپٹے سے اس کے ہاتھ پر چھلک جانے والی چائے صاف کرنے لگی۔ خولہ کی آنکھوں میں آنسو ٹھہر سے گئے تھے۔

''آپی......؟'' مزنہ ان آنسوؤں کو دیکھ کر اور بھی حیران ہوئی تھی۔ اور خولہ نہ چاہتے ہوئے بھی......قابو نہ رکھ سکی تھی۔ پھوٹ

http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com

پھوٹ کر رو دی تھی۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ وہ روئے جا رہی تھی اور مزنہ ہق دق پریشان کہ محض چائے چھلک جانے سے بھی کوئی یوں روتا ہے، وہ بچی تو نہ تھی۔

''آپی کیا ہوا ہے؟''

''کچھ نہیں......!''

''تو پھر یوں روتی کیوں ہیں؟''

''بس دل گھبرا رہا تھا۔''

''اور دل گھبرانے کی وجہ......؟'' مزنہ چڑی تھی۔

''کچھ نہیں......'' اب وہ مزنہ کو اپنی کیفیت کیا سمجھاتی۔

''تم کیوں آئی تھیں؟'' خود پہ اب وہ قابو پا چکی تھی۔

''ابو بلا رہے ہیں کہہ رہے ہیں کہ میری سسرال جانا ہے۔'' اور مزنہ بولتے ہوئے ابھی تک حیرت بھری نظروں کے ساتھ اسے دیکھتی جاتی کہ اسے آخر ہوا کیا تھا؟

''اچھا آتی ہوں......'' اس نے اتنا ہی کہا۔

☆......☆......☆

دل گھبرائے تو گھبرانے کی وجہ بھی تو ہو...... جو یہ بے وجہ ہی گھبرانے، رونے پہ آمادہ ہو تو کوئی کیا کرے؟ کیا وہ تیار تو ہو گئی مگر ابھی تک دل گھبرا رہا تھا۔ جب تیار ہو کر آئی تو ابو اور جہانگیر بھی تیار ہی کھڑے تھے۔

''اطلاع دی تھی مہ جبیں کو؟'' احمد صاحب نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''نن......نہیں...... یاد نہیں رہا ابو......'' وہ شرمندہ سی ہوئی اور اس کے ساتھ ہی پرس سے سیل فون نکال کر...... مہ جبیں کا نمبر ملانے لگی۔ جہانگیر اور احمد صاحب دونوں ہی اب اس کے منتظر تھے۔ اس نے دو تین بار ٹرائے کیا مگر فون نہیں اٹھایا جا رہا تھا۔

''فون ریسیو نہیں کر رہی مہ جبیں......'' اس نے اطلاع دینے والے انداز میں کہا۔

''اچھا چلو کوئی بات نہیں...... مصروف ہو گی اپنے ہی گھر والی بات ہے اب تو...... چلو جہانگیر آگے ہی دیر ہو رہی ہے۔'' احمد صاحب گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولے تھے اور خولہ نے بھی ان کی پیروی کی تھی۔

☆......☆......☆

گیٹ کھلا ہوا تھا، اتنی حیرانی کی بات نہیں تھی کہ چند دن بعد ہی مہندی کا فنکشن تھا۔ مہمانوں کا آنا جانا لگا ہوا ہو گا۔ وہ آرام سے

http://kitaabghar.com

اندر آئے، گاڑی باہر پارک کی تھی لیکن لاؤنج کا داخلی دروازہ داخل ہونے سے پہلے ناک کیا گیا تھا۔ایک بار، دو بار، تین بار......اور چوتھی باران کے درمیان حیران نظروں کا تبادلہ ہوا تھا۔وہ سب اِک لمحے کے لیے وہاں ساکت کھڑے رہے کہ اب کریں تو کریں کیا؟

''خولہ تم جاؤ اندر......'' جہانگیر نے اس سے کہا تھا۔

''میں......!'' اوراس کا بے وجہ گھبرانے والا دل اِک بار پھر گھبرایا۔

''ہاں تم! اب ہم دونوں مردیوں بنا اطلاع کے اندر جاتے اچھے تو نہیں لگتے ناں......تم جاؤ۔'' اور وہ جہانگیر کے کہنے پر تذبذب کے سے انداز میں آگے بڑھی تھی، لاؤنج خالی تھا اور وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔خولہ کو حیرت ہوئی، وہ ہنگامہ، رونق بھی عنقا نظر آئی تھی جو شادی والے گھر کا خاصہ ہوتی ہے، عجیب سائیں سائیں کرتا ماحول تھا۔

''مہ جبیں......آنٹی......!'' وہ آواز دیتی آگے بڑھ رہی تھی اور جواب......خاموشی......وہ تھوڑا سا اور آگے بڑھی تو یک دم اسے اِک جانب سے مہ جبیں آتی دکھائی دی۔

''مہ جبیں......!'' خولہ نے ترنت آواز دی تھی۔یوں جیسے یہ کوئی بھوت بنگلا تھا اور مہ جبیں کا ظہور بھی چند سیکنڈز کا تھا۔ورنہ وہ پھر کہیں حلول کرنے والی تھی۔

''آپ؟'' مہ جبیں کو اس کی موجودگی پیٹ میں پڑے گھونسے جیسی لگی تھی۔وہ بھی اچانک اور لاعلمی میں پڑنے والا گھونسا۔اس کے اس طرح کے ردِّعمل پر خولہ عجب سی خجالت کا شکار ہو کر خاموش ہوگئی تھی۔اس کا دل اِک بار پھر سے بے وجہ ہی گھبرایا تھا۔

''آپ کب آئیں؟'' مہ جبیں کو جیسے ہوش آیا تھا۔

''ابھی......ذرا سی دیر پہلے، ابو اور جہانگیر بھی ہیں ساتھ۔'' خولہ نے ایک ہی سانس میں بات مکمل کی ایسے جیسے اس کے بعد بولنے پر پابندی لگنے والی تھی اور یہ سن کر بوکھلائی ہوئی مہ جبیں مزید بوکھلائی تھی۔

''آئی ایم سوری......میں نے فون کیا تھا مگر آپ نے ریسیو نہیں کیا تو ہم بنا اطلاع کے ہی آگئے۔''

''نہیں، کوئی بات نہیں......آپ بیٹھیں......انکل اور جہانگیر بھائی کو بھی بلائیں......بلکہ میں بلاتی ہوں۔'' وہ بولی نہیں۔بوکھلائی تھی۔اسی حواس باختگی کے عالم میں وہ ان دونوں کو بلانے گئی اور ان کو اندر بٹھا کر وہ امی کو بلانے چلی گئی تھی۔اس کے انداز اتنے عجیب تھے کہ وہ تینوں ایک دوسرے کو حیرت بھری سوالیہ نظروں سے دیکھنے پر خود کو روک نہیں پائے تھے۔اور جب مہ جبیں کی امی آئیں تو وہ بھی بوکھلائی ہوئی تھیں لیکن مہ جبیں سے ذرا کم......

''ہم بھائی سے ملنے آئے تھے۔ان کو بلا دیں پلیز......!'' جب چائے کے بعد بھی بھائی کے آثار نظر نہ آئے تو خولہ کو کہنا ہی پڑا۔

''ہاں، میں بلاتی ہوں۔'' مہ جبیں اٹھی ہی تھی کہ ایک طرف سے آواز ابھری۔

http://kitaabghar.com

''السلام علیکم......!'' اور سب یک دم اس آواز کی سمت متوجہ ہوئے تھے۔ وہ دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ اس کے سلام کا جواب اُن لوگوں کے حلق سے برآمد نہ ہوسکا تھا۔ وہ اندر ہی کہیں گھٹ سا گیا تھا۔ اور وہ سنجیدہ تاثرات کے ساتھ کھڑا انہی لوگوں کی طرف متوجہ تھا۔ شاک وہاں موجود تین لوگوں کے چہرے پر جیسے درج ہو کر رہ گیا تھا۔ بے یقینی رقم تھی ان کی آنکھوں میں اور خولہ......وہ اِک لمحے کے لیے حیران ہوئی تھی اور دوسرے ہی لمحے اس کا دل اتنے دنوں کی تکلیف اور بے سکونی کے بعد......عین اس لمحے میں حالت سکون میں آیا تھا۔

''اچھا......! تو یہ تھی وہ ''وجہ'' جو الہام بن بن کر مجھ پر ٹوٹتی رہی۔'' اس پر جیسے انکشاف ہوا تھا اور اس نے بے اختیار تھک کر اِک گہری سانس بھری تھی۔

اور وہ......وہ اب اندر ڈرائنگ روم میں داخل ہو رہا تھا۔

''خموشی کو اگر حکم ہوتا کہ وہ محسوس ہونے کے بجائے دکھائی دے تو وہ اپنا آپ دکھانے کے واسطے کچھ اور نہ ہوتی وہ بس مزنہ احمد ہوتی۔''

اور یہی......خموشی گر ہوا ہوتی تو ایسی ہوا ہوتی کہ جہاں جہاں سے گزرتی وجود پتھر کر چھوڑتی۔ کسی کام کا نہ رہنے دیتی اور وہاں صرف خموشی تو نہ تھی وہاں ویرانی بھی تھی......موت کی سی ویرانی......سرانڈ کی صورت پھیلتی ہوئی......یہ شدید تھا......بدتر دھچکا تھا۔

عزیز، مزنہ کا منگیتر......وہ اِک عدد بچے کے ہمراہ واپس آیا تھا۔ ''قانونی حیثیت حاصل کرنے کے لیے کی گئی پیپر میرج کا تحفہ......'' اس بچے کے بارے میں اس نے اپنے گھر والوں کو بھی لاعلم رکھا ہوا تھا۔ وہ اس کا خون تھا، وہ کیسے اسے چھوڑ سکتا تھا اور اب جبکہ وہ یہاں، پاکستان میں شادی کر رہا تھا تو اس کی بیوی کو ہی یہ بچہ سنبھالنا تھا......یہ طے تھا۔

''تم نے ہمیں لاعلم کیوں رکھا؟'' احمد صاحب نے بے حد بے بسی سے سوال کیا۔

''میں بتانا چاہتا تھا لیکن جرأت نہیں کر پایا۔'' عزیز کا سر اٹھا ہوا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اور وہ جھکا ہوا ہی تھا۔

''اور اب جو جرأت کی ہے وہ؟ یہ ظلم ہے......'' احمد صاحب کو تاؤ آیا۔

''میں معذرت خواہ ہوں۔''

''تمہاری معذرت کا اب میں کیا کروں عزیز؟ اب کیا؟'' لہجہ مزید سخت ہوا۔

''تمہیں شرم آنی چاہیے، تم جانتے بھی ہو تم نے کیا کیا ہے؟'' وہ جہانگیر تھا جو کہ بھڑک کر بولا تھا۔ احمد صاحب نے یک دم اس کے بازو پر دباؤ ڈال کر اسے روکا تھا۔ مہ جبیں اور اس کی امی رو رہی تھیں۔ اور ان کا رونا بتاتا تھا کہ وہ بھی لاعلم تھیں۔ جہانگیر نے اِک غضب سے پُر نگاہ عزیز پر ڈالی تھی اور پھر وہ وہاں رکا نہ تھا، وہ اٹھ کر باہر نکل گیا تھا۔ خولہ نے اِک گہری سانس بھر کر عزیز کو دیکھا اور اِک مزید تھکا دینے والی تھکن اس کے وجود میں اتری تھی۔ مزنہ تو مر جائے گی......اور اس کے ذہن میں یہ جملہ ہتھوڑے کی طرح ضرب لگاتا تھا۔

اور مزنہ......وہ واقعی مر ہی گئی تھی......لمحوں میں دفن ہوئی تھی۔

http://kitaabghar.com

''اور اگر خموشی کو حکم ہوتا کہ وہ محسوس ہونے کے بجائے دکھائی دے تو وہ اپنا آپ دکھلانے کے واسطے کچھ اور نہ ہوتی...... وہ بس مزنہ احمد ہوتی۔''

وہ جب وہاں سے واپس لوٹے تو کوئی بھی وہاں ان تینوں میں سے کوئی بھی کم از کم گھر تو جانا نہیں چاہتا تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ فی الوقت گھر کے راستے کے علاوہ اور کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا۔ احمد صاحب گھر آ کر خود پر قابو نہ رکھ سکے تھے اور وہ مزنہ کو گلے سے لگا کر آواز کے ساتھ رونے لگے۔ مزنہ حواس باختہ ہوئی۔ فرخندہ کے بھی چھکے چھوٹے تھے کہ اچھے بھلے تو گئے تھے...... اب کیا ہوا اور جب معلوم ہوا کہ کیا ہوا تو...... تو اِک موت کا سا سناٹا...... اِک دھماکے کے ساتھ اس گھر میں پھیل گیا تھا۔ مزنہ اتنی چپ ہوگئی اتنی ساکت کہ لگتا تھا چھوؤ گے تو دھڑام سے گرے گی، زمین بوس ہو جائے گی، اسے یک دم، کھڑے کھڑے سیکنڈز میں دیمک چاٹ گئی تھی۔

''مزنہ......!'' خولہ نے ڈرتے ڈرتے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے میکانکی انداز میں کندھے پہ دھرے ہاتھ کو دیکھا اور پھر اسی انداز میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ خولہ کا ہاتھ پہلو میں جا گرا...... پھپھو بہ آواز رو رہی تھیں اور وہ سر پکڑے پکڑے صوفے پر ڈھے سی گئی تھی۔

جو تکلیف ہوتی ہے ناں...... چاہے کوئی کتنا ہی پیارا کیوں نہ ہو...... کتنا ہی جان سے بڑھ کر عزیز کیوں نہ ہو...... پھر بھی...... پھر بھی آپ اس بات پہ قدرت نہیں رکھتے کہ اس کے جسم سے تکلیف کشید کے خود کو اس تکلیف کے سامنے پیش کریں۔ نہیں، آپ ایسا نہیں کر سکتے...... یہ جس کی تکلیف، جس کا دکھ ہوتا ہے ناں یہ اسی کو سہنا پڑتا ہے۔ اپنے دکھ خود ہی سہارنے پڑتے ہیں۔ وہ مزنہ کی تکلیف کا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ حتیٰ کہ تسلی کے دو بول بھی اسے جرم محسوس ہوتے تھے اور وہ سب اپنی اپنی جگہ مر چکے تھے، وہ خود میں اتنا حوصلہ نہیں پاتے تھے کہ ایک دوسرے کا کندھا بھی تھپتھپا سکیں۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ غم میں ڈوبے ہوئے تھے اور باوجود اس سب کے وہ مزنہ کو اس دکھ، اس تکلیف سے بچا نہ سکے تھے۔

وہ مزنہ کے کمرے کے باہر کھڑی رہی، پیر چوکھٹ پار کرنے کی جسارت نہ کرتے تھے۔ وہ اس کے پاس جانا چاہتی تھی، اسے تسلی دینا چاہتی تھی، ہر زخم پر شفا والا ہاتھ رکھنا چاہتی تھی مگر...... اپنی ہمت کو ختم پاتی تھی، وہ تھک چکی تھی۔ ہاں...... وہ تھک چکی تھی...... مزنہ سے بھی زیادہ...... اپنی زندگی کی پریشانیاں، مزنہ کی پریشانی، ابو کی پریشانی اور نہ جانے کون کون سی پریشانی...... اور وہ اِک گہری سانس بھر کر پلٹ آئی۔ پورا گھر سکوت میں ڈوبا تھا، اندھیرے کا مسکن بنا ہوا تھا، آج تو کسی کو صحن کی بتی جلانی بھی یاد نہ رہی تھی۔ کیسی نحوست پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا دل گھبرایا اور اس نے سوئچ بورڈز پہ ہاتھ مار مار کر سارے گھر کی بتیاں جلا دیں، سارا گھر روشنی میں نہا گیا لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا...... اس نے عین لاؤنج کے وسط میں کھڑے ہو کر اس چمکتی سفید روشنی کو دیکھا اور بس دیکھنے کی دیر تھی، روشنی اسے چبھنے لگی۔ وہ بھی بری طرح سے...... وہ صحن سے نکل کر آئی اور ساری بتیاں پھر سے بجھا دیں، اندھیرا منحوس لگتا تھا تو روشنی جسم کھسوٹنے لگتی تھی...... کیسی حالت تھی یہ......

اس نے آسمان کی طرف اِک شکوہ بھری نگاہ کی اور پھر جھکا لی۔ مرے مرے قدموں کے ساتھ وہ جھولے پر جا بیٹھی......اس کے بیٹھنے سے جھولے کی حالتِ سکون میں ارتعاش آیا تھا اور وہ عجب بے بسی کے عالم میں سر پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہی۔ باہر صحن میں وہ بے بسی کی تفسیر بنی بیٹھی تھی اندر ایک کمرے میں جہانگیر، ماں کو ہائی بلڈ پریشر کی دوا کھلا رہا تھا۔ دوسرے کمرے میں احمد صاحب نیند کی گولیوں کی تلاش میں تھے اور ان کے ہاتھ میں نیند کی گولیوں کا پتا موجود تھا مگر پھر بھی وہ اسے تلاشتے تھے اور مزنہ......اپنے کمرے میں دروازے کے پٹ کے ساتھ ٹیک لگائے اس حالت میں تھی کہ جسے بیان کرنے کے واسطے لفظ نہ ملتے تھے۔ اس کی ٹانگیں سیدھی تھیں اور وہ اپنے ناخنوں سے، اپنے ہاتھوں پر نقش مہندی کی سرخی کو کھرچتی تھی۔ وہ روتی نہ تھی......ہائے تک نہ کرتی تھی، واویلا نہ مچاتی تھی۔ بھلا وہ کیسے روئے......کیسے ہائے کرے، کیسے مچائے واویلا......وہ تو مجسم خموشی تھی......مجسم خموشی......یوں جیسے ہر اِک گزرتے لمحے کے ساتھ وہ خموشی کی اِک نئی دبیز تہ میں لپٹتی جا رہی تھی۔ دفن ہوئی جا رہی تھی۔ یوں جیسے اب کے بعد کبھی نہ اٹھے گی، کبھی نہ بولے گی، کبھی نہیں......اور اس کا ہاتھ سرخ سرخ مہندی کے نقش کو کھرچتا چلا جاتا تھا، کھرچتا ہی چلا جا رہا تھا۔

☆......☆......☆

سورج نے چڑھنا ہی تھا کہ حکم تھا دن اور رات کے بدلنے کا۔ اور سورج حکم کیسے ٹالے......کہ وہ پابند ہے۔ زمین والوں پہ جتنی بھی بڑی آفت ٹوٹے، کیسی بھی مصیبت آئے، دن کو رات اور رات کو دن میں بدلنا ہی ہے اور اسی تغیر میں ابن آدم کے لیے شفا ہے......جان لو کہ اسی میں شفا ہے، مرہم کا بھید چھپا ہے۔ مؤذن کی آواز نے خولہ کے دل پر چوٹ لگائی تھی۔ اس کا دل بھر آیا۔ وہ گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر اٹھی اور جب لاؤنج میں داخل ہوئی تو وہاں اتنا سکوت، اتنی خموشی، اتنی ویرانی تھی کہ اس کا دل دھک کر کے رہ گیا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ زور سے چلّائے......ایسے کہ یہ سکوت، یہ خموشی، یہ ویرانی چیخ جائے۔

''ابو، پھپھو......'' اس نے بے اختیار آوازیں دیں۔ کمروں کے دروازے کھٹکھٹائے۔ نماز کے بہانے سب کو اٹھاتی رہی اور وہاں سویا ہی کون تھا، سوائے احمد صاحب کے کہ جن کو بالآخر معلوم ہو ہی گیا تھا کہ ہاتھ میں پکڑا پتا ہی مطلوبہ تھا......اور جب اس کا ہاتھ مزنہ کے کمرے کے دروازے کو کھٹکھٹانے لگا تو پھر سے ساکت ہو گیا۔ اس نے بے ساختہ ہونٹوں پر زبان پھیری اور اس کے گلے سے کچھ نیچے اترتا محسوس ہوا، کیسی ہمت چاہیے تھی ناں لکڑی کے اس بے جان پٹ کو دھکیلنے کے واسطے......کیسی؟ خولہ کی آنکھ نم ہوئی تھی اور بالآخر اس نے آہستگی سے پٹ کو دھکیلا۔ قدم اندر رکھا اور لاشعوری طور پر سامنے بیڈ پر دیکھا......اور جیسے ہی دیکھا تو شعور نے اطلاع پہنچائی کہ اس کی بائیں طرف قدموں کے پاس کچھ تھا۔

اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تو......تو مزنہ ابھی تک سرخ مہندی کے نقش کو کھرچتی تھی۔

''مزنہ......'' اس کے لب بے آواز رہے اور دل دھک کر کے رہ گیا۔

''مزنہ......!''اب کہ وہ بولتی ہوئی نیچے بیٹھی تھی۔ بے اختیار آپے سے باہر ہو کر اس نے مزنہ کا ہاتھ ہٹایا تو اپنا ہاتھ ہونٹوں پہ رکھنا پڑا۔ مزنہ کی انگلی کے ناخن تلے......زخم بن چکا تھا اور خون اِک خراش کی صورت میں نظر آ تا تھا۔ واضح نہ ہوتا تھا کہ مہندی کا رنگ کون سا تھا اور......وہ چند لمحے ضبط کی بہترین کوشش کرتی رہی اور پھر اس نے یک دم مزنہ کو سینے سے لگایا تھا۔ اور وہ......اب رو رہی تھی۔ وہ مزنہ کو سختی سے سینے میں بھینچے ہوئے تھی اور مزنہ کے دونوں بازو دائیں بائیں ڈھلکے ہوئے تھے یوں جیسے اسے اب فرق نہ پڑتا ہو۔ فرق محسوس نہ ہوتا......اور خولہ کو اختیار نہ رہا......وہ اپنی آواز کو اونچا ہونے سے روک نہ سکی۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں پر مزنہ بے اثر دِکھتی تھی۔

''خولہ، خولہ کیا کر رہی ہو؟'' وہ جہانگیر تھا جس نے سب سے پہلے آواز کی سمت کا تعین کیا تھا، پر خولہ کو ضبط کہاں......

''خولہ......''اس نے زبردستی ذرا سے غصے کے ساتھ خولہ کو مزنہ سے الگ کیا۔

''دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا......'' جہانگیر برہم ہوا، خولہ کی آواز ردِّ عمل کے طور پر ذرا آہستہ ہوئی تھی۔

''کیا چاہتی ہو کہ ماموں اسپتال جا پڑیں۔ ابھی تو انہیں تمہارا سہارا ہے اور اگر تم یوں ری ایکٹ کرو گی تو ان کا کیا حال ہو گا۔'' جہانگیر کے کہنے کی دیر تھی، اس کی آواز خود بخود دبتی چلی گئی۔ وہ اب منہ پر ہاتھ رکھے، اکڑوں بیٹھی، نم آنکھوں سے مزنہ کو دیکھ رہی تھی۔

''خولہ!'' جہانگیر نے اس کا کندھا ہلایا۔

''میں ٹھیک ہوں، تم جاؤ......میں آتی ہوں جہانگیر۔''اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''شیور؟''اور خولہ نے جواباً گردن ہلائی۔

جہانگیر کے جاتے ہی اس نے مزنہ کو اٹھایا۔ بیڈ پر بٹھایا، اس کے لیے دودھ کا گلاس لائی اور اس ایک گلاس......مزنہ کو پلانے کے لیے اسے کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا۔ مزنہ نے بڑے آرام سے دودھ پی لیا تھا۔ اس سے اگلا کام خولہ نے وہی کیا تھا، جو ایسی کسی بھی صورتِ حال میں کیا جانا چاہیے......اس نے مزنہ کو نیند کی دوا کھلائی تھی۔ خولہ اس کے چہرے کو دیکھتی رہی......بِنا پلکیں جھپکے......ساکت یوں جیسے آنکھ جھپکے گی تو کچھ ہو جائے گا، یہاں تک کہ مزنہ کی پلکیں بھاری ہونے لگیں اور ایک دوسرے سے جڑنے لگیں۔ اور پھر وہ سو گئی تھی، خولہ کے گال پر اک آنسو لڑھک آیا تھا۔

''اب......اب کیا ہو گا؟ کیا......؟ مزنہ کی شادی ہو گی یا......''اور اس یا کے بعد اس کے دل پر ہاتھ پڑتا تھا۔ اور جان جیسے نکل نکل جاتی تھی۔ یہ سوچ بھی تکلیف دیتی تھی اور اگر ایسا ہو گیا تو......؟ تو......؟ تکلیف کا کوئی انت نہ ہو گا، کوئی انت نہ ہو گا۔

☆......☆......☆

وہ محبت تھی اور اس کو گر سارے گھر سے لڑ کر، بھڑ کر سب کی مخالفت مول لے کر بھی شادی کرنا پڑتی تو وہ کرتا۔ اس پر کسی قسم کا دباؤ کارگر ثابت نہ ہو سکا تھا۔ کوئی جذباتی دھمکی کام نہ دکھا سکی تھی......باپ کے عاق کر دینے کے باوجود وہ اپنے ارادے سے ایک انچ بھی نہ ہلا

تھا۔ محبت تھی کوئی مذاق تھوڑی تھا اور گھر والے جس وجہ کو بنیاد بنا کر اس شادی کے مخالف ہوئے تھے وہ اس وجہ، اس بنیاد کو نری جہالت گردانتا...... اک بکواس سے زیادہ کچھ نہ سمجھتا تھا۔ وہ پڑھا لکھا باشعور آدمی تھا اور اوپر سے قطر کی ایک آئل کمپنی میں ملازم تھا۔ وہ ایسی باتوں کی پروا کرتا تو کرتا ہی کیوں...... وہ وجہ، وہ بات اس کے لیے قابل گرفت نہ تھی...... باپ عاق کرتا ہے تو کرتا رہے...... وہ کوئی باپ کا دیا کھاتا تھا؟ اچھی خاصی تنخواہ تھی اس کی اور اسی کے بل پہ وہ اکڑتا تھا۔ پر اس کے ماں باپ...... ہاں ان کے لیے وجہ بہت بڑی ہی تھی جو اس کے لیے معمولی سی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ ذہنیت بدلنے کے لیے اک جنریشن چاہیے تھی۔

''اِک اس کے علاوہ جس لڑکی کے لیے...... جس لڑکی کے لیے تو کہے گا، میں بیاہ لاؤں گی لیکن اس زریل کا خیال دل سے نکال دے۔''

''ماں جی! رزیل ہے اسی لیے تو دل سے نکلتی نہیں......'' وہ ہنس کر کہتا اور ماں جی کے پیر دبانے میں شدت آتی تھی۔ ماں جی وہی پیر اس کے ہاتھوں سے نکال کر زور سے اک لات رسید کرتیں...... مگر وہ جوان توانا خون...... اک ذرا سا جھٹکا کھاتا اور پھر وہ ماں کے پیر کو مضبوطی سے پکڑ لیتا اتنی مضبوطی سے کہ ماں جی چاہنے کے باوجود اسے لات رسید نہ کر سکتی تھیں۔ وہ اور ہنستا...... ماں کو تپ چڑھتی تو وہ بجائے اسے ڈانٹنے کے اس کی محبوبہ کے دائیں کندھے والے فرشتے کو ایکٹو کر دیتی تھیں۔ وہ ان کوسنوں، طعنوں اور بددعاؤں پہ ہنس دیتا۔

''ان میں سے ایک بھی...... ماں جی ایک بھی طعنہ، کوسنا یا بددعا اسے لگنے والی نہیں ہے، مظلوم ہستی ہے ماں جی وہ...... کچھ تو خیال کریں۔'' اس کی سائیڈ لیتا وہ یقین سے کہتا تو ماں کو اور غصہ چڑھتا...... اس کے ہاتھ زور زور سے پیر دباتے رہتے اور ماں کی زبان تیز تیز چلتی ہوئی بددعائیں فائر کرنے والی اِک مشین بن جاتی۔

''تم معاملہ سدھارنے کے بجائے اور بگاڑ دیتے ہو...... کیوں تاؤ دلاتے ہو ماں جی کو......؟'' اس معرکے پہ اس کی بہن سیخ پا ہو کر باہر نکلتی اور ناک کے نتھنے پھلا کر بے حد برہم ہو کر کہتی۔

وہ سنتا اور ہنس دیتا۔ اور اس کی تو عادت تھی ہنسنا...... ہنسنے والی بات پہ ہنسنا...... اور رونے والی بات پر بھی ہنسنا...... وہ اکثر سوچتا کہ یہ ماں باپ بھی کیا ہوتے ہیں...... اپنے منہ کا نوالہ کھلا دیتے ہیں، اپنی ہڈیوں کو گھسا دیتے ہیں، جان مار دیتے ہیں اور گر ضرورت پڑے تو وار بھی دیتے ہیں۔ قدم قدم انگلی پکڑ کر چلنا سکھاتے ہیں، بچوں کو سلانے کے لیے اپنی نیندیں حرام کر لیتے ہیں، ایک بار بلاؤ دس دفعہ ''جی'' کرتے ہیں...... لیکن اولاد کو اپنی مرضی سے اِک فیصلہ نہیں کرنے دیتے۔ پسند کی گیم، پسند کی آئس کریم فلیور، پسند کے کپڑے، پسند کے جوتے، پسند کا اسکول بیگ، پسند کی ٹائی، شرٹ، جینز، سب کچھ مگر پسند کی ''زندگی'' نہیں، کیوں، کیوں؟ کیوں؟ ٹھیک ہے ان کا تجربہ ہے، ان کا مشاہدہ ہے مگر ضروری تو نہیں کہ ہر اولاد غلط فیصلہ ہی کرے اور بالفرض کر بھی لے تو کیا؟ کیا انہوں نے زندگی میں اپنی جوانی میں سارے فیصلے ٹھیک کیے تھے؟ کیا انہوں نے کبھی کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا تھا؟ یہ تو پھر محبت نہ ہوئی...... حکمرانی ہو گئی ناں، ہاں بھئی ہم نے تمہیں پالا، جوان کیا، اک عمر کھپائی تم پر...... چلو اب احسان اتارو، بدلہ چکاؤ، تاوان بھرو۔ وہ سر جھٹک دیتا اور اس کا ارادہ کچھ اور مضبوط ہو جاتا۔

''شادی کروں گا تو اسی سے اور وہ بھی آپ دونوں کی مرضی سے، رضامندی سے...... بھگا کر لے جانے والا میں نہیں...... میں مرد ہوں کوئی نامِ کی تو نہیں جورات کے اندھیرے میں نقب لگاؤں۔'' تو یہ طے تھا...... اسے اپنی پسند سے ہی شادی کرنا تھی اور وہ بھی ماں اور باپ کی رضامندی سے۔ فی زمانہ ایسا کبھی ہوا تو نہیں، تو دیکھیے اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے بھلا کیا......؟

☆......☆......☆

وہ قدیم طرز پہ بنا اِک جدید گھر تھا، جس کا لاؤنج گولائی میں تھا، وہاں بہت سی، قطار کی صورت دیوار کی گولائی میں نصب آبنوسی کھڑکیاں تھیں۔ سورج کب کا چڑھ چکا تھا اور روشنی ان آبنوسی کھڑکیوں سے چھن چھن کر اندر آ رہی تھی اور اس گول کمرے کو روشن کرنے کا باعث بن رہی تھی۔ جاتی سردی کے دن تھے اور اب وہ ایک چمکیلا گرم دن ثابت ہونے جا رہا تھا۔ سورج کی روشنی تو یہی اعلان کرتی تھی۔ لاؤنج دو حصوں میں منقسم نظر آتا تھا۔ ایک حصہ سٹنگ ایریا تھا جبکہ دو حصوں میں تقسیم کرتے نیٹ کے پردوں کے پار ڈائننگ ٹیبل رکھی تھی۔ کھڑکیوں کے قریب......سورج کی تمازت سے ہلکی سی خنکی اب رخصت ہونے کے واسطے بالکل تیار تھی۔ وہ ڈائننگ ٹیبل کی کرسی گھسیٹے اس کی بیک سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر روشنی اک گرم سا احساس چھوڑ رہی تھی جو کہ فی الوقت بھلا محسوس ہوتا تھا۔ تمازت آنکھوں کو اک راحت کا احساس بخشتی تھی۔ اس گھر کا کچن آج روزمرہ کے صبح کے معمول سے عاری تھا۔ پراٹھوں کی اٹھتی مہک، برتنوں کے کھٹکنے کی اٹھا پٹخ کی آواز، ابلتی چائے کی خوشبو اور نہ ہی ایسی کوئی آواز......

''ابو جی ناشتا کرلیں......پھپھو آپ کے لیے دلیا بنا دوں یا پھر جہانگیر تم کیا لوگے؟ پراٹھا یا توس......؟''

چولھا ٹھنڈا تھا اور ویرانی کو سورج کی روشنی بھی کم نہ کر پائی تھی۔

''خولہ......!'' اس نے اپنے کندھے پر اک ہاتھ کی گرمی محسوس کی اور نرم سے لہجے میں اسے پکارا گیا تھا۔

اس نے چونکے بنا......آنکھیں کھولیں اور گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے حد نرمی تھی۔ اتنی کہ آج سے پہلے کبھی نہ دیکھی گئی تھی۔ وہ اس کے دیکھنے پر......اس کے کندھے کو تسلی سے تھپتھپاتا، اس کے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا تھا۔ خولہ اب اپنی گود میں رکھے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ جہانگیر چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ اور پھر ایک گہری سانس بھر کر اس نے زاویۂ نگاہ بدلا اور باہر پھیلتی روشنی کو دیکھنے لگا۔

''اب کیا ہوگا جہانگیر......؟'' اس کی آواز اتنی شکستہ، اتنی دکھ سے پُر تھی کہ جہانگیر کو نظر پھیر کر اسے دیکھنا پڑا تھا۔

''ہم مزنہ کی شادی وہاں نہیں کریں گے۔'' وہ توقف کے بعد مضبوط لہجے میں بولا تھا۔

''جہانگیر......!'' اور خولہ کا ہاتھ دل پر جا پڑا اور وہ وحشت زدہ دکھتی تھی۔ بے ساختہ اس نے ہونٹوں پہ زبان پھیری تھی۔

''مگر جہانگیر یوں......اچانک شادی سے چند روز قبل، اس طرح سے رشتہ ختم کرنا......'' وہ بات نہیں کرتی تھی، ہکلاتی تھی۔

''اُف......'' اس نے تکلیف سے آنکھیں بند کیں...... جہانگیر خموش رہا اور اسے دیکھتا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ خولہ بات مکمل کرلے۔

''زبانیں زہر اگلیں گی جہانگیر...... کتنی ذلت، کتنی سُبکی ہوگی اور ابو، وہ...... وہ کیا کریں گے۔'' اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور حلق کو کچھ کاٹتا تھا۔

''خولہ......!'' جہانگیر نے ذرا سا جھک کر اس کو دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے اور جب وہ خولہ کہتا تھا تو پکار میں مضبوطی ٹھاٹھیں مارتی تھی۔

''ہاں، میں مانتا ہوں، یہ ہوگا، یہ سب ہوگا شاید اس سے بھی بدتر ہو جتنا تم سوچ رہی ہو، مزنہ کو ہوسکتا ہے اِک لمبے عرصے کے لیے مشکلات کا سامنا کرنا پڑے لیکن اس سب کے باوجود میں دُہرا رہا ہوں، ہاں اس سب کے باوجود...... مزنہ کی زندگی اتنی غیر اہم نہیں کہ اسے ایک ایسے شخص کے حوالے کر دیا جائے جس میں جرأت نہ ہو اور اس شخص کے ساتھ زندگی اِک آزمائش سے زیادہ اور کچھ نہ ہو۔ مزنہ کا مزاج میں جانتا ہوں، وہ یہ نہیں کر سکے گی، اسے کمپرومائز نہیں کرنا آتا خولہ...... وہ نباہ نہیں کر سکے گی تو کیوں اس کی زندگی کو داغدار کیا جائے...... یہ چند روز کی پریشانی ہے اور شادی کی صورت ساری عمر کا بھگتان...... تھوڑا سا حوصلہ...... زندگی کبھی اِک نقطے پر نہیں رکتی خولہ، وقت جب بدلتا ہے تو مرہم ہو ہی جاتا ہے۔'' وہ اس کا ہاتھ تھامے، اتنی نرمی، اتنے خلوص سے کہہ رہا تھا کہ وہ جہانگیر نہ لگتا تھا، وہ کوئی اور دکھتا تھا۔ وہ حیرانی سے اسے تکتی رہی۔

''جہانگیر ٹھیک کہہ رہا ہے خولہ......'' اپنی پشت پر اس آواز کو سن کر وہ چونکی...... چونکا تو جہانگیر بھی تھا۔ اس نے بے اختیار خولہ کے ہاتھ چھوڑے تھے اور خولہ بے اختیار ہو کر اٹھی تھی۔

''ابو......'' اس کے لب بے آواز ملے اور وہ فوراً انہیں سہارا دینے کے واسطے اٹھی تھی۔ اس صبح کو وہ اتنے بوڑھے دکھتے تھے جیسے عمر کی آخری حد تک پہنچ چکے ہوں۔ خولہ نے آہستگی سے ان کا ہاتھ تھاما اور ڈائننگ ٹیبل کی کرسی گھسیٹ کر انہیں بٹھایا تھا۔ چند لمحوں بعد فرخندہ بھی وہیں آ چکی تھیں اور ان چاروں نفوس کے چہروں پر خموشی اپنا رقص پیش کر رہی تھی۔ وہ چاروں چہرے جیسے خموشی کے پیروں تلے تھے۔ ان کے چہرے جیسے خموشی کے لیے ایک اسٹیج بن گئے تھے۔

''میں مزنہ کی شادی کبھی ایسے شخص سے نہیں کروں گا۔'' احمد صاحب اِک لمبے وقفے کے بعد بولے تھے۔

''مگر بھائی صاحب......!'' فرخندہ اپنے تحفظات بیان کرنے لگیں اور ان کے تحفظات بھی کم و بیش وہی تھے جنہیں خولہ پہلے ہی دُہرا چکی تھی۔

وہ عورتیں تھیں، سمجھو تا انہیں آسمانوں سے دے کر اتارا جاتا ہے اور وہ مرد...... مضبوطی اور خطرناک فیصلے کرنا ان کی پہچان اور شان بھی۔

''نہیں فرخندہ، کچھ بھی ہو...... مزنہ کی شادی اب عزیز سے نہیں ہوگی۔'' اور ان کے کندھے چاہے جتنے بھی جھکے ہوئے تھے، وہ اپنی عمر سے چاہے جتنے بھی زیادہ بوڑھے اور شکستہ نظر آتے تھے مگر لہجہ ان کا ایک توانا مرد کا ہی تھا۔

”مزنہ کی شادی نہیں ہوگی......میں انکار کر رہا ہوں۔“

”اور میں آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گی ابو......“

اور وہ سب بری طرح چونکے اور چونک کر، مڑ کر استعجاب سے پُر نظروں کے ساتھ اس آواز کی سمت دیکھا تھا۔ وہ مزنہ تھی جو کہ سرخ چہرہ لیے، کسی مرد کے سے ہی مضبوط لہجے میں بولی تھی۔

☆......☆......☆

اس نے کھلے دروازے پر انگلی کی پشت سے ٹک ٹک کیا۔ مس مفتی نے چونک کر سر اٹھایا۔

”مسز جہانگیر......! آئیں ناں اندر آئیں......“ انہوں نے خوش دلی سے کہا تھا۔ خولہ سست روی سے چلتی ہوئی اندر آئی تھی اور جب تک وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھی مس مفتی کو کچھ غلط ہونے کا احساس ستاتا رہا۔ اس کا چہرہ......؟ پرسوں تک تو وہ خاصی خوش نظر آ رہی تھی مگر اب......چند لمحے اس خموشی کی نظر ہوئے تھے۔ وہ سر جھکائے مغموم دکھتی تھی اور مس مفتی کی نظریں اس آزردگی کا سراڈھونڈتی تھیں۔

”ایوری تھنگ از فائن مسز جہانگیر؟“ کسی خدشے کی بنا پر انہوں نے پوچھا۔

”مجھے کچھ دنوں کے لیے آف چاہیے مس مفتی......“ ایک گہری سانس بھر کر سر اٹھاتے ہوئے وہ بولی تھی۔

”آپ کی بہن کی شادی ہے......اس میں اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں......آف لینا آپ کا حق ہے۔“ وہ کہہ رہی تھیں اور خولہ کا دل کسی انجانے، ان دیکھے شکنجے میں جکڑتا جا رہا تھا۔

”شادی کے لیے اب میں آپ کو منع تو نہیں کر سکتی ناں......“

”مس مفتی......!“ اور اس نے اچانک انہیں ٹوکا تھا۔

”میری بہن کی شادی......کینسل ہوگئی ہے......“ اس نے بوجھل لہجے میں کہا تھا۔

”اوہ......“ وہ یک دم سناٹے میں رہ گئیں۔

”کیوں......؟“ اگلا سوال فطری ردِّ عمل کی غمازی تھا۔

وہ انہیں بتانے لگی۔

”میرے خدا......آئی ایم سوسوری مسز جہانگیر......سوسوری......مجھے ذرا سا بھی اندازہ ہوتا تو میں......“

”ارے نہیں مس مفتی......آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں......اس کے تو گھر والے بھی لاعلم تھے۔“ اس نے نرمی سے انہیں مزید کچھ کہنے سے روکا۔ وہ کتنی دیر منہ پر ہاتھ رکھے افسردہ سی بیٹھی رہیں۔

”اللہ بہتر کرے گا۔ وہ مسبب الاسباب ہے۔ اسی میں کوئی بہتری ہوگی۔“ خولہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر انہوں نے تسلی دی تھی۔

اس نے نیم دلی سے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ انہوں نے پھر اس سے دوبارہ پوچھا نہیں تھا کہ جب شادی نہیں ہو رہی تھی تو وہ آف کس بات کا

http://kitaabghar.com

لے رہی ہے......وہ اچھی طرح سمجھ سکتی تھیں کہ وہ کس وجہ سے آف لے رہی تھی، خولہ گھر کے ٹینس ماحول سے بھاگی تھی۔ وہ مزید سہہ نہیں سکتی تھی۔ اس نے سوچا گھر سے نکلے گی تو ذہن کچھ ریلیکس ہوگا مگر اسکول آکر ہوا کیا......ساتھی ٹیچرز نے فنکشنز، عروسی ملبوسات اور اسی طرح کے دوسرے سوال پوچھ پوچھ کر اسے زچ کر دیا تھا۔ وہ بے طرح سے گھبرائی تھی، اس سے بہتر تھا وہ آف ہی لے لیتی۔ وہ ابھی سب کو کچھ بھی بتانے سے گریز کر رہی تھی اور وجہ تھی مزنہ......وہ عزیز سے شادی کرنے پر بضد تھی۔

☆......☆......☆

''مزنہ......اللہ کا واسطہ ہے تمہیں......خدا کے لیے ہم پہ رحم کھاؤ۔'' وہ اتنی تنگ آئی تھی کہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر رو پڑی۔

مزنہ ایک دم گھبرائی تھی۔

''آپی پلیز......!'' لہجہ التجائیہ تھا۔ ''آپ کیوں نہیں سمجھتیں......مجھ سے نہیں ہوگی پھر سے وہ پریڈ اور شادی سے چند روز قبل...... شادی ٹوٹنے کا مطلب جانتی ہیں ناں آپ......؟ میری مشکلات میں اضافہ نہ کریں، میں پال لوں گی اس کی اولاد کو۔'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

''تم نہیں پال سکو گی مزنہ......'' خولہ نے بھڑک کر اس کی بات کاٹی تھی۔ ''نری جذباتیت ہے یہ......آج جذبات میں آکر پھندا اپنے گلے ڈال لو گی اور کل کو جب دم گھٹنے لگے گا پھر ہمیں الزام دو گی، میں تو ناسمجھ تھی۔ آپ لوگ تو سمجھ والے تھے......بس کرو مزنہ، عزیز اس دنیا کا آخری مرد نہیں ہے۔ جو تم اتنا بڑا اقدم اٹھانے جا رہی ہو۔'' خولہ کی سانس ہموار نہ رہی تھی۔ اسے بے حد غصہ آیا تھا۔ وہ ہمیشہ خود کا ہی کیوں سوچتی تھی۔ کیا ابو کی حالت اسے نظر نہیں آتی تھی۔ گر اتنا ہی آسان ہوتا جتنا وہ کہہ رہی تھی تو ابو سب سے پہلے اس آسان حل کو سمجھنے والے ہوتے......جب وہ خود انکار کر رہے تھے تو وہ کیوں مری جا رہی تھی۔ مزنہ چند لمحے خموش رہی اور خولہ کو دیکھتی رہی۔

''یہ میری زندگی ہے آپی......! اور اس میں فیصلے کرنے کا اختیار صرف مجھ کو ہے......آپ لوگ اپنی اپنی مرضیاں اور اپنی من مانیاں مجھ پر مت تھوپیں......مجھے عزیز سے ہی شادی کرنی ہے۔ میں لوگوں کی باتیں سن سکتی ہوں اور نہ برداشت کر سکتی ہوں۔ میرے لیے اس شادی کے بعد کی مشکلات سہنا زیادہ آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ میں خود کو، اپنے وجود کو لوگوں کی اٹھتی اور زہریلی زبانوں کے لیے چھوڑ دوں......سوری اگین آپی......آپ، ابو کو بتا دیجیے گا۔'' وہ اتنے ٹھوس اور بے حس انداز میں کہہ رہی تھی کہ خولہ کو سانس روک کر اسے سننا پڑا تھا۔ وہ شاک سے اسے دیکھ رہی تھی کہ یک دم پشت پر کھٹکا ہوا تھا......وہ دونوں ہی چونک کر متوجہ ہوئیں۔ کسی نے دروازہ کھولا تھا۔

''خولہ......!'' وہ جہانگیر تھا اور ضرورت سے زیادہ سنجیدہ دکھتا تھا۔

''عزیز کے گھر والے آئے ہیں۔'' جہانگیر کے منہ سے نکلا ہوا جملہ......محض جملہ ثابت نہ ہوا تھا۔ وہ اک دھماکہ ثابت ہوا تھا۔ اس نے بے اختیار مزنہ کو دیکھا اور مزنہ کی آنکھیں اس کے چہرے کے تاثرات، اس کی باڈی لینگویج یہی کہتی تھی کہ ''انہیں انکار نہیں، ہرگز، ہرگز بھی نہیں......''

☆......☆......☆

عزیز کے گھر والوں کا آنا...... یہ اتنی غیر متوقع بات تھی کہ کوئی بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اب اگر کیا جائے تو کیا کیا جائے۔ وہ اب کیا کرنے، کیا کہنے آئے تھے۔ جب سب کچھ واضح تھا، طے نظر آتا تھا تو اب...... اب کیوں...... آئے تھے وہ لوگ......؟ کیا وہ سمجھوتے کی بات کرنے آئے تھے تو ہرگز نہیں...... احمد صاحب کسی بھی قسم کا کوئی بھی سمجھوتا کرنے پر تیار نہ تھے۔ کوئی ایک دو دن کی بات ہو تو برداشت کو آواز دے لے انسان...... ساری عمر، ساری عمر کا معاملہ تھا اور سمجھوتا کوئی بہترین حل نہ نظر آتا تھا، نہیں ایسا تو وہ کرنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے ہی جہانگیر کو خولہ کو بلانے کا کہا تھا اور خولہ جہانگیر کی بات سن کر اس کی تو جیسے ساری سمجھ ہی رخصت ہو گئی تھی۔

''خولہ...... چلو...... ماموں تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔'' جہانگیر نے اسے پیچھے آتے نہ دیکھ کر کہا۔

''آ رہی ہوں......'' اس نے قدم بڑھائے مگر یک دم ٹھٹک کر رکی تھی۔ اور رکنے کی وجہ...... مزنہ بنی تھی۔ اس نے خولہ کا ہاتھ پیچھے سے تھام کر اسے روکا تھا۔

''شٹ اپ مزنہ جسٹ شٹ اپ......'' اس نے بری طرح سے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

''اور خبردار...... خبردار جو تم اس کمرے سے باہر نکلیں...... تمہاری بات میں نے سن لی ہے اور ابو تک بھی پہنچا دوں گی۔ بار بار مت دہراؤ......'' مشتعل ہو کر کہتے ہوئے، وہ بل کھا کر پلٹی اور مزنہ کے تقریباً منہ پر ہی زور سے دروازہ بند کیا تھا۔ مزنہ کی آنکھوں میں بے اختیار نمی ابھری، بلند ہوئی اور اب وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

☆......☆......☆

جیسے ہی اس نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا تو تناؤ کسی ناگوار بدبو کی طرح ماحول میں پھیلا تھا۔ وہ محسوس کر سکتی تھی اور دیکھ بھی سکتی تھی۔ ابو کا چہرہ خطرناک حد تک سنجیدہ دکھتا تھا۔ جہانگیر کی پیشانی پر کئی بل تھے اور وہ ناک تک بھرا بیٹھا تھا اور پھپھو...... وہ عورت تھیں، مروت دکھلانے کی ایسی کوئی ضرورت انہیں نہ تھی اس کا چہرہ شدید ناگواری کا نیون سائن بنا ہوا تھا۔ جیسے ابھی کہ ابھی وہ ان آنے والے مہمانوں کی تواضع، بےعزتی سے کرنے والی تھیں۔۔ خولہ نے پست آواز میں سلام کیا اور خموشی سے ہاتھ میں پکڑی ٹرے سینٹرل ٹیبل پر رکھی تھی۔ اخلاقیات بھی کوئی چیز ہوتی ہے آخر...... وہ انہیں اب مشروب سرو کر رہی تھی۔

''شکریہ بیٹے......!'' عزیز کی امی نے دھیمے لہجے میں کہا جب اس نے انہیں گلاس پکڑایا تھا۔ سرو کرنے کے بعد وہ بھی وہیں بیٹھ گئی تھی۔ ماحول پر اب اِک بھاری، بوجھل خاموشی تھی کہ جس کا بوجھ کندھوں پر پڑتا محسوس ہو رہا تھا۔ ان سب کے لیے ہی بات شروع کرنا اِک عذاب کی طرح تھا۔

''بھائی صاحب! آپ کو یقین آئے نہ آئے مگر ہم بھی آپ کی طرح ہی لاعلم تھے۔''

''ٹھیک ہے مان لیا کہ آپ لاعلم تھے بچے کے وجود سے مگر پیپر میرج سے تو آپ لاعلم نہیں تھے ناں۔ وہ کیوں چھپائی ہم

سے......؟'' وہ جہانگیر تھا جس نے اتنے ترش لہجے میں عزیز کی امی کی بات کاٹی تھی کہ سب اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے......اور عزیز کی ماں......ان کا رنگ فق ہوا تھا۔ مہ جبیں نے بے اختیار ہونٹوں پر زبان پھیر کر انہیں دیکھا۔

''اس کے قصوروار ہیں ہم......مگر......'' وہ مدھم لہجے میں بولیں لیکن بات مکمل نہ کر سکیں۔

''ہم آپ سے مزید کوئی بدمزگی نہیں چاہتے تھے اور......''

''آنٹی پلیز......! ابھی آپ لوگ چلے جائیں۔ ہمیں کچھ وقت دیں......تھوڑا سا وقت ایک بہترین فیصلہ کرنے کے لیے......''

وہ خولہ تھی جس نے احمد صاحب کو کوئی اور بات کہنے سے روکا تھا۔ احمد صاحب، جہانگیر اور فرخندہ......وہ سب اتنی حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو وہ سٹھیا گئی ہو جیسے......

''بہت شکریہ بیٹے......امید ہے کہ آپ لوگ اچھا ہی فیصلہ کریں گے۔'' مہ جبیں کی امی اٹھتے ہوئے بولی تھیں۔ مہ جبیں نے بھی ان کی پیروی کی اور چند لمحوں بعد وہ دونوں چلی گئی تھیں۔

''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟ کیوں انہیں آس دلا کر بھیجا ہے جب طے ہے کہ انکار ہی کرنا ہے تو؟'' جہانگیر ان لوگوں کے اٹھتے ہی خولہ سے مخاطب ہوا تھا۔ لہجہ برہم، انداز خفا خفا......

''دماغ میرا نہیں......مزنہ کا خراب ہوا ہے جہانگیر......وہ اس......وہ شادی پر بضد ہے ابو۔'' جہانگیر کو جواب دے کر رخ موڑ کر اس نے احمد صاحب سے کہا......فرخندہ کا منہ کھلا اور احمد صاحب نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ وہ اتنی حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھتے تھے جیسے دنیا کی سب سے انہونی بات ہو گئی تھی۔ خولہ تھک کر ڈھے پڑنے والے انداز میں صوفے پر بیٹھی تھی کہ ان نظروں کی حیرت کا علاج اور جواب......دونوں ہی اس کے پاس نہیں تھا۔

مزنہ ایک بار پھر سے مسئلہ بن کر سامنے آئی تھی۔ اور اب کی بار یہ سنگین صورتِ حال تھی۔

☆......☆......☆

اس نے بے حد حیران ہو کر وہ کاغذ کا ٹکڑا پکڑا تھا۔ وہ اتنا حیران ہوا تھا کہ چند لمحوں تک سمجھ ہی نہیں پایا کہ سامنے کھڑی لڑکی اس سے کیا کہہ رہی تھی۔ اور جب بانو نے اسے بت بنا کھڑا دیکھا تو گھبرائے سے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اس نے کاغذ کا وہ ٹکڑا......اس کے ہاتھ میں زبردستی تھمایا تھا۔ اسے کسی کے آجانے کا خدشہ تھا۔ اس کے بعد وہ تیزی سے پلٹی اور تیز قدموں کے ساتھ ہی اس سے دور ہوتی چلی گئی۔ وہ اس کی رنگین چادر کے پلو کو پھڑ پھڑاتا ہوا دیکھتا رہا جو کہ اس کی تیز چال کی وجہ سے اڑا جا رہا تھا۔ اس کے دور جاتے ہی اس نے ایک بار پھر ہاتھ میں پکڑے کاغذ کو دیکھا اور ایک بار پھر سے وہ خود کو حیران ہونے سے روک نہ پایا تھا۔ ''یہ......یہ......یہ اس نے بھیجا تھا۔ اپنی کسی کزن کے ہاتھ......'' یہ اس کے لیے کسی بدترین دھچکے سے کم نہ تھا۔ وہ ایسی کسی کوشش کی توقع کم از کم اس سے نہیں کر رہا تھا۔

”آ......“اس نے دونوں بازو ہوا میں پھیلائے...... ”ہو“ کر کے سانس باہر پھینکی۔

”یہ...... یہ کیا تھا؟“ اسے اپنے ماتھے پہ پسینہ آتا محسوس ہوا تھا۔ ان دونوں کا تعلق ایسا تو نہ تھا۔ اس نے اسے پسند کیا تھا۔ رشتہ کرنے کی بات کی تھی جو بھی تھا یکطرفہ...... ایسا کوئی خط، پتر جیسا تعلق تو کبھی نہ تھا۔ وہ بددل ہوا تھا، اک لمحے کے لیے۔ وہ ایسی تو نہ تھی۔ شاک پہنچا تھا اسے یقین نہیں آتا تھا مگر ہاتھ میں پکڑا وہ کاغذ...... یقین کے تھپڑ اسے مارتا تھا۔ بالآخر اس نے کاغذ کو کھول ہی لیا تھا۔ اس کی نظریں سطروں پر دوڑنے لگیں...... اس کا دل دھڑک اٹھا تھا، کیا یہ اقرار نامہ تھا...... اظہار نامہ تھا یا کیا......؟ اور جو وہ تھا اس نے اس کا دماغ بھک سے اڑا دیا تھا...... وہ ایسی کسی بات، ایسے الفاظ کی توقع نہیں کر رہا تھا کہ دنیا کی پہلی بات نہیں تھی تو یہ آخری بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ کتنی ہی دیر منہ کھولے اس ”نامے“ کو دیکھتا رہا۔

”ہیں...... یہ کیا تھا؟“ اس خط میں اسے منع کیا گیا تھا کہ ”وہ“ اس کے رشتے کے لیے اپنی کوششیں ترک کر دے۔ مزید یہ کہ وہ اس کے لیے موزوں نہیں تھی، اس کی ”محبت“ اس کے لیے محض مشکلات کا باعث بن رہی ہے۔ کتنی ہی دیر وہ اس کاغذ کا کونا ہونٹوں میں دبائے حیران پریشان کھڑا رہا۔ اتنے عرصے سے یہ بات چل رہی تھی۔ پسندیدگی کی بات اس کے خاندان میں بھی پھیل گئی تھی اور سب کو معلوم تھا کہ اس کی اماں مان کر نہیں دے رہی تھیں۔ ایسا پہلے تو نہیں ہوا تھا۔ کیا ہوا تھا ایسا...... کیا؟ کہ اسے یوں...... اس سے رابطہ کرنے اور اسے پیچھے ہٹنے کی تلقین کرنا پڑا تھی۔ وہ الجھا اور بری طرح سے الجھا۔ ایسا کیا ہوا تھا، کیا ہو گیا تھا۔ اسی الجھن کے ساتھ وہ گھر آیا اور جیسے ہی گھر آیا تو اس کی بہن اس کا بازو پکڑ کر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتی ہوئی ایک طرف لے گئی تھی۔

”کیا ہوا؟“ اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

”ماں جی آج اس کے گھر گئی تھیں...... اور اس کے ساتھ ہی اس کی بہن نے آنکھ اور بھوؤں سے اشارہ کیا تھا اور وہ اچھی طرح سمجھ گیا کہ وہ کس کے گھر گئی تھیں۔

”کیوں......؟“ حیرت سے پُر مگر دھیما لہجہ......

”اتنی بے عزتی کی ہے، اتنی بے عزتی کہ بس...... اتنی باتیں سنائی ہیں کہ کیا بتائیں......؟“ بہن اسے بتا رہی تھی اور اس کی جیب کے اندر والٹ میں رکھے کاغذ کے الفاظ جیسے بولنے لگے، پھڑ پھڑانے لگے تھے۔ ساری الجھن رفع ہو گئی تھی اور خط بھیجنے کی حرکت بھی جیسے بہترین طریقے سے جسٹی فائیڈ ہوئی تھی۔

”ماں جی...... نے ایسا کیا؟“ وہ یوں بولا جیسے ماں سے اس انتہائی قدم کی توقع وہ مر کر بھی نہیں کر سکتا تھا۔

”کیوں کیا ایسا......؟“ اس نے سوال کیا۔

”کیوں سے کیا مطلب ہے بھائی، ضد کرو گے تو...... یہ تو ہو گا ہی......“ بہن اس کے بچگانہ سوال پر مسکرا کر بولی تھی۔

http://kitaabghar.com

"یہ ٹھیک نہیں ہوا، بے حد غلط بات ہے یہ......انتہائی نامعقول حرکت ہے یہ...... ماں جی کو جو کہنا ہے مجھے کہیں اس کی اور اس کے گھر والوں کی یوں بے عزتی کرنا......" اور اس نے تف کے سے انداز میں سر جھٹکا تھا۔

"تم ہی ضد چھوڑ دو بھائی......" بہن نے چند لمحوں کے توقف کے بعد اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر ملتجی لہجے میں کہا تھا۔"

ضد ہوتی تو چھوڑ دیتا، میں کیا کروں......کیا کروں کہ یہ ضد نہیں ہے۔ بے غیرت دل کا مسئلہ ہے۔" آخری جملہ اس نے منہ ہی منہ میں کہا تھا۔ اسے جیسے خود پر بے طرح غصہ آیا تھا۔

"وہ اس گھر میں آ گئی تو تم سوچ سکتے ہو نا کہ کیا ہو گا؟ کیا کبھی سوچا تم نے کہ تم کیسی زندگی اسے دو گے......؟ خود تو تم قطر چلے جاؤ گے اور وہ پیچھے سے ماں جی کے ہاتھوں اور زبان پر ہو گی۔ زندگی اتنی پیچیدہ ہو جائے گی کہ......"

"اسے یہاں چھوڑ کر جائے گا کون......؟" اس نے بہن کی بات کاٹی تھی۔ اور بہن ایک دم نہ سمجھ سکی اور جب سمجھی تو ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر حیرت سے اسے دیکھا۔

"یعنی کہ ایک اور رولا......ایک اور مسئلہ......" وہ حیرت سے بولی۔

"بھائی ماں جی تمہیں کھا جائیں گی......" اور وہ ہنس دیا......کھل کر......زور سے......ایک بھرپور مردانہ قہقہہ لگا کر۔

"فکر نہ کرو......میں ماں جی سے اس بار کھل کر اور بالکل صاف صاف بات کروں گا، وہ نہیں تو اور کوئی بھی نہیں......کوئی بھی نہیں......اس نے اتنے مصمم ارادے اور اتنے مضبوط لہجے میں کہا تھا کہ وہ دہل کر رہ گئی تھی۔ یہ اونٹ آخر کس کروٹ بیٹھے گا۔ آخر کس کروٹ......؟

☆......☆......☆

وہ جیسے ہی فون کریڈل پر رکھ کر پلٹے......ساکت رہ گئے تھے۔ وہاں مزنہ کھڑی تھی اور وہ اتنی حیرانی سے اسے انہیں دیکھ رہی تھی کہ احمد صاحب کو عجیب محسوس ہوا......اس کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں......لبریز تھیں۔

"ایسا کیوں کیا آپ نے ابو......؟ کیوں؟" اور پانی جھلک گیا...... بہہ گیا۔ احمد صاحب دو قدم آگے بڑھے۔ ایک نظر اسے دیکھا۔ اس کا سر شفقت سے تھپتھپایا اور آگے بڑھ گئے اور مزنہ......وہ وہیں ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ کر نیچے بیٹھتی چلی گئی تھی۔ چند لمحوں بعد اس کے رونے کی آواز سے گھر کی دیواریں ہل گئی تھیں۔ خولہ ننگے پیر بنا دوپٹے کے دوڑی۔

"یا اللہ خیر......!" فرخندہ بھی حواس باختہ ہوئیں......اور جہانگیر اس وقت گھر نہ تھا۔ اور مزنہ......وہ اسی طرح سے روئی تھی جیسے کوئی مر گیا تھا۔

"مزنہ......مزنہ کیا ہوا ہے......کیا؟" خولہ نے اسے دونوں بازوؤں میں بھرتے ہوئے سیدھا کیا لیکن وہ روئی جا رہی تھی۔

http://kitaabghar.com

''بتاؤ تو سہی......آخر ہوا کیا ہے؟'' خولہ نے اس کا چہرہ سیدھا کیا، تھپتھپایا اور پوچھا۔

''ابو......ابو نے......انکار کر دیا......آپی......'' ہچکیوں میں اس نے بات مکمل کی اور خولہ کے اندر اٹھتے وہموں کے تھپیڑوں پہ ایک دم برف گری تھی۔ وہ سن ہو کر رہ گئی تھی۔ باوجود اس کے کہ وہ جانتی تھی کہ ایسا ہی ہونا تھا۔ باوجود اس کے کہ یہ ہی طے تھا پھر بھی یوں محسوس ہوا تھا کہ جیسے کسی نے دل نکال لیا تھا۔ اس نے کچھ اور مضبوطی سے اسے بازوؤں میں جکڑا تھا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا مزنہ......سب ٹھیک......'' اس کا سر چومتے ہوئے اس نے کہا۔

''کیا ہوا......؟'' فرخندہ حواس باختہ، گھبرائی ہوئی آئی تھیں۔ خولہ نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں واپس جانے کا کہا۔ وہ ٹھٹکیں......رک کر ان دونوں کو دیکھا۔ خولہ نے پھر سے انہیں واپس جانے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ بادل نخواستہ مڑ گئیں تھیں اور اب وہاں بے قابو ہوتی، تڑپتی مچلتی مزنہ تھی اور اسے اپنے بازوؤں میں جکڑے......اس کے سر پر ہونٹ رکھے اسے سنبھالے ہوئے خولہ تھی، جس کے اپنے آنسو کہیں اندر کسی گھپاہ میں ٹپ ٹپ گرتے تھے، نظر نہ آتے تھے۔ بالکل بھی نظر نہیں آتے تھے۔

☆......☆......☆

تین ماہ بعد۔۔۔

چھٹی کی گھنٹی بجتے ہی اس نے بچوں کی قطار بنوائی اور انہیں لے کر گیٹ کی طرف جانے لگی۔ اردگرد بچوں کا شور پھیلا ہوا تھا۔ گاڑیوں کی پاں پاں...... چوکیدار مختلف ناموں کو پکار رہا تھا۔ بچوں کی مستیاں عروج پر تھیں۔ اس نے اپنی کلاس کو گیٹ تک چھوڑا......اور واپس سٹاف روم میں آ گئی۔ اسٹاف کی چھٹی، بچوں کے آف ہونے کے پندرہ منٹ بعد ہوتی تھی...... پندرہ منٹ بعد ہی اسے جانا تھا۔ وہ اپنی چیزیں سمیٹنے لگی۔ کچھ کاپیاں تھیں، کچھ ورک شیٹس اور اسی طرح کی دوسری اشیا......جنہیں اس نے اسٹاف روم کی الماری میں رکھ کر الماری لاک کی تھی۔ گلے میں پڑا دوپٹا اتار کر اس نے چادر اوڑھی اور اب وہ......اب وہ اپنا دوپٹا تہہ کر رہی تھی کہ اچانک اس کا فون بج اٹھا تھا۔

''اس وقت......خیریت ہو؟'' اس نے ذرا حیران ہوتے ہوئے فون دیکھا تو جہانگیر کالنگ کے الفاظ اسے مزید حیران کر گئے۔

''خیریت جہانگیر......؟'' اس نے ریسیو کرتے ہی سوال داغا۔

''ہاں خیرت ہی ہے، میں آج فری تھا تو سوچا تمہیں پک کر لوں۔ تم وین والے کو منع کر دو......'' جہانگیر نے اتنا کہہ کر فون آف کر دیا تھا اور وہ اچنبھے سے فون کی بجھتی اسکرین کو دیکھتی رہ گئی۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا ان دو سالوں میں بھی نہیں......اسے اعتراف تھا کہ جہانگیر کی فطرت پہلے کی نسبت واقعی بدل گئی تھی مگر پھر بھی اس طرح کہنا خولہ کو حیران کرتا تھا اور بے طرح کرتا تھا۔ اسی حیرت کے زیر اثر اس نے فون بیگ میں رکھا اور جہانگیر کا انتظار کرنے لگی۔ قریب بیس منٹس کے بعد اسے جہانگیر کی مس کال آئی تو وہ گیٹ کی طرف بڑھی تھی۔

''مسز جہانگیر......! آج آپ دیر سے جا رہی ہیں۔'' اسے اپنے پیچھے آواز سنائی دی۔ مسز مفتی آتی دکھائی دیں۔

http://kitaabghar.com

''جہانگیر نے آنا تھا لینے......بس اسی کا انتظار کرتے دیر ہوگئی۔'' وہ دونوں اب ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔

''آپ بھی تو دیر سے جا رہی ہیں......'' اس نے سوال کیا۔ مس مفتی مسکرائیں۔

''میرا تو کام ہی ایسا ہے۔'' اسی مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے جواب دیا تھا۔ وہ اب گیٹ کے پاس پہنچ چکی تھیں جہاں جہانگیر، خولہ کا اور مس مفتی کی گاڑی ان کی منتظر تھی۔ جیسے ہی وہ گیٹ سے باہر نکلیں، گاڑی ان کے قریب آکر رک گئی تھی۔ وہ ان کو خدا حافظ کہتی جہانگیر کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☆......☆......☆

''پھپھو کہاں ہیں؟'' جہانگیر کو گیٹ کا لاک کھولتے دیکھ کر اس نے از حد حیرانی سے سوال کیا۔

''وہ ماموں کی طرف گئی ہیں......فون آیا تھا ان کا مجھے......'' جہانگیر بائیک کو اندر لاتے ہوئے بولا۔ خولہ رک گئی، ٹھہر گئی، اس نے آنکھیں سکیڑ کر جہانگیر کو دیکھا، کچھ غلط تھا......کچھ غلط تھا۔ غیر معمولی......کچھ تھا جو وہ چھپا رہا تھا۔ اس کا دل بے اختیار گھبرایا۔ پھپھو اسے بتائے بِنا نہیں جاتیں۔

''جہانگیر، کیا ہوا ہے......؟ مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟'' آگے بڑھ کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے خولہ نے پوچھا اور اس طرح پوچھتے ہوئے وہ بے حد پریشان دکھتی تھی۔ جہانگیر نے بے اختیار ایک گہری سانس بھری تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ یک دم اسے بتائے......پریشان کرے صبح سے وہ اسکول میں تھی۔ لنچ عموماً گھر آکر ہی کرتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ کچھ کھا لے، تھوڑا آرام کر لے تو وہ اسے طریقے سے، سبھاؤ سے بتا دے گا مگر خولہ کی حسیات تیز تھیں، اتنی کہ......اس کی ہر کوشش پر پانی پھیر کر رکھ دیا تھا۔ جہانگیر نے اِک نظر اسے دیکھا۔ بائیک کو کھڑا کیا۔ اس کی طرف مڑا......اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے......اور خولہ کا دل تھا کہ آج پسلیاں توڑ کر باہر آنے کو تھا۔ جہانگیر کے ہاتھوں کا لمس بھی تسلی نہ دیتا تھا اور اس کے ہاتھ لرزتے سے تھے۔

''جہانگیر......'' خولہ نے سراسیمہ ہو کر پکارا اور ردِّعمل کے طور پر جہانگیر کے ہاتھوں کو کچھ اور مضبوطی سے تھام لیا۔

''مزنہ اسپتال میں ہے خولہ......anxiety attack'' اور خولہ کا رنگ اڑ گیا۔ اس کا چہرہ لمحوں میں سفید ہوا تھا۔

☆......☆......☆

خیال یہ ہی تھا کہ وہ چند دن اسی کیفیت کے زیرِ اثر رہے گی۔ اور پھر نارمل ہو جائے گی۔ آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ ساتھ مگر مزنہ، مزنہ احمد نہ رہی تھی۔ وہ ایک مسئلہ بن چکی تھی۔ ان تین ماہ میں وہ کتنی ٹھیک ہوئی تھی۔ اس بات کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا تھا کہ تین ماہ میں یہ دوسرا anxiety attack تھا۔ یہ ایک بڑا اور سنگین مسئلہ تھا۔ خولہ اب اسے ادویات کے زیرِ اثر سوتا دیکھ رہی تھی۔ اس کی رنگت حیرت انگیز طور پر پیلی اور گہری ہو چکی تھی۔ ہونٹ خشک اور سیاہ پڑ چکے تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنس رہی تھیں، اس کے چہرے کی ساری رعنائی

جیسے نچوڑ لی گئی تھی۔خولہ یک ٹک اسے دیکھتی رہی اور پھر اس نے مڑ کر اپنے بوڑھے باپ کو دیکھا۔ان کے سفید بالوں اور جھریوں زدہ چہرے اور جھکے کندھوں کو دیکھا۔اِک تکلیف کی لہر اٹھی اور کسی کوڑے کی طرح اس کے جسم پر ضرب لگا گئی تھی۔وہ بے اختیار اٹھی......اٹھ کر وہاں سے نکل گئی تھی۔کب تک......کہاں تک......آخر کہاں تک......وہ تھک چکی تھی......خدا کی قسم وہ تھک چکی تھی۔تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے وہ اسپتال کے لان میں نکل آئی اور نسبتاً اکیلے گوشے میں جا بیٹھی تھی۔اس وقت وہ تکلیف کی اس حالت میں تھی کہ جہاں آنسو ساتھ نبھاتے نہیں......ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔فرخندہ اسے یوں باہر نکلتا دیکھا کر اس کے پیچھے آئی تھیں......اس کو اس حالت میں دیکھ کر ان کا دل کٹتا تھا۔

''خولہ......بچے......'' شفقت سے کہتے ہوئے انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگایا تھا۔اس نے کسی بچے کی طرح منہ ان کے سینے میں چھپایا تھا۔وہ اس کا سر سہلاتی رہیں،تسلی بھرے انداز میں۔

''پھپھو خوشی کیا ہوتی ہے......کہاں ہوتی ہے۔کیسی ہوتی ہے یہ......کہاں سے ملتی ہے یہ پھپھو......؟'' وہ یونہی ان کے سینے میں منہ چھپائے بولی تھی۔پھپو نے ایک لمبی سانس کھینچی تھی۔

''بتائیں نا پھپو......!'' اب کی بار اس نے منہ اٹھا کر انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا اور پھپو کی آنکھیں نم ہوئی تھیں۔وہ اسے بتاتیں تو آخر بتاتیں کیا؟

''معلوم نہیں میری زندگی کب سیدھی ہوگی......کب......مجھے اس سے کچھ نہیں چاہیے......ماسوائے ذرا سے سکون کے......'' وہ دوبارہ ان کے سینے میں منہ چھپا کر ہلکا سا بڑبڑائی تھی ایسے کہ فرخندہ کو اب کی بار سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیا کہتی ہے،کیا بولتی ہے۔

☆......☆......☆

سنک کے کناروں پر میل ایک واضح لکیر کی صورت میں موجود تھی۔مسالا جات کے ڈبوں پر گرد کی ایک تہ جم چکی تھی۔کچن کیبنٹس ابتری کا منہ بولتا ثبوت تھے۔کوکنگ رینج کی حالت بھی چیخ چیخ کر کہتی تھی کہ اسے صفائی کے لیے کسی کے بھی ہاتھ دستیاب نہ ہوئے تھے اور وہ حیرانی سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔

''مرزنہ اتنی بے پرواتو کبھی بھی نہ تھی۔'' یہی سب سوچتے ہوئے وہ ابو کے کمرے کی طرف بڑھی تھی۔ان کی وارڈروب چیک کی تو نتیجہ حسبِ توقع تھا۔ایک جوڑا بھی پریس کر کے نہیں رکھا گیا تھا۔کپڑے گول مول کر کے الماری میں ٹھنسا دیے گئے تھے،تہ کر کے نہ رکھے گئے تھے۔اور اس طرح ٹھونسے گئے کہ الماری کا پٹ کھولتے ہی کپڑوں کا ایک ڈھیر خولہ کے پیروں میں آن گرا تھا۔خولہ نے جس تیسری چیز کا جائزہ لیا تھا وہ گھر کی اندرونی چھت تھی۔جا بجا لٹکتے ہوئے جالے،فرنیچر پر ڈسٹ،بے ترتیبی ایک کمال ترتیب سے پورے گھر میں بکھری نظر آتی تھی۔

''یہ......یہ اس کے پیچھے کیا ہوتا جا رہا ہے......کیا؟'' وہ ابو سے پوچھتی تو وہ ادھر ادھر کی بات کر کے ٹال دیتے تھے۔اس نے محسوس کیا کہ ابو اب اس سے باتیں شیئر نہیں کرتے تھے......چھپاتے تھے،وہ جانتی تھی کہ وہ اسے پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے مگر......یہ

سب...... یہ سب نا قابلِ برداشت تھا۔اس نے نسیم باجی کو پکڑا تھا، جو گھر کی ملازمہ تھیں۔

''خولہ بیٹا نہ ہی پوچھو تمہارے جانے کے بعد کیا ہوا ہے اس گھر میں...... مزنہ بیٹا سارا سارا دن کمرے میں پڑی روتی رہتی تھیں۔کھانے کا ہوش اور نہ باپ کا خیال...... پھر جو رونا تھما تو عجیب چڑچڑی اور بدمزاج ہوگئیں۔صاحب جی سے جھگڑا کر لیتی ہیں۔کسی چیز پر توجہ نہیں دیتیں۔صاحب جی اپنے کپڑے بھی خود ہی استری کرتے ہیں۔ایک دن تو حد ہی ہوگئی۔صاحب جی کو کہہ دیا۔''

اور اس کے آگے جو نسیم نے کہا اس نے خولہ کے جسم اور ذہن دونوں کو ایک زبردست الیکٹرک شاک سے دوچار کیا تھا۔

''مزنہ نے ایسا کہا؟'' وہ بے یقینی سے پوچھتی تھی۔

''جی...... کئی بار تو ان کی طبیعت تو اتنی خراب ہو جاتی ہے کہ سانس اکھڑنے لگتی ہے۔سوتی بھی نہیں ہیں جی...... لوگوں کو تو ایک عمر لگتی ہے ناں بوڑھے ہونے میں، پر صاحب جی تو دنوں میں بوڑھے ہوئے ہیں خولہ بیٹا......'' نسیم بتا رہی تھی اور خولہ کے ہاتھوں پیروں سے جان نکلتی جا رہی تھی۔

اتنا کچھ ہوتا رہا اور ابوا کیلے سہتے رہے...... اسے دکھ اس بات کا تھا۔نسیم اب بھی اسے بہت کچھ بتا رہی تھی اور وہ سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے بیٹھی سنتی رہی...... چند لمحوں بعد اسے احساس ہوا کہ نسیم باجی کی باتوں کے لیے آج کا دن تو کم تھا...... انہیں تو کئی دن درکار تھے، سر جھٹک کر اس نے جیسے خود کو حالت توازن میں لانا چاہا۔

''نسیم باجی! میں اب یہیں ہوں، سارے گھر کو صحیح کر کے ہی جاؤں گی۔آپ ذرا کچن تو دیکھ لیں۔'' اس نے نسیم باجی کی زبان کے آگے فل اسٹاپ لگایا تھا۔وہ ایک لمحے کو چپ ہوئیں اور پھر برا سا منہ بنا کر اٹھ گئیں تھیں اور خولہ...... وہ کئی لمحے وہاں بیٹھی اپنی کنپٹی مسلتی رہی۔درد محض کنپٹی میں ہی نہیں اٹھا تھا وہ تو جیسے ہر بن، ہر مو میں ابل پڑا تھا۔

''یا اللہ...... کہاں سے لاؤں میں اتنی ہمت......'' وہ کسی بڑھیا کی طرح ہی گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھی تھی۔اس نے ہمت جمع کی اور ارادے کو مضبوط کیا...... وہ مزنہ سے دوٹوک بات کرنے جا رہی تھی۔اسے سمجھانے جا رہی تھی۔اک آخری بار آخری کوشش اور پھر جیسے ہی اس نے مزنہ کے کمرے کا دروازہ کھولا تو...... وہ جھٹکے کیا تھے جو نسیم باجی کے انکشاف نے دیے تھے۔یہ جو دھچکا تھا ناں جو کہ اس کا منتظر تھا۔یہ اسے سرے سے ختم کر کے رکھ دینے والا تھا۔اس نے جب دروازہ کھولا تو مزنہ کے ہاتھ میں اک رومال تھا اور رومال میں......

☆......☆......☆

''ماں جی! اب وہ شادی شدہ نہیں رہی اور دوسرا عقد کرنے کے قابل ہے۔ہر لحاظ سے قانونی، معاشرتی اور مذہبی، ہر لحاظ سے آپ کا اعتراض بلا جواز ہے......'' اس نے ماں ہی کے ایک سو اکہتر دفعہ کے دہرائے گئے اعتراض کے جواب میں وہ بات دہرائی تھی جو اس نے پہلے دن کہی تھی۔

''دنیا کی ساری کنواری لڑکیاں مر گئی ہیں کیا...... تمہارے لیے وہ طلاق یافتہ ہی بچی ہے اور تم کتنی شادیاں نبھا چکے ہو؟ کنوارے

ہوتو بیاہ بھی کنواری سے ہی کروں گی۔تمہاری ضد ہے تو میری بھی ضد ہی سہی......" اور وہ ہنس دیا۔

"چلیں ٹھیک ہے ماں جی......! ضد ضد کھیلتے ہیں۔اس میں عمر بیت جائے گی۔وہ نہیں تو نہ سہی مگر پھر کوئی اور بھی نہیں......اب آپ کی نافرمانی نہیں کرسکتا تو کیا ہوا......خود ہی اپنی مرضی تو چلا سکتا ہوں نا۔۔۔بس طے ہوگیا۔۔ وہ اٹھ کر ان کے پیچھے آیا اور اب وہ زور زور سے ان کے کندھے دباتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

ماں جی کے دل کو ہاتھ پڑا......مگر وہ پکا منہ بنائے بیٹھی رہیں۔چار دن کی ضد تھی ساری عمر تو نہ چلتی۔وہ نہیں جانتی تھیں کہ یہ اب ساری عمر ہی چلنی تھی۔وہ اس بار کی چھٹیاں گزار کر واپس چلا گیا اور جاتے ہی کہہ دیا۔اب نہیں آئے گا پاکستان۔اب تب ہی آئے گا جب ماں جی مانیں گی۔ماں جی نے بھی ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔کبھی ہارٹ اٹیک کے بہانے تو کبھی شوگر ہائی کبھی سانس اکھڑنے لگی تو کبھی مرنے کے ناٹک ،لیکن اس نے بھی موکل چھوڑے ہوئے تھے۔اسکی بہن تھی ناں۔۔۔مکمل اور درست ، سچی رپورٹنگ کرنے کے واسطے۔سو ماں جی کے داؤ چلے ہوئے کارتوس ہی ثابت ہوئے تھے اور بالآخر۔انہیں ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔اس نے فون پر ہی نکاح کیا تھا اور بہانہ......چھٹیاں نہیں مل سکتیں۔نکاح کے بعد اس نے بیوی کے ڈاکومنٹس منگوائے۔ویزا اپلائے کیا اور پورے سال بعد وہ اسے رخصت کروا کر اپنے ساتھ لے جانے آیا تھا۔

☆......☆......☆

"ماں جی کہتی تھیں کہ تم بہت چالاک ہو لیکن مجھے کیوں تم اتنی معصوم دکھتی ہو؟"

اور شوہر کے منہ سے پہلی بات سن کر اس کا جھکا ہوا سر مزید جھکا تھا۔وہ اس کے انداز پر مسکرایا۔

"اب ماں جی کو کیا پتا کہ مجھے معصومیت نے مارا......نہ ہی تمہارے حسن نے لوٹا، میں تو تمہاری آنکھوں سے پٹ گیا ہوں......"

وہ کہہ رہا تھا اور اس کا سر جھکتا ہی چلا جا رہا تھا۔تو ایک جنگ ایک لڑائی اپنے انجام کو پہنچی۔اس نے کہا تھا کہ ماں باپ کی رضامندی سے ہی شادی کروں گا اور اس نے کر دکھایا کہ وہ نام کا ہی مرد نہیں تھا۔وہ چھ ماہ کی چھٹی پر آیا تھا اور چھ ماہ میں سارا پیپر ورک بھی مکمل ہو جانا تھا۔ماں جی کو ابھی تک معلوم نہیں تھا اس کاروائی کا......وہ تو بیٹے کی روانگی کی منتظر تھیں۔ادھر وہ جہاز پر بیٹھتا......ادھر انہوں نے آستین چڑھانی تھی۔پھر وہ جو اس کا حال ہوتا......وہ حال ایک زمانے نے دیکھنا تھا۔لیکن وہ......وہ کچے کام کرنے والا نہیں تھا اور وہ اپنی ماں کو بھی جانتا تھا۔مرضی کی شادی......لو میرج کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ بھئی ہم نے تمہیں پسند کیا......زمانے سے بھڑ کر تم سے شادی کی اب تم تاوان بھرو۔ماں باپ کی خدمت اور فرمانبرداری اس پر فرض تھی۔اس کی بیوی کیوں تاوان بھرتی......کہاں ناں وہ نام کا مرد نہیں تھا۔عورت کا تحفظ، اس کی زندگی کا سکون جتنا عورت کے ہاتھ میں ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ یہ مرد کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔اگر مرد یہ بات سمجھ لے اور تاوان کا کام لینے کے بجائے عقل کو استعمال کر لے تو Love marriage ٹوٹنے کی شرح کبھی زیادہ نہ ہو۔

☆......☆......☆

بارشوں کا موسم تھا......سیلا سا...... ہر طرف نمی جیسے پھوٹی پڑتی تھی۔دور کہیں رات کی سیاہی میں جھینگر بولتے تھے۔آسمان آج صاف تھا اور ستاروں کی چمک شاندار تھی۔رات ٹھنڈی تھی۔تاریکی میں لان میں لگے دیوقامت درخت پراسراریت کا مطلب سمجھاتے تھے۔

"خولہ......خولہ......" اسے اپنے نام کی پکار پڑتی سنائی دی لیکن وہ ٹس سے مس......بہری بنی بیٹھی رہی۔وہ چھت کے فرش پر دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے بیٹھی تھی۔ذہن سن ہو رہا تھا۔سوچ مفلوج ہوئی چلی جا رہی تھی اور یوں لگتا تھا کہ ساون کا سارا سیلا پن اس کے اندر آن سمایا تھا۔وہ قطرہ قطرہ بہہ رہی تھی۔ٹپ ٹپ کہیں دور سے آواز آتی تھی مگر معلوم نہ پڑتا تھا کہ کہاں پر بادل برسا۔

"خولہ......خولہ......" آواز ایک بار پھر سے آئی۔وہ ابو تھے مگر وہ تو بہری تھی۔سنتی تو آخر سنتی کیسے......جواب ہوا تھا......ایسا تو وہ مر کر بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔گمان کی گرد بھی اسے نہ پا سکتی تھی۔جو کہ اب ہوا۔ٹھیک ہے مزنہ کے ساتھ برا ہوا......حادثہ تھا جو کہ ڈھے پڑا۔وہ آیا، اس نے روندا......اور گزر گیا۔چند دن......چند روز......چلو مہینہ، دو مہینہ......لوگوں کی باتیں اور ان کا زہر......سنا اور برداشت کر لیا لیکن جیسا بھی کڑا وقت تھا۔جیسا بھی سخت حادثہ تھا......کتنا ہی دردناک المیہ تھا۔وہ گزر چکا تھا۔اسے گزر ہی جانا تھا لیکن نہیں......وہ تو مزنہ احمد کے اندر جیسے ٹھہر چکا تھا۔اس نے مزنہ احمد کو پکڑے رکھا تھا۔وہ ابھی تک اس فیز سے، اس حادثے سے باہر نہیں نکل سکی تھی اور حادثے نے اسے کیسے روندا......کیسے اس کے دل کے وجود پر اپنے بھاری بوٹوں کے نشان چھوڑے تھے، یہ تب معلوم ہوا جب اس دن خولہ نے مزنہ کے کمرے کا دروازہ کھولا تھا۔اس کے ہاتھ میں ایک رومال تھا اور رومال میں کوئی شے جسے وہ ناک کے پاس کیے سونگھ رہی تھی قطعاً اس بات......سے بے خبر تھی، غافل تھی کہ دروازہ کھول کر کوئی کھڑا اسے دیکھ رہا ہے۔خولہ چند لمحے الجھن بھرے انداز میں اسے دیکھتی رہی یوں جیسے وہ سمجھ نہ پائی ہو اور پھر......پھر جیسے ہی سمجھ آئی کوئی چیز، ایک تیز، چبھتی ہوئی لہر کی صورت اس کے ناک کے نتھنوں سے ہوتی پورے جسم میں پھیلی تھی۔یوں جیسے اس کی سانس کھینچ لی گئی ہو۔اگلا قدم عین فطری تھا، اس نے جھپٹا مار کر مزنہ کے ہاتھ سے وہ رومال چھینا اور رومال میں موجود چیز لڑھکتی ہوئی نیچے جا گری اور اب......اب وہ دونوں ہی شاک کی بدترین حالت میں تھیں، مزنہ اسے دیکھتی تھی اور وہ......وہ نیچے گری اس چیز کو......

"Glue sniffing"......خولہ کے لب بے آواز ہلے تھے اور اس نے بے حد، بے حد بے یقین ہو کر اس گلو کو دیکھا تھا۔پھر اس کی نظر کا زاویہ بدلا اور اس نے مزنہ کو دیکھا اور جب وہ مزنہ کو دیکھتی تھی تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ حیرت ایک لاوا تھا جو کہ اس کی آنکھوں سے ابلتا تھا اور مزنہ کے وجود پر گرتا تھا۔خولہ چند لمحے اس بدترین انکشاف کے زیر اثر ساکت بے حس و حرکت کھڑی رہی اور پھر......اس کے بعد اس نے دوسرا کام وہی کیا تھا جو ایسی کسی بھی حالت میں کرنا چاہیے تھا۔وہ ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھی تھی اور اب وہ ایک ایک کر کے ساری دراز کھول کھول کر کھنگالتی جا رہی تھی۔اسی طرح اسے سائیڈ ٹیبل کی دراز بھی کھول کر نیچے الٹ دی تھی۔الماری کو کھولا، سارے کپڑے نکال کر باہر پھینکے، سیف کھول کر کھنگالا، وہ کچھ ڈھونڈ رہی تھی اب اور اس کے ہاتھ میں مطلوبہ چیز تھی۔وہ اس موذی چیز کا شاپر تھا۔وہ تھوڑی دیر تک اس شاپر کو پکڑے یقین کر لینے کی کوشش کر رہی تھی اور پھر......پھر اس نے غصے سے طیش سے پُر ہو کر پوری قوت سے شاپر

مزنہ پر دے مارا تھا۔اور بس اسی پر بس نہ کیا تھا۔آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑتے ہوئے اس نے کھینچ کر زور سے الٹے ہاتھ کا تھپڑ بھی اسے دے مارا تھا۔ پھر جھٹکے کے ساتھ اسے پرے گرایا۔اور اسے نہیں معلوم تھا کہ ایسا کرتے ہوئے وہ رو رہی تھی۔مزنہ گال پر ہاتھ رکھے، بیڈ پر پہلو کے بل گری بے یقینی سے اسے دیکھتی تھی اور وہ......وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے نیچے بیٹھتی چلی گئی۔

''یہ......یہ کیا ہو گیا تھا......؟تو کیا......کیا مزنہ addict ہو چکی تھی؟''

☆......☆......☆

مزنہ دراصل clinical depression کا شکار ہوئی تھی۔ پہلے اس کا رشتہ طے ہو کر نہیں دے رہا تھا پھر جب یہ مسئلہ حل ہوا تو عین شادی سے چند روز قبل شادی ٹوٹ گئی......وہ بھی اس کی مرضی کے بنا اور چھوٹی ہونے کی وجہ سے وہ جتنی لاڈلی تھی اتنی ہی حساس بھی تھی......حادثہ اس پر پورے معنی ومفہوم کے ساتھ اثر انداز ہوا اور اسے نفسیاتی طور پر بری طرح سے مجروح کر کے رکھ گیا تھا۔وہ ریکور نہیں کر سکی تھی......مووآن نہیں کر سکی تھی۔وہ اسی المیے کے شکنجے میں پھنسی رہ گئی تھی۔شروع میں وہ روتی رہتی تھی پھر اس کی نیند اور بھوک اڑ گئی تھی۔اس کا وزن دنوں میں گرا تھا۔ایسے ہی دنوں میں اتفاقاً اس کے ہاتھ یہ چیز لگ گئی جو کسی چیز کو جوڑنے کے لیے اس نے استعمال کی تھی اور پھر اس کے ہاتھوں کو لگی رہ گئی تھی۔رات کو وہ جب بستر پر لیٹی تو ایک خوشبو نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ یہ......کہ یہ خوشبو کہاں سے آ رہی ہے،کسی خیال کے تحت اس نے اپنے ہاتھوں کو سونگھا اور حیرت انگیز طور پر اسے وہ خوشبو جو کسی بھی نارمل انسان کو خوشگوار محسوس نہ ہوتی۔اسے خوشگوار اور بھلی محسوس ہوئی تھی......وہ بار بار اپنے ہاتھوں کو ناک کے قریب لے جا کر سونگھتی رہی اور اس رات......اس رات بنا کسی کوشش، بنا کسی دوا کے وہ ایک پرسکون نیند سوئی تھی۔ پھر تو سمجھو وہ روز کا معمول بن گیا تھا۔وہ اس خوشبو کو سونگھتی اور سارا درد، ساری تکلیف، ساری اذیت اور ساری جلن پتا نہیں کہاں چلی جاتی تھی۔اس کے اعصاب ریلیکس ہو جاتے تھے اور وہ سکون کی ایک پرلطیف کیفیت سے دوچار ہو جاتی تھی۔ڈاکٹر نے کہا تھا کہ یہ مسئلہ سیریس ہے مگر علاج اور توجہ سے حل کیا جا سکتا ہے اور یہ بھی کہ وہ ابھی پوری طرح ایڈیکٹ نہیں ہوئی تھی سو امید پوری طرح سے موجود تھی۔اور اس ٹھنڈے میلے فرش پر بیٹھے ہوئے خولہ نے ایک فیصلہ کیا تھا۔تنہا، اکیلے اور شکستہ تر ہونے کے باوجود......اس نے ریزہ، ریزہ بکھری ہمت کو جمع کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی تھی......وہ اب مزید ایک گھریلو، عام سی شادی شدہ عورت نہ رہی تھی۔وہ فیلڈ میں کام کرنا جانتی تھی۔وہ اب پریکٹیکل وومن تھی۔اسے جیسے اکیلے فیصلے کرنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

''ایک ماہ کا آف......''مس مفتی نے اس کی بات کو سنا اور ردِعمل کے طور پر اس کی بات کو دہراتے ہوئے یک دم انہوں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی تھی۔

''مسز جہانگیر......یہ ناممکن ہے......آپ کے پیریڈز، وہ کس طرح سے مینج ہوں گے۔ایک دو پیریڈز کی بات ہو تو سب substitude لگایا جا سکتا ہے۔مگر پانچ، چھ پیریڈز......مجھے حیرت ہے کہ آپ نے ایسی درخواست کی۔میں بورڈ آف ڈائریکٹرز کو کیا

جواب دوں گی اس فیور کا......

''مس مفتی میری بہن بہت بیمار ہے اور اس کو کیئر کی ضرورت ہے۔ میرے علاوہ کوئی ایسا نہیں ہے جو اس کی کیئر کر سکے......میرا آدھا دن تو ادھر سکول میں ہی گزر جاتا ہے۔ رہا باقی آدھا دن تو اس میں، میں کیا کر سکتی ہوں۔ اس کو بھی بھرپور توجہ کی ضرورت ہے ورنہ وہ ریکور نہیں کر پائے گی۔''اس نے اپنی مجبوری بیان کی اور وہ دونوں ہی اب خاموش تھیں۔

''اگر میں کوئی بیماری کا......''

''نہیں مسز جہانگیر......میں دو نمبر کام کرتی ہوں اور نہ ہی ایسا کسی دوسرے کو کرنے دے سکتی ہوں......آپ کے مسئلے کا حل یہ ہو سکتا ہے کہ آپ اپنی کلاسز لیں اور چلی جایا کریں۔ گو کہ مجھے اس کے لیے بھی پورے ٹائم ٹیبل کو ہلانا پڑے گا اور دیگر اسٹاف کا بھی خیال کرنا ہوگا۔ مگر میں یہ کر لوں گی، آپ کے سارے پیریڈز کو اکٹھا کر دوں گی تاکہ آپ کو آسانی رہے۔ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔''

ان کا انداز قطعی تھا۔ خولہ چند لمحے سر جھکائے سوچتی رہی۔ جاب وہ چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کل پرسوں......کسی ایک دن جہانگیر کو جرمنی جانا ہی تھا تو تب......تب اسے اپنا اور پھپھو کا خرچہ اٹھانا تھا۔ سو وہ چاہ کر بھی جاب نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

''تھینک یو مس مفتی......تھینک یو سو مچ......''اس نے ممنونیت سے کہا اور ان کے آفس سے نکل آئی تھی۔

یہ پہلا کام تھا جو اس نے کیا۔ دوسرا کام......اسے ابو کے گھر شفٹ ہونا تھا، جس کے لیے اسے جہانگیر اور پھپھو سے بات کرنی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ پھپھو اتنا مسئلہ نہیں کریں گی مگر جہانگیر......اور جہانگیر کو وہ کبھی یہ نہیں بتانے والی تھی کہ مزنہ glue sniffing کا شکار ہو رہی ہے اور جہانگیر......وہ اس کی بات سن کر اس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔

''مزنہ بچی تو نہیں ہے خولہ......''

''ہاں وہ بچی نہیں ہے مگر بیمار ہے جہانگیر......''

''تو تمہارے وہاں جانے سے کیا ہوگا؟''اس نے تکلیف سے جہانگیر کو دیکھا۔

''اب ابو اس عمر میں اسے لے کر ڈاکٹرز کے ہاں چکر پر چکر لگائیں۔ وہ ڈپریشن کا شکار ہے جہانگیر، اسے مسلسل چیک اپس اور توجہ کی ضرورت ہے اور......''اس نے ذرا سے توقف کا مظاہرہ کیا۔

''مجھے وہاں جانا ہے......چاہے تم راضی ہو یا نہیں......''پھر اس نے مضبوط انداز میں کہا تھا۔

جہانگیر کے ماتھے پر لکیریں ابھریں مگر وہ نظرانداز کرتے ہوئے اٹھ کر پیکنگ کرنے لگی تھی۔ اسے عادت جو ہوگئی تھی اپنے فیصلے خود کرنے کی۔

☆......☆......☆

آپ لوگ اپنا وقت اور پیسہ دونوں برباد کر رہے ہیں...... جب یہ ہونا ہی نہیں تو اس کے لیے کوشش ہی کیوں کی جائے......وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی تھی۔سامنے سکرین پر کوئی ڈرامہ چل رہا تھا اور وہ سیب کے بڑے بڑے بائٹس لیتے ہوئے انتہائی بے حسی اور بے پروائی سے بولی تھی۔احمد صاحب کے چہرے کا رنگ بدلا......خولہ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دی اور کمرے میں جانے کا اشارہ کیا تھا۔اس نے چند لمحے رک کر ان کے جانے کا انتظار کیا اور پھر مزنہ کو دیکھا۔

''تمہیں کیوں لگتا ہے کہ ہم وقت اور پیسہ دونوں برباد کر رہے ہیں اور یہ کس نے بتا دیا تمہیں کہ ایسا ہونا ہی نہیں......کیا الہام ہوتے ہیں تمہیں......؟''وہ نرمی سے کہتے ہوئے اس کے پاس صوفے پر بیٹھی اور جھک کر اسٹریپ کھولتے ہوئے اپنے پیروں کو جوتوں سے آزاد کیا تھا۔

''مجھ جیسی لڑکی سے کون شادی کرے گا بھلا؟''

''ہاں یہ تو سوچنے کی بات ہے کہ تم جیسی لڑکی سے کون شادی کرے گا؟ تم تو لنگڑی ہو، اندھی ہو، بہری بھی ہو اور بدصورت بھی......اور اوپر سے کاٹتی بھی ہو۔''خولہ اب بھی نرمی سے کہہ رہی تھی۔

مزنہ نے رخ موڑ کر خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھا۔احمد صاحب اور خولہ......دونوں آج بھی کہیں سے ہو کر آئے تھے مزنہ کے سلسلے میں اور جب وہ دونوں اسی پرپوزل کو ڈسکس کرتے ہوئے اندر داخل ہوئے تو مزنہ نے انتہائی بدمزاجی سے کہا تھا۔

خولہ نے ایک نظر اسے دیکھا تھا پھر اپنے جوتے اٹھا کر کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔وہ جانتی تھی کہ سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہونا تھا۔ٹھیک ہے کہ وہ بہتر ہو رہی تھی مگر ایک چیز جیسے اس کے ذہن میں چپک کر رہ گئی تھی کہ اس کی شادی نہیں ہونی تھی، نہیں ہو سکتی تھی۔بھلا ایک ایسی لڑکی جس کی شادی عین شادی ہونے سے چند روز قبل ٹوٹ جائے اس سے کون کرتا ہے شادی...... پاگل ہی ہو گا کوئی......خولہ جانتی تھی اس خوف، اس وہم سے باہر آنے کے لیے بھی اسے وقت چاہیے تھا اور ڈاکٹرز کہتے تھے کہ اس کا فوری حل یہی ہے کہ اس کی شادی کر دی جائے اور یہ جو فوری حل تھا نا یہ اتنا فوری وقوع پزیر نہیں ہو سکتا تھا۔خولہ کو وہاں آئے کافی دن ہو چکے تھے اور وہ ایک بار پھر گھر اسکول اور سسرال کے درمیان سینڈوچ بنی ہوئی تھی۔ویک اینڈ پر وہ سسرال جایا کرتی تھی اور یہ چیز ایک بار پھر سے نئے سرے سے اس کی طاقت ختم کرنے لگی تھی۔مسئلہ اب کی بار بھی وہی درپیش تھا۔کوئی مناسب، ڈھنگ کا پروپوزل نہیں مل رہا تھا اور ڈاکٹرز کے مطابق اگر ایسا جلدی نہ ہوا تو مزنہ ڈپریشن کے ایک لمبے فیز میں داخل ہو سکتی ہے۔وہ اس حد تک ناامید اور مایوس ہو سکتی ہے کہ کوئی انتہائی قدم اٹھانے کی کوشش بھی کر سکتی ہے۔اور یہ اب تک کی سب سے پریشان کن بات تھی۔علاج ہو سکتا ہے، زخم مندمل ہو سکتا ہے، مرہم رکھا جا سکتا ہے مگر جو انسان خود ہی ٹھیک نہ ہونا چاہے اس کا کیا......کیا جا سکتا ہے۔

☆......☆......☆

http://kitaabghar.com

''ابو وہ بہت بری طرح سے ری ایکٹ کرے گی۔میں جانتی ہوں ناں......''

''اس میں ری ایکٹ کرنے والی کون سی بات ہے خولہ......لڑکا اس سے عمر میں ذرا سا ہی چھوٹا ہے...... باقی تو یہ ایک بہترین پروپوزل ہے......''احمد صاحب حیران ہوئے۔

''ابو ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کی سوچ ابھی اتنی پریکٹیکل نہیں ہوئی۔مرد کو عورت سے بڑا ہی تصور کیا جاتا ہے اور مزنہ...... میں کہہ رہی ہوں ناں وہ ری ایکٹ کرے گی۔''

''تم بات کرو......دیکھو تو سہی وہ بھلا کیا کہتی ہے۔''

''ٹھیک ہے میں بات کروں گی اور اگر اس نے انکار کر دیا تو؟''خولہ کی بات سن پر وہ خاموش ہو گئے تھے۔

''تو میں اسے ایسا کرنے نہیں دوں گا۔یہ تو بیوقوفی ہے۔''ذرا سے توقف کے بعد جواب آیا تھا اور خولہ انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی۔

❁ ❁

ناول **نار** ابھی جاری ہے۔اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **10** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

رنگا رنگ کہانیوں سے سجا،خوبصورت اور دلکش

سوہنی ڈائجسٹ

SohniDigest.Com

اگر آپ بھی لکھ رہے ہیں اور اُردو قارئین کی تلاش میں ہیں تو اپنی کہانیاں Inpage میں کمپوز (ٹائپ) کر کے پورے اعتماد کے ساتھ سوہنی ڈائجسٹ میں بھیجئے۔نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

ابھی sohnidigest@gmai.com پر ای میل کریں۔

قسط نمبر 4

http://kitaabghar.com

''ہائے مسز جہانگیر کیسی ہیں آپ......؟ اب تو آپ نظر ہی نہیں آتیں؟'' وہ اسٹاف روم میں بیٹھی دھڑا دھڑ کاپیاں چیک کر رہی تھی۔ جب مس مفتی اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی تھیں۔

خولہ نے چونک کر انہیں دیکھا اور مسکرا دی۔

''میں ٹھیک ہوں میم......! آپ کیسی ہیں؟'' پین پر کیپ لگاتے ہوئے اس نے جواب دیا تھا۔ ان کے آفس میں اسپرے ہو رہا تھا جس کی وجہ سے وہ وہاں آئی تھیں۔

''الحمدللہ......فٹ فاٹ ہوں میں......بہن کی طبیعت کیسی ہے اب؟''

''بہتر ہے۔''

''آپ اس کی شادی کر دیں مسز جہانگیر......یہ ہی بہتر حل ہے۔''

''جی کوشش کر رہے ہیں...... بلکہ ایک پروپوزل بھی موجود ہے۔ کافی اچھا پروپوزل ہے بس لڑکا عمر میں تھوڑا سا چھوٹا ہے مزنہ سے۔'' وہ انہیں بتانے لگی تھی۔

''یہ تو کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ آپ ضرور اسے consider کریں۔ اللہ سب بہتر کرے گا۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔ اس نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور پھر سے کاپیاں چیک کرنے لگی۔

''مسز جہانگیر......!'' اس آواز پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ دروازے میں کھڑی تھیں یوں جیسے جاتے جاتے پلٹ آئی ہوں۔

''یہ پروپوزل کسی میچ میکر کے ذریعے سے آیا ہے؟''

''جی......'' وہ حیران ہوئی۔

''قابلِ اعتبار ہے وہ میچ میکر......؟'' وہ آہستہ سے چلتی ہوئی دوبارہ اس تک آئی تھیں۔

''جی......کافی اچھی عورت ہے۔'' خولہ کی حیرانی اور بڑھی۔

''آپ مجھے میچ میکر کا نمبر دے سکتی ہیں؟ مجھے چاہیے تھا۔''

''وائے ناٹ شیور......میں آپ کو نمبر فارورڈ کر دیتی ہوں۔'' وہ سیل فون نکالتے ہوئے بولی تھی۔

''تھینکس ......'' انہوں نے مسکرا کر کہا اور پلٹ گئیں۔ خولہ نے نمبر فارورڈ کیا اور کسی سوچ میں پڑ گئی۔

''مس مفتی کو کیوں چاہیے تھا نمبر؟ کس کے لیے؟'' اور اس کیوں کے بعد آنے والے خیال کو بری طرح جھٹک کر وہ ایک بار پھر سے کاپیوں کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

اور وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ مزنہ نے صرف ری ایکٹ نہیں کیا تھا۔ وہ تو ہتھے سے ہی اکھڑ گئی تھی۔

''بوجھ لگتی ہوں ناں میں آپ کو......؟ تو ایسا کریں گلا کاٹ کر کسی دریا میں بہا دیں یا پھر چھت سے دھکا دے دیں...... مجھے شادی کرنی ہے آپی......کوئی بچہ نہیں پالنا......'' خولہ بیڈ پر بیٹھی دونوں ہاتھوں کو دائیں بائیں جماتے سختی سے آنکھیں بند کیے اسے سنتی رہی۔

''disgisting۔'' اس نے جیسے زہر تھوکا تھا۔

''مزنہ...... کم آن...... کم آن یار...... اتنی جذباتی کیوں ہو جاتی ہو تم......کبھی عقل کا مظاہرہ بھی کر لیا کرو...... بچہ نہیں ہے وہ اور......اور محض تین سال تو چھوٹا ہے تم سے مگر لگتا نہیں ہے۔ ویسے بھی جب شادی ہوتی ہے ناں تو بہت سی چیزیں خود بخود ایڈجسٹ ہو جاتی ہیں۔ وقت سب چیزوں کو ٹھیک کر دیتا ہے۔'' وہ ہائپر نہیں ہونا چاہتی تھی مگر ایک دم اپنے ابلتے دماغ پر قابو نہ پا سکی تھی۔

''اور یاد رکھو......ابو اس رشتے سے انکار کرنے والے نہیں ہیں...... مائنڈ اٹ......'' وہ غصے میں یہ بھی بول گئی جو کہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔

''واٹ......؟ واٹ......؟ ابو مجھ پہ زبردستی کریں گے۔ زبردستی......؟'' وہ شاک سے، حیرت سے بولتے ہوئے اس کے پاس آئی تھی۔

''پہلے میری مرضی کے خلاف شادی توڑی اور اب...... یہ......'' مزنہ نے دونوں ہاتھوں سے سر کو پکڑا تھا۔

''مزنہ پلیز......! پلیز سمجھنے کی کوشش کرو، ابو بے حد کمزور ہو چکے ہیں۔ انہیں مزید پریشان مت کرو۔'' خولہ نے اس کے دونوں ہاتھوں کو سر سے ہٹا کر اپنے ہاتھوں میں لیا اور پیار سے کہا اور اس نے ایک دم بہن کے ہاتھ جھٹک دیئے۔ نفرت سے، طیش سے......خولہ نے بے ساختہ ہونٹ بھینچے۔

''مزنہ......!'' خولہ آگے بڑھی......

اس نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا، آنکھوں میں آنسو ٹھہر سے گئے تھے۔

''گیٹ......آؤٹ......'' اس کی ناک سرخ ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں ٹھہرے آنسو بہہ پڑے اور یہ دو لفظ اس نے بے حد شکستہ سے انداز میں ادا کیے تھے۔

http://kitaabghar.com

''مزنہ......!'' خولہ کے ہاتھ بے بسی سے اس کے پہلو میں جا گرے، وہ تھک چکی تھی۔ بہت زیادہ تھک چکی تھی......اور مزنہ...... وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے شدت سے ہونٹوں کو بھینچے...... پیچھے کو ہٹتی جا رہی تھی۔ خولہ چند لمحے ہارے ہوئے انداز میں اسے دیکھتی رہی اور پھر باہر نکل گئی تھی۔

☆......☆......☆

''السلام علیکم......!''

''وعلیکم السلام......! پانی لاؤں تمہارے لیے......؟'' ابو اٹھتے ہوئے بولے۔

''کمال کرتے ہیں ابو...... مجھے ضرورت نہیں ہے فی الحال......'' وہ تیزی سے آگے بڑھی اور ان کے کندھوں پر دباؤ ڈال کر انہیں دوبارہ کرسی پہ بٹھا دیا۔ وہ ساڑھے بارہ بجے تک واپس آ جایا کرتی تھی۔

''مزنہ کہاں ہے؟'' وہ کرسی گھسیٹ کر ان کے پاس ہی بیٹھتے ہوئے بولی تھی۔

''اپنے کمرے میں ہوگی۔'' ابو کے سامنے میز پہ اِک چھوٹا گملا رکھا ہوا تھا۔ وہ پودے کی کانٹ چھانٹ میں مصروف تھے۔

''تم اب گھر چلی جاؤ بیٹا......! فرخندہ کو مشکل ہو رہی ہے، روز اس کا فون آتا ہے۔ فلاں چیز کہاں رکھی ہے......تو فلاں کہاں ......'' قینچی چلاتے ہوئے انہوں نے کہا۔

''چلی جاؤں گی ابو...... وہیں پہ جانا ہے۔'' وہ کرسی کی بیک سے سر ٹکائے آرام دہ انداز میں بیٹھی ابو کے حرکت کرتے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ جواباً انہوں نے کچھ کہا نہیں تھا بس اپنے کام میں مصروف رہے۔

''مزنہ کو دیکھ لو خولہ...... وہ صبح سے کمرے سے نہیں نکلی......'' تھوڑی دیر بعد وہ عام سے لہجے میں بولے تھے۔

''کیا؟'' اور وہ اِک جھٹکے سے سیدھی ہو گئی تھی۔

''صبح سے نہیں نکلی......؟'' اس نے دُہرا کر پوچھا۔ اس کا دل بے وجہ دھڑکا۔

''ہاں......'' احمد صاحب نے اس کی پریشانی کو ذرا حیرت سے دیکھا۔ اس نے پھر کوئی سوال نہ پوچھا تھا۔ وہ تیزی سے مزنہ کے کمرے کی طرف بڑھی تھی۔ اور اس کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس کی دھڑکن تیز سے تیز تر ہوئے جا رہی تھی۔ اتنی کہ چلتے چلتے یک دم اس کے قدموں کی رفتار میں تیزی آ گئی تھی اور پھر تقریباً بھاگتے ہوئے مزنہ کے کمرے تک گئی تھی۔ اس نے تیزی سے دروازہ کھولا تو...... تو مزنہ آرام سے اپنے بیڈ پر سو رہی تھی۔ خولہ نے بے اختیار اِک گہری پُرسکون سانس لی تھی اور اپنی پیشانی سے پسینہ صاف کیا تھا۔ مزنہ اکثر ہی دیر تک سوئی رہتی تھی یہ کوئی اتنی عجیب بات نہیں تھی۔ ایک اور لمبی سانس لیتے ہوئے جیسے ہی وہ مڑنے لگی تو اچانک اس کی نظر زمین پر گری دوا کے پتے پر پڑی تھی۔

''مزنہ کی میڈیسن ختم ہوگئی اوراس نے بتایا نہیں......'' آگے بڑھ کر اس نے وہ پتا زمین سے اٹھایا اور جیسے ہی اٹھایا تو......

''ابو......'' وہ پوری قوت سے چیخی تھی۔

☆......☆......☆

سر کے بالوں سے لے کر پیر کے انگوٹھے تک......وہ پسینے میں بھیگی ہوئی تھی۔ وہ اپنے چہرے، گردن کی پشت اور جسم پر آیا پسینہ لکیر کی صورت بہتا محسوس کرسکتی تھی۔ اتنا پسینہ کہ اس کی پلکوں پر بھی نمی کے قطرے موجود تھے۔ اسے سانس نہیں آرہی تھی۔ وینٹی لیٹر پر ہونے کے باوجود سانس نہیں آرہی تھی اور ہر دو سیکنڈ پر اسے اِک لمبی سانس کھینچ کر تنفس کے عمل کو بحال رکھنا پڑ رہا تھا۔ اس نے آہستگی سے پلکیں جھپکیں......منظر دھندلا سا تھا۔ کچھ لوگ تھے، کچھ آوازیں......اس نے ایک اور لمبی سانس کھینچی......سب کچھ گڈ مڈ ہو رہا تھا۔ سب کچھ......گہری، گہری سانس لیتے ہوئے وہ اپنی پلکوں کو بند ہونے سے روک رہی تھی مگر غنودگی زور آور تھی۔ وہ نیم بے ہوشی کی سی کیفیت تھی یا پھر......یا پھر شاید وہ مر رہی تھی۔

اس نے پھر سے پلکوں کو جھپکا اور اب کی بار وہ انہیں کھول نہ سکی تھی مگر اس سے پہلے اس نے کسی کے رونے کی آواز سنی تھی۔ اس کے ہونٹ بنا آواز ہلے تھے۔ اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا اور اسے محسوس ہوا جیسے اس کے جسم کو کسی اندھی، گہری تاریک کھائی میں پھینک دیا گیا ہو اور پھر......پھر یک دم روشنی، اِک جھماکے کی سی صورت پھیلی تھی۔ آنکھوں کو چندھیا کر رکھ دینے والی روشنی......اور پکچر جیسے ریوائنڈ ہونے لگی تھی۔ دور کہیں......بہت دور کسی پاتال میں یا شاید کسی گہری قبر میں دفن ماضی میں......اِک جوان نسوانی ہنسی گونجی......اور اس نے خوشبو محسوس کی......دل فریب، بے حد بھلی سی خوشبو......اس کی خوشبو......

''تم آگئے؟'' اس نے رخ موڑے بنا کہا......اور اس کی آواز یوں گونجتی تھی کہ جیسے کسی گنبد میں گونجتی ہے۔ وہ حیران ہوا۔

''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟'' وہ مسکرائی اور اب کی بار رخ موڑا۔

''تمہاری خو......ش......ب......ووو......سے۔'' لفظ بازگشت کی صورت گونجے اور اس کے چاروں طرف پھیل گئے۔ منظر کے رنگ بگڑنے لگے اور بگڑ کر اِک نیا منظر تخلیق کرنے لگے......رنگ مجسم ہوئے اور یکجا ہو کر تصویر پر ابھرنے لگے، بامعنی انداز میں، وہ ساکت بنا حرکت کیے کھڑی تھی اور اسے دیکھتی تھی۔

اس کی آنکھوں میں موجود جذبہ اتنا خوبصورت، اتنا پُر شدت تھا کہ نظر ہٹتی نہ تھی۔ آنکھ جھپکتی نہ تھی۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھایا اور اس کی آنکھوں پر رکھ دیا......وہ بے اختیار مسکرایا۔ اس نے ہاتھ ہٹایا نہ تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' وہ پوچھتا تھا۔

''تاب کہاں سے لاؤں؟'' اور جواب سرگوشی کی صورت گونجتا تھا۔ وہ ہنس پڑا......اِک قہقہہ لگا کر اور پھر جیسے سفید، سچے موتیوں

http://kitaabghar.com

کی کوئی لڑی ٹوٹ سی گئی تھی۔اور وہ دونوں ہنستے تھے......کھن کھنا کھن......کھن،کھن،کھن......منظر دھواں بنا،تحلیل ہوا......سب رنگ اڑ گئے اور اب وہاں صرف اِک رنگ تھا۔صرف اِک رنگ......سرخ رنگ خون......بھل بھل بہتا خون......اِک زوردار نسوانی چیخ رات کی تاریکی میں گونجتی چلی گئی۔

''تم نے اسے ماردیا......'' وہ خوف اور دہشت سے بولی اور قتل کرنے والے کے ہاتھ سے چاقو نیچے جا گرا......دور تلک چاقو کے گرنے کی آواز گونجتی چلی گئی تھی اور اس کی بند آنکھوں کے کناروں سے نمی پھسلتی چلی گئی اور یہ اس کے آخری آنسو تھے۔جو اس نے بہائے......زندگی کے آخری آنسو......

☆......☆......☆

وہ اپنے ہاتھ کی چوتھی انگلی کے ناخن کو اتنا کتر چکی تھی کہ اب وہاں مزید کترنے کے لیے ناخن نہ بچا تھا مگر پھر بھی وہ کترے چلی جاتی تھی۔اس کے تنفس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ وہ ناک سے نکلنے والی گرم ہوا محسوس کرسکتی تھی۔اس کے جسم پہ بھی گرم گرم لہریں اٹھ رہی تھیں اور وہ اپنی پیشانی کو نم پاتی تھی۔صاف دکھتا تھا کہ اضطراب بلا کا تھا۔پھر اس نے ناخن چبانا بند کر کے دونوں ہاتھوں میں اپنے بال جکڑے تھے۔اس کے ہونٹ کپکپائے اور اِک آنسو لڑھک آیا......اس نے آسمان کی طرف منہ کر کے اِک لمبی سانس اندر کھینچی۔پلکیں لرزتی تھیں......ہونٹ کانپتے تھے اور بند آنکھوں سے آنسو ٹھہر ٹھہر کر گرتے تھے۔یہ مشکل تھا......بے حد مشکل،آسان نہ تھا۔آسان کیسے ہوسکتا تھا بھلا؟ نیچے سارے سو رہے تھے......پھپھو،جہانگیر اور وہ......وہ آدھی رات کو......چھت پر تھی۔اِک وہی تھی کہ جسے چین نہ تھا۔سکون نہ تھا،اِک آگ تھی جو دہکتی تھی۔اب کی بار وہ کھڑی ہوئی......ہاتھ کی تیسری انگلی کو چباتے ہوئے چکر کاٹنے لگی تھی یوں جیسے وہ خود اپنے پیروں کی گردش سے انجان تھی۔بے خبر تھی......بے چینی کی وہی حالت تھی جو کہ ہوش کو نگل رہی تھی......اس کے سارے جسم......پورے بدن پر سنسناہٹ دوڑ رہی تھی یوں جیسے ہزاروں،لاکھوں چیونٹیاں اسے کھا رہی ہوں......اِک پل کو وہ سوچتی،یہ نہیں ہوسکتا......دوسرے پل کو دوسرا خیال آتا......اور وہ پہلی سوچ کو ڈھانپ لیتا،ہڑپ کر جاتا......کیوں......کیوں نہیں ہوسکتا......زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا......کیا انکار......؟ تو......؟ اور اس تو کے بعد اس کی سانس جیسے بند ہونے لگتی،دم گھٹنے لگتا اور پھر......یک دم اس کے پیروں کی حرکت رکی......وہ منڈیر پر دونوں ہاتھ رکھ کر جھکی......اک لمبی سانس اندر کو کھینچی......چند لمحے وہ اسی حالت میں رہی......پھر سیدھی ہوئی......بے دردی سے گال صاف کیے اور گردن اکڑا کر اس نے خود سے کہا۔

''یہ ہوسکتا ہے،کوشش کرنے میں کیا حرج ہے......ہاں......یہ ہوسکتا ہے۔'' اس نے خود کو باور کرایا تھا۔

☆......☆......☆

اس دروازے سے اندر داخل ہونے کے لیے بڑی ہمت چاہیے تھی۔بڑی ہمت......حالانکہ یہ وہی دروازہ تھا کہ جسے دن میں کئی

بار knock کر کے وہ بے تکلفی سے اندر داخل ہو جایا کرتی تھی مگر آج......اب کی بار پاؤں جیسے شل ہو رہے تھے اور ہاتھ جیسے اکڑ گیا تھا۔ اٹھتا تھا نہ دستک دیتا تھا۔ وہ کام ہی ایسا کرنے آئی تھی......وہ بہت سارا حوصلہ جمع کر کے آئی تھی مگر اب اس کا اعتماد بکھر رہا تھا......ختم ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی ٹانگوں میں یک دم کپکپاہٹ اترتی محسوس کی تھی۔ اس کا حلق سوکھ رہا تھا، اور بے اختیار وہ کھانسی تھی......جس طرح بے اختیار کھانسی تھی، اسی طرح بے ساختہ اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر کھانسی کی آواز کو دبایا تھا......کوئی دوسری ٹیچر گر آ جاتی تو وہ اس طرح، اس حالت میں اسے دیکھ کر ضرور حیران ہوتی اور سوال کرتی کہ وہ اندر کیوں نہیں جاتی۔ فیصلہ کرنا جتنا مشکل تھا، عمل کرنا اس سے کہیں زیادہ......کہیں زیادہ مشکل تھا۔ اسے یہ بھی دھڑکا لاحق تھا کہ کہیں، کہیں کوئی اور ٹیچر نہ آ جائے اور اسے مس مفتی سے اکیلے میں بات کرنی تھی۔ اسی دھڑکے نے اس کے ہاتھ کو حرکت کے قابل بنایا اور اس نے ہولے سے دستک دی۔

''یس کم ان......'' ایک جانا پہچانا جملہ اور آواز......وہ فوراً دروازہ نہیں کھول سکی تھی۔ کچھ وقت لگا اسے......اس نے ہلکے سے دروازہ کھولا اور قدم بڑھائے۔

''مسز جہانگیر......!'' اسے دیکھ کر وہ خوشدلی سے مسکرائیں۔ جواباً وہ انہیں اِک پھیکی سی مسکراہٹ لوٹا سکی تھی۔ میکانکی انداز میں وہ کرسی گھسیٹ کر ان کے سامنے بیٹھی تھی۔ ہاتھ گود میں دھرے اور نظریں ہاتھوں پہ جمی......مس مفتی چند لمحے اسے دیکھتی رہیں اور انتظار کرتی رہیں کہ وہ کس کام کے لیے آئی تھی۔

''مسز جہانگیر......؟'' اور اس نے آنکھیں زور سے بند کیں اور پھر سر اٹھایا مگر وہ سیدھا نہیں دیکھ سکی تھی، وہ مس مفتی کی نیم پلیٹ کو دیکھ رہی تھی۔

''آپ نے مجھ سے میچ میکر کا نمبر لیا تھا میم! آپ نے اس سے رابطہ کیا؟'' مس مفتی اس انداز اور اس سوال پر ٹھٹکیں۔

''ہاں! کیا تھا۔'' اور خولہ کے اعصاب بے اختیار تنے تھے۔

''تو......؟''

''کیا تو......؟''

''کوئی پرپوزل پسند آیا آپ کو؟'' مس مفتی کا حیران ہونا بنتا تھا اور وہ حیران ہوئیں۔

''نہیں، ابھی تک تو نہیں......'' خولہ نے اِک سکون کی لہر اپنے بدن میں دوڑتی محسوس کی تھی۔

''ایک پرپوزل کے بارے میں بات کرنے آئی ہوں میں آپ سے......'' اور یہاں تک آ کر اچانک اس کا گلا بند ہو گیا تھا......چاہ کر بھی اس کے حلق سے اگلی بات برآمد نہ ہوئی تھی۔ مس مفتی تذبذب کے عالم میں اس کی شکل دیکھ رہی تھیں۔ یہ ہچکچاہٹ اور پھر جیسے ایک دم ان پر انکشاف ہوا۔ وہ ریلیکس انداز میں پیچھے کو ہٹیں۔ خولہ کے چہرے پر ہچکچاہٹ ہی نہیں تھی۔ وہاں کچھ اور بھی تھا۔

''آپ اپنی بہن کے پروپوزل کے بارے میں بات کرنے آئی ہیں مسز جہانگیر؟'' انہوں نے دھماکا کیا......خولہ نے سانس روک کر انہیں دیکھا۔

''جی......''اور پھر سرسراتا ہوا اس کے منہ سے نکلا تھا تو خولہ کے چہرے پر محض ہچکچاہٹ ہی نہیں تھی۔ وہاں بے بسی بھی رقم نظر آتی تھی۔

☆......☆......☆

مزنہ بچ گئی تھی۔ اس نے خودکشی کی کوشش کی تھی مگر زیادہ مقدار میں گولیاں نہیں کھائی تھیں اور اس کا یہ ہی قدم تھا جس نے خولہ کو اتنا مجبور کیا تھا کہ اسے خود سے کہنا پڑا۔ گو کہ یہ معیوب بات نہیں ہے اور مذہب اس کی اجازت دیتا ہے مگر معاشرے نے اس چیز کو تہمت بنا کر رکھ چھوڑا ہے۔ اس نے مس مفتی سے کہا تھا کہ آپ کھلے دل سے فیصلہ کیجیے گا، اگر مزنہ انہیں پسند نہیں آتی یا پھر کسی اور وجہ سے وہ یہ رشتہ جوڑنا نہیں چاہتیں تو وہ صاف لفظوں میں اسے بتا سکتی ہیں۔ وہ برا نہیں مانے گی اور حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرے گی کہ یہ دو چار دن کا مسئلہ نہیں پوری زندگی کی بات ہے۔ اس نے ایک کوشش کی ہے برا ہوگا یا اچھا......یہ اب تقدیر ہی طے کرے گی اور جب مس مفتی اپنے والدین کے ہمراہ مزنہ کو دیکھنے آئیں اور انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت دی تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ ننگے پیروں اکیلی تنِ تنہا کیسے سنگریزوں پر چل کر آئی تھی۔ عزتِ نفس کو کیسے اس نے پتھر مار مار کر لہولہان کیا تھا۔ سر سجدے سے اٹھتا نہ تھا اور آنسو تھمتے نہ تھے۔ گو کہ انہیں ابھی مس مفتی کے گھر جانا تھا، ان کے بھائی سے ملنے لیکن یہ رسمی کاروائی تھی۔ وہ مس مفتی کو جانتی تھی اور اس سے کچھ چھپا نہ تھا اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ مس مفتی جس ظرف کا مظاہرہ اب کر چکی ہیں وہ آگے بھی ایسے ہی ظرف کا مظاہرہ کریں گی اور کبھی یہ بات کسی سے نہیں کہیں گی کہ مزنہ کا پروپوزل انہیں دیا گیا تھا۔ وہ خوش تھی، بے حد خوش......مزنہ سے بھی زیادہ مگر کچھ تھا......کچھ تھا جو اندر کہیں چٹکی بھرتا تھا، کاٹتا تھا اور دل بیٹھتا چلا جاتا تھا۔ شاید یہ خوف تھا۔ پچھلے حادثے کا خوف......اب کی بار بھی کہیں ویسا نہیں ہو جائے......محض یہ خوف......اور اس نے خود کو تسلی دی تھی۔ خود کو تھپکا تھا۔

☆......☆......☆

''تم نہیں جاؤ گی خولہ......؟'' احمد صاحب نے اسے تیار نہ دیکھ کر سوال کیا۔

''نہیں ابو......! مزنہ کا معلوم ہے ناں......پیچھے سے اگر طبیعت خراب ہوگئی تو؟''

''میں رُک جاتی ہوں مزنہ کے پاس......تم چلی جاؤ۔'' اسے عذر پیش کرتے دیکھ کر فرخندہ نے کہا تھا۔

''نہیں پھپو......ایک ہی تو آپ ہماری پھپو ہیں اور آپ بڑی بھی ہیں، معاملات کو مجھ سے زیادہ بہتر سمجھتی ہیں۔ آپ جائیں۔''

اس نے مسکرا کر انکار کیا۔

''اور وہ تمہاری پرنسپل جب تمہارے نہ آنے کا پوچھیں گی تو؟'' فرخندہ نے شال لپیٹتے ہوئے اور ایک اعتراض نکالا۔

http://kitaabghar.com

”میں بات کرلوں گی ان سے فون پر......اب مزنہ کو اکیلا تھوڑی......چھوڑ سکتے ہیں۔“

”ہاں......چلو ٹھیک ہے، خیال رکھنا۔“ فرخندہ نے اس کا گال تھپتھپایا اور وہ ان تینوں کو سی آف کرنے کے بعد تب تک دروازے میں کھڑی ہو کر گاڑی کو دیکھتی رہی کہ جب تک اس کی بیک لائٹس آنکھوں سے اوجھل نہ ہو گئیں۔ اور اس کا دل تھا کہ بے ترتیب دھڑکن سے دھڑکتا تھا۔ یوں جیسے کوئی بھدی چال چلتا ہو۔

☆......☆......☆

ان لوگوں کا پچھلا تجربہ اتنا خوفناک رہا تھا کہ اس دفعہ احمد صاحب نے سیدھا نکاح کی بات کی تھی۔ انہوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر اپنے تحفظات کا اظہار کیا تھا اور درخواست کی تھی کہ وہ لوگ نکاح کریں۔ مس مفتی سب کچھ جانتی تھیں سو یہ بات مسئلہ نہیں تھی اور آج...... بالآخر مزنہ کا نکاح تھا۔ بے حد سادہ سی تقریب تھی حتیٰ کہ مزنہ تیار بھی نہیں ہوئی تھی۔ موقع ہی نہیں ملا تھا۔ ایک دن احمد صاحب نے بات کی......دوسرے دن وہ نکاح کرنے پہنچ گئے تھے۔ مزنہ کے سر پر سرخ زرتار آنچل ڈال دیا گیا تھا اور جیسے ہی نکاح ہوا اور مولوی صاحب باہر تشریف لے گئے۔ مزنہ نے تیزی سے گھونگٹ اٹھایا اور شاک سے خولہ کو دیکھا یوں جیسے یقین نہ آتا ہو، خولہ نم آنکھوں سے مسکرا دی اور......بے اختیار اسے گلے سے لگایا تھا۔

”اوہو......بھئی کوئی جذباتی سین نہیں......“ اس نے اپنے پیچھے سے آواز سنی اور وہ مسکرا کر پلٹی تھی۔ وہ مس مفتی تھیں۔ خولہ بے ساختہ اٹھ کر ان کے گلے لگی تھی۔

”مبارک ہو مسز جہانگیر......!“ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر وہ پرجوش سی ہو کر بولیں۔ اور خولہ کا حلق آنسوؤں نے بند کر ڈالا۔ وہ بس ممنونیت سے سر ہلا کر رہ گئی تھی۔

”اب بھی بہنوئی سے ملنے کا ارادہ نہیں کیا آپ کا؟“ انہوں نے اس کا ہاتھ تھپتھپا کر پوچھا۔

”ارے نہیں......کیوں نہیں......“ اس نے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

”بس کچھ نہ کچھ ایسا ہوتا رہا کہ میں چاہ کر بھی ملاقات نہ کر سکی۔“

”مزنہ کو بھی لے آئیں......“ وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

”جی بس پانچ منٹ......ابھی لے کر آتی ہوں۔“ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور ساڑھی کا پلو سنبھالتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

☆......☆......☆

جوں جوں قدم فاصلے کو ماپتے جاتے تھے توں توں اس کا دل دھڑکتا جا رہا تھا۔ یوں جیسے ابھی کچھ ہو جائے گا۔ ابھی کچھ ہو جائے

گا۔ ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ ارد گرد بکھری آوازیں کہیں دور سے آتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس کے لیے پاؤں پاؤں چلنا بے حد مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ سانس جیسے کہیں پھنستی تھی اور سینے میں اِک تکلیف بن کر ابھرتی تھی۔ وہ اپنی ہتھیلیوں کو نم پاتی تھی۔ ہاتھ الگ لرزتے تھے۔ بے ارادہ اس نے آنکھیں زور سے میچی تھیں اور بالآخر وہ دونوں ڈرائنگ روم کے دروازے پر تھے۔ جان بوجھ کر اس نے نظر کو سامنے اٹھنے نہ دیا تھا۔ وہ آج اسے دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے نظر کو جھکانا چاہا مگر وہ اس کی مرضی کے برخلاف بھٹکی اور سامنے جا پڑی۔

وہ سامنے ہی تو تھا۔ صوفے پر بیٹھا ہوا...... وہ ہمایوں تھا...... کوئی اور تو نہ تھا...... وہ کوئی اور ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ وہ اچھے سے جانتی تھی۔ سفید شلوار سوٹ پر سیاہ ویسٹ کوٹ پہنے ہوئے...... جدید ہیئر کٹ، صاف رنگت، short stubble beard...... sharp jawline اور وہ چہرہ موڑے جہانگیر سے کچھ بات کر رہا تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اچانک جہانگیر نے اسے متوجہ کیا اور اس کی رہی سہی جان بھی نکل گئی تھی۔ ہمایوں نے سیدھا ہونا چاہا کہ یک دم سیل فون نے رنگ کیا تھا، وہ بے اختیار فون کی طرف متوجہ ہوا، سیل فون پاکٹ سے نکالا...... کال منقطع کی اور فون سینٹرل ٹیبل پر رکھ دیا۔ اور وہ ابھی تک سانس روکے اس کے متوجہ ہونے کی منتظر تھی۔

مزنہ کے قریب آنے پر ہمایوں نے اپنی جگہ چھوڑی اور پھر جیسے ہی سامنے نظر پڑی تو......

تو وہ لمحہ جیسے ساکت ہوا تھا...... ٹھہر سا گیا تھا...... سامنے مزنہ تھی...... اس کے دائیں طرف خولہ اور بائیں طرف مس مفتی کھڑی ہو چکی تھیں۔

''ہمایوں...... ! مسز جہانگیر...... مزنہ کی بڑی بہن......'' مس مفتی نے خولہ کا تعارف کروایا اور وہ چند لمحے کچھ کہہ نہ سکا۔

''السلام علیکم...... !'' خولہ نے خوش دلی سے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام...... !'' اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں جواب دیا اور بیٹھ گیا۔ وہ خولہ تھی جس کا دھڑکتا، بے قرار، خوفزدہ سا دل اب حالتِ سکون میں آیا تھا۔ کچھ نہیں ہوا تھا، کچھ بھی تو نہیں...... اس نے جیسے کھل کر سانس لی تھی۔

☆......☆......☆

وہ سب اب جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ رات کا اندھیرا پھیل رہا تھا اور گھر کی بیرونی بتیاں بھی جل چکی تھیں۔ وہ سب اس وقت ٹولیوں میں کھڑے تھے۔ مزنہ، مس مفتی اور مس مفتی کی والدہ، وہ مزنہ کو ساتھ لگائے کچھ کہہ رہی تھیں۔ احمد صاحب، ہمایوں اور جہانگیر ذرا الگ کھڑے باتوں میں مشغول تھے اور وہ یعنی خولہ گھر کی اندرونی سیڑھیوں پر کھڑی، دونوں ہاتھ سینے پر باندھے، سر چوکھٹ سے ٹکائے ان سب کو تکتی تھی...... وہ مطمئن تھی اور پُرسکون بھی...... سب بخیر و عافیت انجام پایا تھا...... مزنہ بھی کافی خوش دکھتی تھی۔

''چلیں ہمایوں...... !'' مس مفتی کے کہنے پر وہ متوجہ ہوا اور پاکٹ سے گاڑی کی چابی نکالی اور اس کے ساتھ ہی اس نے سیل فون کو تلاشا تھا۔ وہ سیل فون کہیں رکھ کر بھول چکا تھا۔

”وہ میں سیل فون شاید سینٹرل ٹیبل پر بھول آیا ہوں......آپ گاڑی میں بیٹھیں۔ میں ایک منٹ میں آیا۔“ چابیاں مس مفتی کو پکڑاتے ہوئے وہ اندر کی طرف بڑھا تھا۔

دہلیز پہ کھڑی خولہ ایک دم سیدھی ہوئی......ذرا سی نروس ہوئی، ہمایوں نے ایک قدم میں دو اسٹیپس عبور کیے اور کسی جھونکے کی مانند اس کے پاس سے گزرا تھا۔خولہ کا دل دھک کر کے رہ گیا تھا۔

چند لمحوں بعد اس کی پشت پر قدموں کی چاپ ابھری۔ متوازن، ہموار قدم......پھر چاپ آہستہ ہوئی اور پھر آہستہ ہوتے ہوتے عین اس کی پشت پر تھم گئی۔ وہ محسوس کر سکتی تھی۔ اپنی پشت پر ان دو نظروں کی تپش......ان دو آنکھوں کی چبھن......وہ تپش جیسے اسے جلانے لگی تھی۔ وہ دو آنکھیں جیسے خاردار بن کر اس کے وجود کے گرد لپٹنے لگی تھیں۔ تناؤ جیسے زہر بن کر فضا میں گھلا تھا اور وہ دیکھ سکتی تھی......آنکھوں کے کناروں سے وہ اس کے کندھے کے برابر آ کر رکا تھا، اس کے جبڑے بھینچے ہوئے تھے۔ ماتھے پر بل تھے اور چہرہ کسی کرب کو منعکس کرتا تھا۔ وہ سر اٹھائے سامنے دیکھتا تھا اور خولہ کی جان رک رک کر نکلتی تھی۔ وقت جیسے گھڑی کی ٹک ٹک میں بدلا اور ٹھہر ٹھہر کر گزرنے لگا......سیکنڈ بھی اپنا آپ بتا کر گزرتا تھا۔

”You made my life“ اور اس نے ایک دم ہونٹ سختی سے بھینچے۔ خولہ پر اس کا عمل لرزش بن کر اترا۔ اِک بے نام سی لرزش......کتنا ٹوٹا ہوا لہجہ تھا ناں اس کا......اس ادھورے جملے کے بعد خاموشی اپنی خاصیت کے ساتھ پھیلتی گئی اور اب وہاں سانس کی آواز تک نہ آتی تھی۔

”a mess...“ اور اب کے اس نے خولہ کو دیکھ کر جملہ مکمل کیا تھا......اور خولہ......؟ اس نے جھٹکے سے سر گردن اٹھا کر ہمایوں کو دیکھا۔

اور پھر وہ دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ نظر نہ ہٹا سکی تھی......جھکا نہ سکی تھی......خود کو روک نہ سکی تھی اور پھر......بے ساختہ منہ پر ہاتھ رکھے وہ لڑکھڑا کر پیچھے کو ہٹی تھی۔

”یہ، یہ میں نے کیا کر دیا کیا......؟“

”یہ اس نے کیا کر دیا تھا کیا؟“

☆......☆......☆

اس نے ساحر آنکھوں میں بھر بھر کا جل ڈالا......مسکارے سے پلکوں کو سجایا......لائنر کی مدد سے آنکھوں پر اِک سیاہ خط کھینچا اور اس خط نے آنکھوں کی دلکشی کو کچھ اور بڑھا دیا تھا۔ ہونٹوں پہ نیچرل لپ اسٹک کا ایک کوٹ کیا۔ کھلے بالوں کو سنوارا اور لمبی گردن سے ذرا اوپر اٹھا کر جوڑے کی شکل میں باندھ دیا۔ چہرے کے اطراف میں گری کالی لٹوں کو سیٹ کیا۔ کانوں میں لمبے لمبے آویزے پہنے جو کہ صاف

http://kitaabghar.com

طور پر نظر آتی اس کی کالر بونز کو چھوتے تھے۔ پھر ساڑھی کی فال ٹھیک کرتے ہوئے پلو اٹھایا۔ سیاہ پلو ہوا میں لہرایا اور اس کے شانے پہ جا ٹکا۔ اب کی بار اس نے آئینے میں اپنا تنقیدی جائزہ لیا تھا۔ اُسے اپنا آپ اچھا دکھا بلکہ ''اچھا'' کہنا زیادتی تھی۔ وہ خوبصورت تھی یا نہیں قطع نظر اس بحث کے وہ اس وقت دل کش نظر آتی تھی......دل پہ وار کرتی دکھائی دیتی تھی۔ اک لمحے کے لیے ٹھہر کر اس نے خود کو دیکھا اور پھر آئینے میں سے ہی بیڈ پہ بیٹھے اپنے شوہر کو دیکھا تھا۔ وہ اپنے کف لنکس بند کر رہا تھا۔ اسے بھی ایک تقریب اٹینڈ کرنی تھی مگر ان دونوں کو دو مختلف تقریبات اٹینڈ کرنی تھیں۔ وہ تذبذب کے عالم میں پلٹی......تھوڑی دیر اپنے شوہر کو دیکھتی رہی اور پھر ہچکچا کر اس کا نام پکارا اور اس کے متوجہ ہو کر دیکھنے پر بولی۔

''ساڑھی سوٹ کر رہی ہے مجھ پر؟'' وہ دراصل یہ جملہ نہ کہنا چاہتی تھی......وہ پوچھنا چاہتی تھی۔ ''میں کیسی لگ رہی ہوں؟'' مگر کہہ نہ پائی تھی۔ جھجک نے اسے کہنے نہ دیا تھا۔ اس کے شوہر نے اسے دیکھا، اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل تک آیا اور اپنے بال بناتے ہوئے بولا۔

''ہاں کر رہی ہے۔'' لہجہ عام سا تھا......اور کہیں سے یکدم کرش کی آواز آئی تھی۔ کچھ ٹوٹا تھا شاید......اس نے بے اختیار سر جھٹکا جیسے کہتی ہو۔ ''پوچھا ہی کیوں؟'' اس کے شوہر کو اسے ایک برتھ ڈے پارٹی میں چھوڑنا تھا اور خود بھی ایک تقریب میں جانا تھا۔ وہ واپسی پر اسے پک کر لیتا۔ اور یہ ہی وجہ تھی کہ وہ وقت سے ذرا لیٹ جا رہی تھی......اور یہی وجہ تھی کہ اس نے وقت سے ذرا پہلے پارٹی چھوڑ بھی دی تھی۔ وہ مس تبسم مفتی کے گھر جا رہی تھی۔ جانے سے پہلے اس نے ایک نظر پھر سے خود کو آئینے میں دیکھا اور اس کی ساحر آنکھیں آج جیسے اعلان کرتی تھیں۔

''ہے کوئی جو بچ کر دکھائے......''

وہ آنکھیں نہیں......وہ جادو تھا......کالا علم تھا......طلسم یا پھر شاید بد اثرات......اور وہ ہمایوں مفتی......جو اس سحر، اس طلسم اور ان بد اثرات کا شکار ہوا تھا اور کیا ہی بری طرح سے ہوا تھا۔

تو وہ مسز خولہ جہانگیر تھی......ساحر آنکھوں کی ملکہ......

☆......☆......☆

کچھ عرصہ قبل کہ جب اس نے خولہ کو پرپوز کیا تھا......اس کے بعد......جواب غیر متوقع پایا تھا اور یہ اتنا غیر متوقع......اتنا غیر یقینی تھا کہ ایک اس ''امکان'' کے بارے میں سرے سے سوچا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ مر کر بھی گمان اس ''امکان'' کو چھو نہ پاتا۔ گرد تک کو نہ پا سکتا۔

''وہ......میریڈ ہے......؟''

ہمایوں شاک کا کوڑا کھائے کھڑا تھا اور اس کی پشت کو تکتا تھا۔ اس نے دھوکا کھایا اور ٹھیک کھایا......وہ کہاں سے لگتی تھی میریڈ؟ کسی طرح سے بھی نہیں۔

''میں نے......میں نے......ایک......شادی شدہ عورت کو......ایک شادی شدہ......ایک عورت کو......؟''اور وہ بے دم ہو کر دو قدم پیچھے کو لڑکھڑایا......اور دوسرا احساس شرمندگی......

''میرے خدا......!''اس نے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آسمان کی طرف منہ کر کے کہا۔

''گاڈ......!''بے اختیار سر جھٹک کر اس احساس سے نجات پانا چاہی تھی۔مگر شاک بدترین تھا اور یہ اتنی جلدی جانے والا نہیں تھا۔ ساری پارٹی میں پھر وہ غائب دماغی کا شکار رہا تھا۔وہ یقین نہیں کر پا رہا تھا کہ یہ اس نے کیا کیا تھا......کیا کر دیا تھا......ایک شادی شدہ عورت کو پروپوز کیا......ایک شادی شدہ عورت کو......اور پھر اس کے بعد اس کے جسم پہ پسینہ بوندوں کی صورت پھوٹتا اور لہروں کی صورت بہنے لگتا۔

''ناقابلِ یقین......ناقابلِ یقین......''

وہ سر جھٹک کر بڑبڑاتا رہا......وہ بری طرح سے ڈسٹرب ہو رہا تھا۔

''اگر اس نے آپی سے کچھ کہہ دیا......؟اوہ میرے خدا......!''

ایک کے بعد ایک سوچ اسے ندامت کے نئے مفہوم سے روشناس کروا رہی تھی۔وہ تو اس کا نام تک نہ جانتا تھا اور یہ جرأت......

''ہاہ......میں نے یہ جرأت کی ہی کیوں......؟دماغ خراب تھا میرا کیا......؟کیا یوں کسی کو سرِراہ اس طرح سے پروپوز کیا جاتا ہے......؟اس طرح کی بات کی جاتی ہے......؟''پشیمانی سی پشیمانی تھی اور پشیمانی اب شدید پچھتاوے میں بدل رہی تھی۔وہ خود کو کوس رہا تھا اور اب اپنی ہی اس حرکت کو justified نہیں کر پا رہا تھا،یہ حرکت justified ہو بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ وہ اس وقت اس ''سحر'' کا شکار ہوا تھا۔وہ ساحرہ ''خولہ جہانگیر'' اس سمے،اس لمحے بری طرح سے ہمایوں مفتی پہ حاوی ہوئی تھی اور اس طرح سے ہوئی تھی کہ وہ ایک غیر ارادی حرکت کر بیٹھا تھا۔اس ذہنی ڈسٹربنس کا انجام یہ ہوا تھا کہ اسے پارٹی چھوڑ کر آنا پڑا تھا اور اب وہ اپنے کمرے میں سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے بیٹھا تھا......پریشان......شرمندہ،شاکڈ اور جانے کیا کیا......

☆......☆......☆

آف وائٹ شرٹ اور نیوی بلو ڈریس پینٹ میں ملبوس وہ آئینے کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا۔دو بھنوؤں کے درمیان ایک بل تھا اور چہرہ معمول سے زیادہ سنجیدہ،کفس کے بٹن بند کرنے کے بعد اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی دو ٹائیوں میں سے لائٹ بلو اسٹرائپس والی ٹائی کا انتخاب کیا اور اب وہ ٹائی باندھ رہا تھا۔ٹائی باندھنے کے بعد اس نے دونوں ہاتھوں سے شرٹ کے بل درست کیے اور پھر پرفیوم کی بوتل اٹھائی،بوتل کا نوزل کیپ پریس کرتے ہی مائع ایک پھوار کی صورت اس کی گردن پر گرا اور پورا کمرہ اِک دل فریب سی خوشبو سے مہک اٹھا تھا۔گر آئینے میں اسے دیکھو تو وہ ایک جاذبِ نظر مگر سنجیدہ مرد نظر آتا تھا جس کا فیشل ہیئر اسٹائل short stubble تھا۔پف ہیئر اسٹائل نے جیسے جاذبیت کو مزید بڑھایا تھا۔وہ اب کرسی پہ بیٹھا جوتے پہن رہا تھا اور اگر ایک طرف سے اسے دیکھیں تو اس کی ناک بے حد

http://kitaabghar.com

ستواں دکھائی دیتی تھی۔ چہرے کے تاثرات میں جھلکنے والی سنجیدگی اب تناؤ کی سی صورت اختیار کر رہی تھی...... یوں جیسے وہ ڈسٹرب ہو......جوتے پہننے کے بعد اس نے کھڑے ہو کر اپنی شرٹ اور پینٹ کو ایک دفعہ پھر سے درست کیا اور ایک دفعہ پھر بالوں کو سیٹ کیا اور پھر اک جھٹکے سے کوٹ اٹھایا، بازو پر ڈالا......سیل فون آن کیا......اور دروازہ کھول کر ملازم کو آواز دی......

''اصغر......اصغر حسین......!''اور اصغر حسین کسی جن کی طرح حاضر ہوا۔

''یہ بیگ اور فائلز گاڑی میں رکھو......''وہ گھڑی کو کلائی پہ باندھتے ہوئے مصروف سے انداز میں بولا۔

اصغر نے فوراً لیپ ٹاپ بیگ اور اس کے اوپر رکھی فائلز اٹھائی تھیں اور جن کی طرح ہی غائب ہوا تھا۔سیل فون کی اسکرین اس کی انگلی کے اشارے پر چل رہی تھی۔ وہ ای میلز، ٹیکسٹ اور واٹس ایپ میسجز، tweets اور مسڈ کالز دیکھتے ہوئے سیڑھیاں اترنے لگا۔ابھی وہ مکمل سیڑھیاں بھی نہیں اترا تھا کہ اسے آپی کی آواز سنائی دی۔

''ہمایوں! تم ناشتا کرو......میں بس پانچ منٹ میں تیار ہو کر آئی......''اسے دیکھ کر تبسم نے اپنی جگہ چھوڑی تھی۔ یہ روز کا معمول تھا۔اس آواز پہ وہ چونکا......متوجہ ہوا اور چند لمحے انہیں دیکھتا رہا۔

''آپی......! آپ دوسری گاڑی سے چلی جائیں۔ مجھے بے حد اہم کام ہے آفس میں......آج میں آپ کو ڈراپ نہیں کر سکوں گا......''اور یہ جملہ معمول کا حصہ نہیں تھا......سنجیدگی سے کہہ کر اس نے باقی کی سیڑھیاں عبور کیں اور باہر جانے والے راستے کی طرف مڑا۔

''ہمایوں! ناشتا نہیں کرو گے؟''

یہ اس کی ماں تھی......اس نے پیچھے دیکھے بنا......ہاتھ کے اشارے سے منع کیا اور باہر نکل گیا۔

اور وہ پہلا دن نہیں تھا کہ جس دن ہمایوں نے انہیں ڈراپ کرنے سے انکار کیا تھا۔ اس دن کے بعد یہ جیسے ہر روز کا معمول بن گیا تھا۔ وہ اس کی شکل دوبارہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ کوئی ایسا اتفاق بھی......اتفاق سے اس کے ساتھ پیش آ جائے۔اس نے تبسم آپی کے لیے اک مستقل ڈرائیور کا بندوبست کر دیا تھا۔جو ہوا......وہ بہت تھا اور وہ اس سے زیادہ کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

☆......☆......☆

''ہمایوں......! کیا بات ہے پچھلے کچھ عرصے سے تم ڈسٹرب لگتے ہو......؟''وہ دونوں اس وقت ٹی وی لاؤنج میں تھے۔ہمایوں سیاہ ٹراؤزر اور ہلکے براؤن رنگ کی ٹی شرٹ میں ملبوس دونوں ٹانگیں کراس کی شکل میں ٹیبل کے اوپر رکھے صوفے پہ نیم دراز اخبار پڑھ رہا تھا۔مس مفتی نو بجے کا نیوز بلیٹن دیکھ رہی تھیں کہ جبھی انہوں نے اچانک پوچھا تھا۔وہ چونکا......متوجہ ہوا......بے اختیار گلا کھنکھارا اور کہا......

''کچھ نہیں بس ورک لوڈ ہے......''اس نے اخبار کو ایک جھٹکا دے کر سیدھا کیا اور پھر سے پڑھنے لگا تھا۔

''یہ کیسا ورک لوڈ ہے ہمایوں جو اتنے لمبے عرصے پہ محیط ہے؟''

ہمایوں نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔ وہ ڈسٹرب تھا اور ضرور تھا اور کس وجہ سے تھا اب یہ بات بتانا ایک حماقت ہوگی۔ مگر وہ جو حیران ہوا تھا وہ آپی کے ''لمبے عرصے'' والے الفاظ پہ ہوا تھا۔ وہ اب LCD آف کر کے اسی کی طرف متوجہ تھیں۔ پوری کی پوری......

''کیا مطلب لمبا عرصہ......؟'' وہ واقعی نہیں سمجھا تھا۔

''بھئی ایک ماہ سے تمہیں دیکھ رہی ہوں، تم معمول سے ہٹ کر behave کر رہے ہو۔''

''ایک ماہ......؟'' ہمایوں نے ایک صدماتی کیفیت میں یہ الفاظ دہرائے اور پھر میکانکی انداز میں اخبار پہ لکھی تاریخ پڑھی تھی اور تاریخ کہتی تھی کہ ہاں......''ایک ماہ'' ہو چکا تھا۔ وہ تو ٹھیک طرح سے حیران بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ سامنے بہن موجود تھی۔ اس کے پیٹ میں جیسے گھونسا پڑا تھا۔ اس نے ٹیبل سے پیر ہٹائے اور بے اختیار سیدھا ہو کر بیٹھا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنی گردن کی پشت کو سہلایا تھا...... یوں جیسے ریلیف حاصل کرنا چاہتا ہو۔

''ہمایوں......؟'' مس مفتی کا انداز سوالیہ تھا۔

''کچھ نہیں آپی...... بلیومی! ورک لوڈ ہے اور بھلا کیا ہوگا؟'' وہ دقت سے مسکرایا اور جب مسکرایا تو اندازہ ہوا کہ یہ ایک بھونڈی حرکت تھی۔ مس مفتی چند لمحے اسے دیکھتی رہیں۔

''تم کہتے ہو تو مان لیتی ہوں۔'' کندھے اچکا کر کہتے ہوئے وہ وہاں سے اٹھ گئی تھیں۔ وہ کچن کی طرف جا رہی تھیں اس کے لیے گرم دودھ کا ایک گلاس لانے کے لیے......اور وہ کھل کر حیران ہوا۔

''ایک ماہ......ایک ماہ......'' اور وہ حیرت سے بڑبڑاتا تھا۔

☆......☆......☆

''ایک ماہ......؟ میرے خدا......ایک ماہ......؟'' اور وہ کیا سمجھا......وہ یہ ہی سمجھا کہ اس پارٹی والی رات کے بعد سے ابھی محض چند دن ہی تو گزرے ہیں۔ محض چند دن ہی تو......وہ یہ ہی سمجھتا رہا اور ایک ماہ گزر گیا۔ ستم یہ تھا کہ اسے بتائے بنا ایک ماہ گزر گیا۔ اس کی حالت وقتی تھی۔ شرمندگی تھی......ایک حادثہ تھا......وقت کے ساتھ ٹھیک ہو جاتا مگر......مگر اس کی بہن کہتی تھی اس رات کو ایک ماہ گزر چکا ہے اور وہ ٹھیک ہی کہتی تھی۔ اس بات پہ کلینڈر پر نظر آتی تاریخ، اس کی گھڑی پہ ڈیجیٹل فارم میں چمکتے ہندسوں اور اخبار کے ہیڈر پر لکھی تاریخ نے بھی مہر ثبت کی تھی اور وہ مجبور ہوا تھا کہ وہ ایک اندھیرے کمرے میں سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بیٹھے پھر بے یقینی اور شاک سے دُہرائے۔

''ایک ماہ......میرے خدا......ایک ماہ......'' یہ ٹھیک نہیں تھا۔ یہ بالکل بھی ٹھیک نہیں تھا۔ تو کیا ابھی تک وہ اس ایک بات اور اس بات کے اثر سے نکل نہیں سکا تھا......تو کیا ابھی تک وہ......وہیں اسی راستے پہ، اسی حالت میں اور اسی کیفیت میں گھرا کھڑا تھا......تو کیا وہ آگے نہیں بڑھ سکا تھا؟ تو کیا اسے وقت کے گزرنے کا احساس تک نہیں ہوا تھا؟ دن، مہینے، گھنٹے، لمحے، ساعتیں......سب اسے خبر دیئے بنا

گزری تھیں...... یہ کیسے ہوسکتا...... کیسے؟ اس نے بے چارگی سے ہاتھ بیڈ پر مارا تھا۔ ایک مرد ہو کر وہ اس ذرا سی آکورڈ صورتحال کے aftermath پہ قابو نہ پا سکا تھا۔ کیوں......؟ آخر کیوں......؟ کیا حادثہ اس بری طرح سے حاوی ہوا تھا اس پر کہ وہ مزاحمت نہیں کر پا رہا تھا......اس کے اثر سے نکل نہیں پا رہا تھا۔ ٹھیک ہے وہ اِک عام بات ہرگز نہ تھی۔ چلو کچھ معمول سے ہٹ کر ہوا...... پر ایسا بھی کیا کہ وہ اِک ماہ تک اُسی کیفیت کا شکار رہے اور ہمایوں پہ حیرت بار بار وار کرتی تھی اور ہر وار پہلے سے بڑھ کر سخت ثابت ہوا تھا۔

''وہ ساحرہ......نہیں وہ عورت......وہ کیوں میرے ذہن سے نکل نہیں پاتی......آخر کیوں......؟''

اب کہ وہ تکلیف سے، بے چارگی سے بڑبڑایا تھا۔ اتنی بڑی دنیا میں محض وہ ہی اک عورت تو نہ تھی۔ دنیا اس کے سوا بھی تو تھی۔ وہ تو بس اِک ذرّہ تھی۔ ذرا سا......اتنا سا......کہ گم ہو جائے تو مِل کر نہ دے......اوجھل ہو جائے تو دکھائی نہ دے تو پھر وہ ذرا سا......اتنا سا ذرّہ کیوں اتنا حاوی ہو رہا تھا......؟ کیوں یہ ذہن ابھی تک اسی ایک شاک میں جکڑا ہوا تھا۔ یوں جیسے ٹھٹھر کر اسی ایک نقطہ پہ ٹھہر گیا ہو...... کیوں......؟ اور یہاں پہ آ کر ہمایوں مفتی غلط ہو گیا بلکہ غلط سے بھی غلط ہو گیا......وہ ذہن سے اس عورت کو کھرچتا رہا۔ وہ غلط مقام پہ...... غلط چیز کو کھرچتا رہا......ختم کرنے...... ہٹانے کی کوشش کرتا رہا۔ نقش ذہن پہ ثبت نہ ہوا تھا، نقش ''دل'' پر کھدا تھا......ذہن اسے دیکھ کر اس کی جانب مائل نہ ہوا تھا...... یہ ''دل'' تھا......تو کر لے جتنی بھی کوشش اس نے کرنی ہے اس عورت کو ''ذہن'' سے نکالنے کی......

جب سمت ہی غلط ہو تو کوشش چاہے کتنی بھی سخت کیوں نہ ہو......جیسی بھی شدت سے کیوں نہ کی جائے وہ بھلا بار آور کیسے ثابت ہو......؟ بھلا کیسے......؟

☆......☆......☆

تو پھر کیا ہوا؟ کیا ہوا قصہ......؟ تو کیا ہمایوں کامیاب ہوا؟ تو کیا اس نے ممکن کر دکھایا......؟ تو کیا وہ اس حالت......اس فیز، اس کیفیت سے باہر نکل آیا؟ جواب فقط ایک لفظی ہے......''ہاں''......وہ نکل آیا تھا۔ بڑا ہی کوئی سورما ثابت ہوا پھر تو وہ جو اس حالت، کیفیت اور اس فیز سے نکل آنے میں کامیاب ٹھہرا تھا کہ عموماً نفوس کو پٹتے ہی دیکھا اور سنا......تو اس نے جلد ڈھونڈ لیا تھا تریاق......اس نے خود کو مصروف کر لیا لیکن یوں نہیں کہ کھانے کا ہوش اور نہ پینے کا......دن کی خبر اور نہ رات کی......زندگی کسی سمت میں بھاگتی چلی جائے اور وہ کہیں اور......فیملی کدھر ہے......کدھر نہیں......کچھ معلوم نہیں......نہ......ایسی مصروفیت ہرگز نہیں......اس نے خود کو healthy activities میں مصروف کیا تھا......جم، اسکواش، فیملی ٹائم، ریڈنگ اور، اور اللہ سے دوستی۔ اللہ سے گفتگو ہاں نماز اور بس نماز......

سخت روٹین اور ہوم اپلائنسز کے بزنس کی وجہ سے محض جمعہ پڑھ پاتا تھا مگر اب اس نے کوشش کی وہ ''نماز'' کو بھی روٹین بنا سکے اور وہ کامیاب جا رہا تھا۔ وہ اس حالت سے نکل آیا اور اپنا زیادہ وقت فیملی کو دینے لگا۔ leisure time بھی ماں اور بہن کے ساتھ گزارنے لگا۔ اور یہ اچھا رہا...... بے حد اچھا رہا تھا۔ جیسی انرجی......جیسا سکون فیملی کے ساتھ وقت گزارنے پر ملتا ہے وہ کسی ٹیبلٹ میں

http://kitaabghar.com

ہے اور نہ ہوگا......فیملی ٹائم آپ کی ذہنی پریشانیوں کو یوں زائل کرتا ہے جیسے وہ کبھی تھی ہی نہیں۔ یہ ٹوٹکا آزما کر دیکھنے والی چیز ہے۔ پڑھ کر سمجھ میں آنے والی بات نہیں......خیر وہ کامیاب رہا تھا۔ اب بھی اِک فیملی ڈنر ہی تھا۔ بہترین ماحول، بہترین لوکیشن اور وہ تینوں تبسم، ہمایوں اوران دونوں کی ماں زہرا......باپ تھا مگر نہ ہونے کے برابر......علیحدگی ہوگئی تھی زہرا کی بہت سالوں پہلے کہ جب تبسم اٹھارہ سال کی تھیں۔ ان کی شادی ان کے باپ نے بدلے میں کی تھی اور اپنی دلہن بیاہ کر لائے تھے تو بس......تبسم کی شادی رہی اور نہ ان کا گھر......زہرا متمول گھرانے سے تھیں اور ہوم اپلائنسز کا بزنس ان کے باپ کا تھا جو کہ زہرا کے بعد ہمایوں نے اس کامیابی سے سنبھالا تھا کہ اب اس بزنس میں وہ سب سے زیادہ شیئرز کا مالک تھا۔ اپنے دونوں ماموں سے بھی زیادہ......سو وہ تینوں تھے اور خوب صورت لمحات تھے۔

''امی......!جبران کی شادی ہے اس ویک اینڈ پر......اس نے آپ کو بھی انوائٹ کیا ہے۔''اس نے چکن تکے کے ٹکڑے کو کاٹا اور پھر کانٹے میں پھنسا کر منہ میں ڈالتے ہوئے قدرے بے پروائی سے ماں کو بتایا تھا۔

''ہاں......سب کرلیں گے شادی، بس تم ہی نہ کرنا......ہم تو بس تمہارے دوستوں کے receptions بھگتانے کے لیے ہیں۔'' وہ تبسم تھیں جو ہمایوں کے بات مکمل کرتے ہی چڑ کر بولی تھیں۔

ہمایوں کا چلتا منہ بے اختیار رستہ ہوا۔ اس نے رک کر پانی کا ایک گھونٹ بھرا تھا اور ایسا اسے نوالے کو حلق سے نیچے اتارنے کے لیے کرنا پڑا تھا۔ اور یہ پہلا وار تھا۔ اس نے کچھ محظوظ سے انداز میں ماں کو دیکھا......زہرا نے بس اِک ناراض نظر سے ہی کام لیا تھا۔ ٹیبل پر ایک دم خاموشی چھا گئی تھی کہ وہاں چمچ، کانٹوں کی آواز بھی نہیں تھی۔

''آخر مسئلہ کیا ہے ہمایوں......؟''زہرا نے پوچھا۔

''کچھ خاص نہیں......''اس کی ساری توجہ کھانے پہ تھی۔

''یعنی کہ کوئی مسئلہ تو ہے۔''تبسم نے بات اچکی۔ اور ہمایوں کے چہرے پر ''اُف'' کے تاثرات ابھرے۔ اس نے ایک نظر اٹھا کر آپی کو دیکھا۔

''کوئی پسند ہے؟''تبسم کا لہجہ شرارتی ہوا اور وہ اک دم سن ہو کر رہ گیا تھا۔

لفظ ''پسند'' پر اِک چہرہ بلاارادہ، بےساختہ اور بے اختیار......ذہن کی اسکرین پر ایک جھماکے کے ساتھ روشن ہوا۔ یوں جیسے لفظ ''پسند'' کوئی کوڈ ورڈ تھا۔

''نہیں کوئی نہیں......''اس نے سامنے رکھی پلیٹ پرے کھسکائی۔

''تو پھر بولو......کس کے لیے بات کریں......؟ ممتاز ماموں کی مشال کے لیے یا پھر......''

''آپی پلیز......!''وہ بیزار ہوا۔

''شادی کوئی چھوٹی چیز نہیں ہے...... میں ایسے ہی، منہ اٹھا کر نہیں کرنا چاہتا، میں زندگی کو سمجھنا چاہتا ہوں، جاننا چاہتا ہوں۔ خود کو میچور بنانا چاہتا ہوں تاکہ کل کو جو بھی میری لائف میں آئے میں اسے ایک مکمل اور معیاری طرزِ زندگی دے سکوں۔'' اور اسی بیزاری کے ساتھ اس نے بات مکمل کی تھی۔

''تبسم......! تم اسے اتنا فورس مت کیا کرو...... ہمایوں ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اسے اپنی مرضی اور رضامندی سے فیصلہ کرنے دو۔ زندگی اور شادی دونوں ہی مذاق نہیں ہیں۔'' زہرا نے تبسم کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے منع کیا...... وہاں اب کوئی بھی کھانا نہیں کھا رہا تھا۔

''امی! میں اسے بلاوجہ فورس نہیں کرتی۔ خوشی پہ ہمارا بھی حق ہے یا نہیں......؟ اتنے سالوں سے ایک جیسی زندگی جی رہے ہیں ہم......''

''کس نے کہا کہ خوشی پر آپ کا حق نہیں۔'' ہمایوں نے بات اچکی۔

''آپ ہاں تو کریں آپی...... اب میں ابو جیسا فیصلہ نہیں کروں گا۔ مگر آپ...... مجھے تو فورس کرتی ہیں اور خود مان کے نہیں دیتیں۔'' اور تبسم بری طرح تلملائی تھی...... وہ بات کو کہاں سے کہاں لے آیا تھا۔

''مجھے شادی نہیں کرنی ہے ہمایوں...... جو ایک ہو گئی تھی...... وہ ہی ساری عمر کے لیے کافی ہے مجھے۔'' وہ اتنی تلخ ہو کر بولی تھیں کہ وہ دونوں ہی خاموش ہو گئے تھے۔

''کھانا کھائیں......'' ہمایوں نے اپنا سیل اٹھا کر آن کرتے ہوئے آہستگی سے کہا...... اور وہاں ایک بار پھر سے چمچوں اور کانٹوں کی آوازیں کھنکنے لگی تھیں مگر ان آوازوں میں اب رغبت سنائی نہ دیتی تھی۔ اِک بے دلی سی تھی...... جو کہ صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

☆......☆......☆

وہ کچھ بھی نہیں تھا...... کچھ بھی تو نہیں تھا۔ وہ محض کسی کی شال کا سیاہ پلو تھا جس نے اسے ٹھٹکایا اور پھر ساکت کر دیا۔ اس کے قدم بریک پر پڑے اور گاڑی کے ٹائرز زور سے چرچرائے تھے۔

''نان سینس......'' طیش سے اس نے زور سے ہاتھ اسٹیرنگ پر مارا تھا...... یہ دوسری دفعہ ہوا تھا۔ دوسری دفعہ...... ماتھے پر بل، چہرے پر تناؤ اور اسٹیرنگ پر جمے ہاتھوں کی سختی بتاتی تھی کہ وہ کس قدر مشتعل ہوا تھا۔ پھر ایک دم اس نے اسٹیرنگ چھوڑا...... دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ کر اِک گہری سانس لی۔

''میرے خدا...... یہ کیا ہے......؟ یہ کیا ہے؟'' اور وہ از حد بے بس نظر آتا تھا...... ایک بار ہوا...... دوسری بار، تیسری، چوتھی بار ہوتا اور پھر کئی بار...... وہ روک نہیں سکتا تھا، وہ جان گیا تھا کہ یہ لاشعوری طور پر ہوتا ہے۔ وہ پچھلے کئی ماہ سے مسلسل کوشش اور مزاحمت کی حالت میں تھا۔ وہ اس احساس کو دفن کرتا اور پھر سے کوئی نہ کوئی چیز...... اسے یوں اگل کر، باہر لا کر پھینک دیتی کہ جیسے سیپ کو سمندر......

یہ تکلیف دہ تھا...... بہت تکلیف دہ تھا۔ وہ ستھرے ذہن کا مالک تھا اور یہ بات برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ایک شادی شدہ عورت

کو اس نظر سے نہیں دیکھنا چاہتا تھا مگر...... یہ ہو کیا رہا تھا...... کیا......؟ اب کی بار ہمایوں نے لاچاری سے اپنا ماتھا اسٹیرنگ کے ساتھ ٹکا دیا۔

''میرے اللہ......! مجھے معاف کرنا...... معاف کر دینا۔'' اس کے جسم میں ایک جھرجھری سی جاگی تھی۔

اک کپکپی...... اک لرزش سی اتری...... اس نے سر اٹھایا اور چند لمحے سامنے خلا میں دیکھتا رہا اور پھر جیسے کچھ فیصلہ کرتے ہوئے اس نے گاڑی اسٹارٹ کی تھی۔ وہ اس ایک مسئلے کے لیے ہر کوشش کرنے پہ تیار تھا، اسے بس حل چاہیے تھا۔ وہ اس حالت، اس کیفیت سے باہر آنا چاہتا تھا...... جان چھڑوانا چاہتا تھا۔ بدلے میں وہ ہر چیز کرتا...... ہر وہ کام...... جو بھی اسے کرنا پڑتا...... وہ تیار تھا۔

ہاں وہ تیار تھا......

وہ اب سائیکالوجسٹ کے پاس جا رہا تھا۔ یہ حالت اب chronic بنتی جا رہی تھی اور اس کے نزدیک یہ صرف دماغ کا خلل تھا اور کچھ بھی نہیں۔

☆......☆......☆

صبح چھ بجے جب وہ جاگنگ سے واپس آیا تو تبسم بھی جاگ رہی تھیں۔ اس نے دور سے ہی انہیں دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ وہ مسکرائیں۔

''میں نے سوچا تھا کہ آج اتوار ہے تو میں بھی تمہارے ساتھ واک پہ چلوں گی مگر میرے آنے تک تم جا چکے تھے۔'' وہ اس کے قریب آنے پہ بولی تھیں۔

''تو آپ مجھے ایک کال کر لیتیں، میں واپس آ جاتا......''

''ہا...... میرے ذہن میں ہی نہیں آیا......'' اور وہ ان کی ''ہا'' پہ مسکرایا۔

''تو چلیں...... ابھی چلتے ہیں۔'' اس نے پیروں کا رخ بدل کر ہاتھ بڑھایا اور تبسم کو ٹوٹ کر اس پہ پیار آیا تھا۔ اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام کر بے اختیار انہوں نے اسے چوما۔ وہ محبت کے اس مظاہرے پہ ہنس دیا پھر محبت سے ہی ان کے شانوں کے گرد بازو پھیلایا تھا اور اب وہ دونوں تھے...... صبح کی چہکتی خاموشی تھی، پرندوں کی بولیاں تھیں اور خنک فضا...... ہاؤسنگ اسکیم کی لینز میں سے ہوتے ہوئے وہ مقامی پارک تک آئے تھے۔ وہ دونوں خاموش تھے اور اسی خاموشی کے ساتھ انہوں نے جاگنگ ٹریک کا چکر واک کرتے ہوئے کاٹا تھا۔

''مجھے معلوم ہے کہ اب آپ کیا سوچ رہی ہیں اور کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔'' ان کے چہرے پہ پھیلے تذبذب کے اثرات دیکھ کر ہمایوں نے اک آہ بھر کر کہا تھا، یوں جیسے کہتا ہو۔

''آپ کا کچھ نہیں کیا جا سکتا آپی......!''

''یہ اچانک...... آج واک کا ارادہ بھی اسی لیے بنایا تھا ناں آپ نے؟''

اور تبسم کے چہرے پہ حیرت اِک لمحے کے لیے پھیلی اور پھر انہوں نے بدمزہ ہو کر اوپر درخت کی جھکی ٹہنی سے پتا توڑا تھا۔

''میں نے اتنی لمبی تمہید سوچی تھی کہ ایسے بات شروع کروں گی۔ اس طرح تمہیں پوائنٹ پر لاؤں گی اور تم...... حد ہے بندے کو اتنا نبض شناس بھی نہیں ہونا چاہیے ہمایوں......''

''ہاہاہا......'' وہ کھل کر ہنسا اور اس کے ہنسنے پر وہ اور بدمزہ ہوئیں اور رک کر اسے خفگی سے دیکھا۔

''تم کیوں بچ رہے ہو اس بات سے؟''

''نہیں، میں بچ نہیں رہا...... میں صرف تھوڑا سا وقت لینا چاہتا ہوں۔

''کیوں......؟ کوئی مسئلہ ہے، کوئی کمٹمنٹ ہے؟ آئی مین کسی کو پسند کرتے ہو اور کوئی رکاوٹ ہے کیا؟ کھل کر بتاؤ ہمایوں...... بلیومی...... میں آخری حد تک جاؤں گی۔'' بات کرتے کرتے یکدم انہوں نے اس کے بازو پہ ہاتھ رکھ کر شدت سے کہا تھا......

ہمایوں کے اندر جیسے بم پھٹا اور اس وقت پُرسکون رہنا اِک اذیت، ایک تکلیف کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اس نے بلا ارادہ سر جھکایا۔

''آپی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ چلیں آئیں...... آج میں آپ کو کھل کر ساری صورتحال سمجھاتا ہوں۔''

ذرا سے توقف کے بعد اس نے نرمی سے کہا اور اک بار پھر ان کے شانوں کے گرد بازو پھیلا کر وہ چلنے لگے تھے۔

''آپ جانتی ہیں پچھلے چھ ماہ سے آفس کی نئی برانچ کھولنے کے لیے construction ہو رہی ہے اور تاحال کام مکمل نہیں ہوا اور نئی برانچ بھی کھل نہیں سکی...... اور جیسا کہ آپ جانتی ہیں کہ دونوں بزنس پارٹنرز تعمیرات کے کام میں میرے علاوہ کسی اور پہ بھروسا نہیں کرتے تو میرے سر پہ یہ کام ایک مسلسل لٹکتی تلوار ہے۔'' وہ دھیمے لہجے میں بول رہا اور تبسم غور سے سن رہی تھیں۔

''اس کے علاوہ ایک نہیں...... دو نہیں پورے پانچ کنٹینرز ہمارے پاک چائنا بارڈر پر پھنسے ہوئے ہیں، اور یہ مسئلہ حل نہیں ہو رہا...... مجھے خود خنجراب جانا پڑے گا۔ تو یہ کام بھی وقت طلب ہے اور بزنس میٹنگ، ڈیلز اس کے علاوہ ہیں، سو فی الحال اگلے کئی ماہ تک تو میں فارغ نہیں ہوں اور ایسے میں شادی کے بارے میں سوچنا...... اوہ کم آن یار...... مجھے ان سب سے فارغ ہو لینے دیں تاکہ میں سکون سے اس کے بارے میں سوچ سکوں اور آپ کو available بھی ہو سکوں، ورنہ پھر ہو گا کیا......؟ آپ کے مہمان ڈنر یا لنچ پہ میرا انتظار کرتے ہی رہ جائیں گے۔'' وہ انہیں دیکھ کر مسکرایا۔ تبسم نے بے اختیار ایک گہری سانس بھری تھی۔

''ہمایوں......! یہ بس چند ماہ ہیں تمہارے پاس ورنہ پھر مجھے جو بھی لڑکی پسند آئی میں نے بیاہ لانی ہے...... اوکے؟'' انگلی اٹھا کر اسے تنبیہہ کی گئی تھی اور بے ساختہ اس کے حلق سے کچھ نیچے اترا...... اور اس نے ان کی اٹھی انگلی کو دونوں ہاتھ میں لے کر ہلکے سے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ وہ دونوں اب واپسی کے راستے پر تھے۔ وہ ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سر جھکائے چل رہا تھا اور تبسم اس کے بائیں کندھے کی طرف چلتے ہوئے بلاتکان بولی چلی جا رہی تھیں۔ وہ یقیناً اس کی شادی کے علاوہ کوئی دوسری بات نہیں کر رہی تھیں۔ وہ اسے بتا رہی تھیں کہ کون سا میرج لان بک کروانا ہے، کیسی تھیم رکھنی ہے، Reception کیسا ہو گا، وغیرہ وغیرہ اور وہ مجبور تھا کہ وہ ان کی سنے اور سر جھکائے چلتا رہے۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اسے کل وقتی ملازمہ دکھائی دی تھی، جو کہ ابھی ابھی اپنے کوارٹر سے اٹھ کر گھر کی اندرونی جانب جا رہی تھی۔ تبسم خاموش نہیں ہو رہی تھیں اور وہ مزید ایک گھنٹا اس موضوع کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

''شاہدہ باجی......!''اس نے بے اختیار پکارا۔ باجی شاہدہ تو کیا، تبسم نے بھی سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ وہ یوں کم ہی مخاطب کیا کرتا تھا۔

''کتنے دن ہو گئے میری الماری کو ہاتھ لگائے؟'' وہ سر کھجاتے ہوئے بے حد عام سے لہجے میں پوچھ رہا تھا اور باجی شاہدہ پر گھڑوں پانی پڑا تھا۔

''وہ ہمایوں بیٹا......!''

''آج ذرا اس پر نظرِ کرم کر دیجیے گا۔'' ان کے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ آرام سے کہتا ہوا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا تھا۔ اور نہیں جانتا تھا کہ ایسا کہہ کر اس نے مصیبت کو دعوت دی تھی کہ وہ آئے اور اس کے گلے پڑ جائے اور مزید اس کے لیے fuss پیدا کرے۔

☆......☆......☆

''باجی! ہمایوں صاحب کی الماری سے یہ فائل ملی ہے۔ اسے کہاں رکھنا ہے؟'' شاہدہ نے ایک فائل لا کر تبسم کو دی تھی۔ ہمایوں کے کمرے سے کوئی کاغذ یا پھر کاغذ کا ٹکڑا ہی کیوں نہ ملے......وہ سنبھال کر رکھنا ہوتا تھا۔ اسی واسطے شاہدہ نے وہ فائل تبسم کو لا کر دی تھی۔

''لاؤ میں خود سنبھال دیتی ہوں۔'' تبسم نے اسکے ہاتھ سے فائل لی اور فائل لیتے اِک لاشعوری سی بلاارادہ نظر فائل پر پڑی تھی اور...... اور ساتوں کے ساتوں آسمان اپنے قہر سمیت ان کے سر پر ٹوٹ پڑے تھے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس فائل کو دیکھ رہی تھیں یوں جیسے یہ دنیا کی آخری وہ بات بھی نہ تھی کہ جس کے وقوع پذیر ہونے کا امکان بھی کبھی نہ ہوتا......

ہاں کبھی بھی نہ ہوتا......

فائل ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گری تھی۔

''ہمایوں......!'' اور ان کے لب بلا آواز ہلے تھے۔

ناول **نار** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **10** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 5

اس کے سامنے ایک بڑا سا نقشہ کھلا ہوا تھا اور ساتھ میں کئی دوسرے صفحات بھی تھے۔ رول کیے ہوئے کچھ چارٹ پیپرز اور اسی طرح کی دوسری چیزیں۔

پروجیکٹر ابھی تک آن تھا اور اسکرین پہ ایک گراف نظر آ رہا تھا جو کسی قسم کی پروگریس کو ظاہر کر رہا تھا۔ اس کا لیپ ٹاپ بھی آن تھا اور اس کے سامنے دو افراد موجود تھے۔ وہ تینوں ہی اپنے کام میں بری طرح سے محو تھے۔ اور ان کے چہروں کی سنجیدگی خطرناک تھی۔ وہ نئی برانچ کے تعمیراتی کام کا جائزہ لے رہا تھا اور کام کی رفتار کو چیک کرنے کے واسطے یہ میٹنگ کال کی گئی تھی۔ باقی افراد جا چکے تھے بس وہ تین ابھی تک میٹنگ روم کی اس لمبی سی میز پہ کاغذ بکھرائے بیٹھے تھے۔ وہ تینوں نہیں جانتے تھے کہ میٹنگ روم کے کھلے دروازے میں سے کوئی اندر داخل ہوا تھا۔ اور چند لمحوں بعد ہمایوں نے اپنے کندھوں پہ شفقت بھرے ہاتھوں کا دباؤ محسوس کیا۔ اس نے ترنت مڑ کر دیکھا۔

''ماموں......!'' اس کے چہرے پہ بے اختیار مسکراہٹ آ گئی اور سنجیدگی جیسے اچک لی گئی تھی۔

''چلو بھئی...... بھاگو یہاں سے۔ بہت کر لیا کام...... اٹھو، اٹھو شاباش......'' وہ ولی ماموں تھے۔ ہمایوں کے چھوٹے ماموں...... انہوں نے چٹکی بجا کر کہتے ہوئے ان دو افراد کو اٹھنے کا کہا تھا۔ وہ دونوں پیپرز کو سنبھالتے اور رول کرتے ہوئے اٹھ گئے تھے۔ ہمایوں مسکرا کر انہیں دیکھتا رہا۔ وہ یقیناً اس سے کوئی اہم بات کرنے آئے تھے۔ وہ ان کے اس انداز سے واقف تھا۔

''خیریت......؟'' بال پوائنٹ کو دو انگلیوں کے درمیان گھماتے ہوئے، اس نے ابرو اچکا کر پوچھا۔ وہ اب کرسی پر آرام دہ انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔

''تمہاری شکل حافظے سے محو ہوتی جا رہی تھی، اس سے پہلے کہ مکمل محو ہو جاتی، میں نے سوچا ذرا یاد ہی کر لی جائے......'' وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے تھے۔

ہمایوں نے بے اختیار سر کھجایا۔ وہ ایسی عزت افزائی کا عادی تھا۔ وہ یقیناً اِک طنز بھرا شکوہ تھا۔

''کام کی صورتحال دیکھ رہے ہیں نا آپ......؟ پھر بھی بے عزتی کر کے اپنے بڑے ہونے کا رعب جمانا چاہتے ہیں تو......'' اور اس نے کندھے اچکا کر لاچاری کا اظہار کیا تھا۔ ولی چند لمحے اس کی صورت دیکھتے رہے اور پھر اِک گہرا سانس لیا تھا۔

''تمہاری بہن آئی تھی میرے پاس......'' اور ہمایوں اِک جھٹکا کھا کر سیدھا ہوا۔ بات کی تہہ تک پہنچنے کے لیے اسے دماغ استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔

''میری شادی کا مسئلہ لے کر...... ہے نا؟'' اس کے ماتھے پہ بے اختیار بل نمودار ہوئے تھے۔

''نہیں......!'' ولی اِک توقف کے بعد بولے۔

''وہ بہت روئی ہے ہمایوں......'' اور ولی کے ان الفاظ پہ ہمایوں نے انتہا حیرت سے انہیں دیکھا۔

''کیوں......؟'' اور لفظ ''کیوں'' کے اندر حیرت کا اِک سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا۔

''تمہاری انگلی پہ چبھا اِک ذرا سا کانٹا بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی کجا کہ......'' اور ولی ماموں نے تکلیف سے بات ادھوری چھوڑی اور وہ چپ چاپ انہیں دیکھتا رہا۔

ولی نے کہنیاں میز پر رکھیں، ہاتھ اِک دوسرے میں پھنسائے اور گردن موڑ کر براہ راست اس کی حیران آنکھوں میں دیکھا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ہی بیٹھے تھے۔

''تم سائیکالوجسٹ کے پاس کیوں جا رہے ہو ہمایوں......؟''

اور کمرے میں رکھا سارا سامان بھک سے اڑا اور اڑ کر خاص بلندی تک گیا اور پھر عین ہمایوں کے سر پہ آ گرا۔

''اس کے پاس پیشنٹ فائل تھی ہمایوں......!'' اِک اور دھماکا...... اور ہمایوں نے بے دم ہو کر کرسی کی پشت کے ساتھ ٹیک لگائی تھی۔ ذرا کی دیر کو وہاں خموشی یوں چکراتی رہی جیسے کہ کوئی راستہ بھٹک گیا ہو۔

''ہمایوں......!'' ولی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔

''بیٹا کیا مسئلہ ہے؟ مجھے بتاؤ...... کھل کر کہو خواہ کیسا ہی مسئلہ کیوں نہ ہو...... تم بیمار ہو گیا......؟ ایسی کیا ذہنی پریشانی ہے جو تمہیں گھسیٹ کر سائیکالوجسٹ کے پاس لے گئی......'' اور ہمایوں نے بے حد بے بسی سے اپنا ماتھا مسلا تھا۔

''ماموں......!''

''سچ کہنا ہمایوں...... تمہاری بہن مر جائے گی۔ جھوٹ سے تسلی مت دینا۔'' انہوں نے اس کی بات کاٹی تھی۔ وہ کیا سمجھ رہے تھے کہ وہ ذہنی طور پر شدید بیمار تھا حالانکہ وہ تو......

سچ بتانے کے علاوہ اور کوئی راستہ بچا تھا نہ چارہ...... وہ کیسے مجبور ہوا تھا۔ کیسے......

اس نے کرسی کا رخ ماموں کی طرف ذرا موڑا...... چند لمحے منہ پہ ہاتھ رکھ کر سر جھکائے بیٹھا رہا اور پھر بے ساختہ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی تھی۔ وہ سب انہیں بتانا...... یہ آسان نہ تھا۔ خدا قسم آسان نہ تھا۔ وہ کتنا embarrass ہوا تھا۔ یہ اس کے ماتھے پر یکدم نمودار

ہونے والی نمی بتاتی تھی۔ کیا کہے......کس طرح سے بتائے......کیسے منہ بول کر کہے کہ وہ اِک شادی شدہ عورت کو......اس نے لاشعوری طور پہ سر جھٹکا۔

''ہمایوں......!''ولی کے لہجے میں خدشات پھنکارتے تھے۔اورتا خیر جان لیوا تھی۔

''میں نے ایک لڑکی کو پرپوز کیا تھا ماموں......''کافی دیر بعد......وہ کرسی کے بازو کو ناخن سے کھرچتے ہوئے مدھم سا بولا۔اور ولی ماموں مر کر بھی گمان نہ کرتے کہ ''وجہ'' ایسی بھی ہو سکتی تھی۔

''تو......؟''

''تو یہ کہ وہ......وہ میریڈ ہے۔آئی سوئیر مجھے معلوم نہ تھا۔''اور ولی ماموں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔وہاں پھر سے خاموشی رستہ بھٹک کر آن وارد ہوئی تھی۔

''Are you still in Love with her?''اس نے سرسراتی سی آواز سنی، پھر آواز کوڑے میں بدلی اور قوت سے اس کے بدن پہ پڑی تھی۔

''No....Not at all.''وہ بلبلایا۔

''ایسا نہیں ہے، بالکل بھی ایسا نہیں ہے ماموں......جیسا آپ سمجھ رہے ہیں۔وہ اچھی لگی تھی مجھے اور......اور......''اور ہمایوں نے بے بسی سے بات ادھوری چھوڑی۔آگے کیا بتائے......

''اور......؟''ولی نے اسے اکسایا۔وہ بغور اسے دیکھتے تھے۔

دونوں ہونٹوں کو مس کر کے مسلتے ہوئے......ہمایوں نے تھک کر کرسی کی پشت سے سر ٹکایا تھا۔وہ اب سیلنگ پہ روشن فینسی لائٹ کو دیکھ رہا تھا۔

''اور یہ کہ وہ میرے ذہن سے نہیں نکلتی......میں نے بہت کوشش کی......بہت......ہر گر آزما کر دیکھ لیا......ہر طریقہ استعمال کر کے دیکھ لیا......وہ ذہن سے نہیں نکلتی......اور یہ کیفیت اتنی chronic بن چکی ہے کہ میں......میں......''

اس نے ایک دم بات ادھوری چھوڑ کر خشک ہونٹوں پہ زبان پھیری تھی۔

''میں الیوژنز (illusions) کا شکار ہو رہا ہوں۔

''It is not healthy... not healthy...

اس نے سر جھٹکا۔

''پھر میں نے سوچا کہ سائیکالوجسٹ مدد کر سکتا ہے۔میں بس جاننا چاہ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ......''وہ چند لمحے اسی

حالت میں فینسی لائٹ کو دیکھتا رہا یوں جیسے بھول چکا ہو کہ وہ کہاں ہے۔

"Did it work?" وہ اس سوال پہ بلا ارادہ چونکا اور پھر سیدھا ہوا تھا۔

"No۔" آواز مدھم اور شکستہ تھی۔

ولی ماموں نے اک گہرا سانس بھرا تھا۔

"ہمایوں......! تمہیں سائیکالوجسٹ کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ آگے جھک کر اس کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

"تو میں اور کیا کروں ماموں......؟" وہ بے بس نظر آیا۔

"تم نے کہا......وہ تمہارے "ذہن" سے نہیں نکلتی......ہمایوں......! تم نے اسے "دل" سے نکالا کیا......؟"

اور اس نے یوں ماموں کو دیکھا کہ جیسے کسی نے قوت سے پیٹ میں گھونسا دے مارا ہو۔

"وہ تمہارے ذہن میں ہے ہی نہیں ہمایوں......! وہ دل میں ہے......"

"ماموں پلیز......!" لہجہ تیز ہوا اور چہرہ سرخ......

"سارا مسئلہ ہی یہ ہے کہ تم اس چیز کو accept نہیں کر پا رہے۔ تم اسے گناہ سمجھ رہے ہو......یہ گناہ تب ہوتا ہمایوں جب تم "حد" پار کرتے......کسی کا اچھا لگنا......کسی سے محبت ہو جانا......یہ اختیار میں کب ہوتا ہے؟ Let it flow Humayun...! Let it flow... اسے بہنے دو۔ خون کے ساتھ دوڑنے دو......اس جذبے کے ساتھ زندہ رہنا سیکھو اور اسے اپنے اندر دفن کرنا بھی سیکھو۔ اس جذبے کو اتنی اجازت نہ دو کہ وہ تمہیں ہینڈل کرے......تم اسے ہینڈل کرنا سیکھو ہمایوں......! محبت کو اتنا ہی پاک رکھنا سیکھو کہ جتنی پاک شے یہ آسمانوں سے بنا کر اتاری گئی ہے۔ Biase مت ہونا......Unbiase رہنا......"

اور ہمایوں عجب نظروں سے انہیں تکتا تھا۔ وہ کیسی عجیب بات کہتے تھے نا......

"اس ذات پاک نے پیدا کی موت اور حیات تا کہ وہ تمہیں آزمائے کہ کون تم میں سے اچھے اعمال کرتا ہے۔" (سورہ ملک، آیت نمبر 2)

اور ہمایوں نے اب کہ حسرت سے انہیں آیت پڑھتے سنا۔

محبت بھی تو ایک سخت آزمائش ہے نا......کبھی کبھی وہاں جا کر سر پٹختی ہے کہ جہاں قریب قریب ناجائز ہو جاتی ہے۔ پھر تمہاری حدیں بھی تو define کر دی گئی ہیں اور حد سے ماورا محض غیر دانستہ خیال یا سوچ ہے۔ دانستہ سوچ بھی حد سے بالا نہیں۔"

"میں دانستہ ایسا نہیں کرتا ماموں......!" وہ تڑپ کر بولا تھا۔

"اتنا گھٹیا نہیں ہوں میں......" اور تکلیف منہ بول کر اپنا آپ بتاتی تھی۔

''میں جانتا ہوں ہمایوں......! میں جان گیا ہوں...... یہ ہی تو تمہیں سمجھا رہا ہوں......کوئی چہرہ......کوئی انسان......کوئی شخص آپ کو اچھا لگ سکتا ہے، دل کو بھا سکتا ہے، اُس کے بعد وہ تمہارا فعل ہو گا جو یہ بتائے گا کہ تم نے احسن کام کیا یا نہیں......سولڑنا چھوڑ دو...... مزاحمت ترک کر دو اور مان لو کہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔ تمہارا دل کسی کو پسند کرتا ہے تو اسے کرنے دو ہمایوں......خود کی زندگی کو خراب کیوں کرتے ہو......؟ اک جذبہ ہی تو ہے...... محض اِک جذبہ ہی تو ہے۔ ہو گیا تو سو ہو گیا......''

اور اب کی بار ہمایوں سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا...... بیٹھا رہا حتیٰ کہ ولی ماموں اٹھ کر چلے گئے اور حتیٰ کہ آفس کے سبھی ملازم اِک اِک کر کے اٹھ کر چلے گئے......لائٹس اِک کے بعد اِک بجھتی چلی گئیں۔

''سر......! سر......!''

''ہوں......'' وہ چونکا......وہ پیون تھا۔

''رات ہو رہی ہے سر......! آپ نے جانا نہیں......؟''

اس نے غائب دماغی سے پیون کو دیکھا، پھر اپنا کوٹ، سیل فون اٹھایا اور سست قدموں سے لفٹ کی جانب بڑھا اور گراؤنڈ فلور کا بٹن دبایا تھا......ایک جھٹکا سا لگا اور لفٹ بنا محسوس کروائے حرکت میں آئی تھی۔ چند لمحے بعد ایک جھٹکے کے ساتھ لفٹ رکی اور دروازہ کھلا......وہ ایک لمحے کے لیے ٹھہرا اور پھر دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈالے، وہ سر جھکائے باہر کو آیا...... باہر نکلتے ہی خنک ہوا نے اس کا استقبال کیا تھا۔ بے اختیار اس نے منہ اٹھا کر آسمان کو دیکھا کہ جہاں ستارے چمکتے تھے۔

''تو آج کے بعد تمہارا خیال کسی لہر کی مانند آئے گا اور مجھے کچھ اور خالی کر جائے گا......تو ہر بار اک ہی زخم پہ وار ہو گا اور بار بار ہو گا......اور زخم گہرے سے مزید گہرا ہوتا جائے گا مگر یہ کہ......خیال پہ بھی بند باندھا جائے گا، اسے روکا جائے گا اور اگر ایسا نہ ہوا تو میں آزاد ہوں...... بے قصور ہوں اور بے بس بھی......خدا میری آزمائش آسان کرے اور مجھے معاف کرے۔'' اس نے خنک ہوا کے دھاگے سے پیغام باندھا اور اوپر آسمانوں پہ پہنچا دیا کہ وہ سینوں میں چھپی باتوں کو بھی جانتا ہے۔ اس سے کچھ پوشیدہ نہیں......کچھ بھی نہیں اور کسی کا ذرہ برابر بھی عمل اسے لوٹایا جائے گا......یقیناً لوٹایا جائے گا، بس آزمائش یہ کہ عمل کیسا ہے......؟ احسن یا پھر بدتر......

☆......☆......☆

وہ جب گھر آیا تو یہ دیکھ کر اسے ذرا بھی حیرت نہ ہوئی تھی کہ تبسم لاؤنج میں اس کی منتظر تھیں۔ وہ معمول سے لیٹ تھا، پھر بھی...... انہیں دیکھ کر اس نے بے اختیار ایک گہرا سانس بھرا۔ وہ ابھی اس وقت ان کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا مگر......وہ سر جھکائے ان تک آیا۔

تبسم سید حاد دیکھ رہی تھیں اور آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر ان کی آنکھوں سے بے خبر سے گرتے تھے۔ وہ تبسم کے ساتھ جا بیٹھا اور بازو پھیلا

http://kitaabghar.com

کران کو اپنے ساتھ لگایا اور بس...... جیسے اسی کی دیر تھی۔ تبسم ہچکیوں سے رونے لگیں...... اس کے سینے میں منہ چھپائے...... بچوں کی طرح بلک بلک کر وہ رو پڑی تھیں۔ وہ خاموش ان کا سر سہلاتا رہا۔ اس نے چاہا کہ اندر کا غبار بہہ جائے...... نکل جائے اور وہ پرسکون ہو جائیں...... وہ روتی رہیں اور وہ ان کا سر سہلاتا رہا...... نرمی سے، پیار سے اور تسلی کے سے انداز میں...... کوئی دیر گزری تو اس نے انہیں خود سے الگ کیا...... آہستگی سے...... وہ اس سے نظریں نہ ملا رہی تھیں یوں جیسے خوفزدہ ہوں...... کوئی بری خبر...... کوئی بری بات...... نہیں، انہیں نہیں سننی تھی......

''آپی......!'' اس نے پیار سے پکارا۔

انہوں نے دیکھنے سے گریز کیا۔

''میں ٹھیک ہوں......'' ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہو تو وہ...... وہ فائل......؟'' آواز بھیگی سی تھی اور لہجہ بھرایا ہوا۔

''ہاں......! اس فائل کی حقیقت بھی مسلم ہے۔''

''ہمایوں......!'' انہوں نے خوفزدہ ہو کر بازو سے اس کی شرٹ کو مٹھی میں بھینچا تھا۔ وہ اب دہشت زدہ ہو کر اسے دیکھتی تھیں اور ہمایوں...... اسے ایک ہی دن میں دوبار...... دوبار آگ کے دریا میں کودنا پڑا۔

''میں کسی کو پسند کرتا......'' اور اس کے بعد وہ یکدم الجھا تھا کہ ''تھا'' بتائے یا ''ہوں''......

''کیا......؟'' تبسم کا خوف بھک سے اڑا اور ان کا لاؤڈ ''کیا'' حیرت کا پتا بتلاتا تھا۔

''تم اس وجہ سے......؟''

''میری پوری بات سنیں آپی......!'' اس نے برہم سے انداز میں بات کاٹی...... وہ انہیں بھی داستان سنانے لگا مگر جان بوجھ کر اس نے شادی شدہ والا پارٹ کٹ کر دیا تھا...... وہ بہن کے سامنے شرمندہ نہ ہونا چاہتا تھا...... اور وہ تو مر کر بھی ان کے سامنے اس کا نام نہ لیتا۔

''ہمایوں......! مجھے بتلاؤ تو سہی وہ ہے کون......؟ میں آخری حد تک جاؤں گی...... ہر طریقہ آزماؤں گی...... کچھ بتاؤ تو سہی......'' تبسم روہانسی ہو رہی تھیں...... ہمایوں نے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے اور ہلکا سا مسکرایا۔

''یہ نہیں ہو سکتا آپی......! ناممکن ہے اور اس ''ناممکن'' کو ''ممکن'' بنانے کا کوئی طریقہ، کوئی ذریعہ، کوئی رستہ نہیں۔ آپ مجھ سے مت پوچھیں کہ وہ کون ہے...... یوں سمجھیے کہ جیسے کوئی نہیں ہے...... کوئی بھی تو نہیں......'' اور تبسم کو اب صحیح معنوں میں شاک پہنچا تھا۔ ان کا اکلوتا...... لاڈلا...... شہزادوں جیسا بھائی اور یوں خالی دل...... خالی دامن...... آنسو اک بار پھر آنکھوں کی سطح کو بھرنے لگے تھے۔

''تو کیا تم شادی نہیں کرو گے ہمایوں......؟'' بھرائی آواز میں......انہوں نے بچوں کے سے لہجے میں اک بچگانہ سوال ہی پوچھا تھا۔اور وہ ہنس دیا......کھل کر......بے اختیار......پھر اس نے محفوظ نظروں سے تبسم کو دیکھا۔

''دل تو خراب ہو ہی گیا......خود کی زندگی کیوں خراب کروں آپی......؟ میں اتنا تو اہل ہوں نا کہ میں کسی لڑکی کو......کسی نا آسودہ عورت کو......ایک اچھی، معیاری زندگی دے سکوں......دل کا کیا ہے......! یہ تو بنتا ہی ٹوٹنے کے واسطے ہے......خالی ہے تو خالی سہی......کسی اور کا دامن کیوں نہ بھر دیا جائے......زندگی میں وہ سب نہیں ملتا کہ جس کی چاہ کی جائے مگر......لیکن تھوڑا سا وقت......ذرا سی مہلت......اتنا تو حق بنتا ہی ہے نا......!'' وہ ان کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر کہہ رہا تھا اور تبسم......وہ اتنی حیرت سے اسے دیکھتی تھیں کہ یوں جیسے پہلی بار دیکھا ہو......یوں جیسے پہلی بار واقفیت حاصل ہوئی ہو......اتنا خوبصورت انسان......اس کی زندگی اس کے کام نہ آئی تو کیا......اس نے زندگی کو محض ایک جذبے کے ہاتھوں ضائع ہونے نہیں دیا تھا۔محبت ایک حقیقت......اک سچا......خالص اور مضبوط جذبہ مگر زندگی اس سے زیادہ بڑی اور طاقتور حقیقت ہے۔

☆......☆......☆

یہ بارشیں بھی تم سی ہیں
جو برس گئیں تو بہار ہیں
جو ٹھہر گئیں تو قرار ہیں
کبھی آ گئیں یونہی بے سبب
کبھی چھا گئیں یونہی روز و شب
کبھی شور ہیں کبھی چپ سی ہیں
یہ بارشیں بھی تم سی ہیں
کسی یاد میں، کسی رات کو
اِک دبی ہوئی سی راکھ کو
کبھی یوں ہوا کہ بجھا دیا
کبھی خود سے خود کو جلا دیا
کبھی بوند بوند میں گُم سی ہیں
یہ بارشیں بھی تم سی ہیں
یہ بارشیں بھی تم سی ہیں

http://kitaabghar.com

اور برستی بارش کا شور دلفریب تھا۔لگا تار، مسلسل شور کرتی بارش......وہ کھڑکی میں کھڑا......ایک ہاتھ پھیلا کر بارش کی یخ بستہ نمی کو اپنی ہتھیلی پہ محسوس کرتا تھا......جینز کے پائنچے ٹخنوں سے اوپر تک فولڈ کر رکھے تھے۔شرٹ کے بازو بھی چڑھا رکھے تھے۔بالوں پہ نمی ابھی بھی تازہ تھی۔وہ نماز پڑھ رہا تھا۔نماز ختم کر کے وہ کھڑکی تک آیا تھا اور اب برستی بارش تھی اور اس بارش کے قطروں تلے اس کی ہتھیلی......اس نے نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا۔بارش کے قطرے...... اِک رفتار سے، ایک دوسرے کے پیچھے...... اِک عمودی خط میں برستے تھے اور وہ دیکھتا رہا......دفعتاً عمودی خطوط کا زاویہ بگڑا......خط ٹیڑھے میڑھے سے ہو گئے......اور یوں ٹیڑھے میڑھے سے ہو کر وہ اِک نقش میں بدلنے لگے۔

بوندوں نے بھی کیا چال چلی تھی......اس نے حیرت سے اس نئے نقش کو دیکھا اور یک دم ہتھیلی کھینچ لی......وہ ابھی تک بے یقین نظروں سے اس واضح نظر آتے نقش کو دیکھ رہا تھا اور پھر......اور پھر......اس نے غصے سے کھڑکی بند کی...... پٹ زور سے بند ہوا......طیش سے اس نے ہاتھ کا مکا دیوار پہ دے مارا اور پھر ماتھا دیوار سے ٹکائے بے یقین کھڑا رہا۔اس کا ہاتھ اب دیوار پہ ہلکی ہلکی سی ضربیں لگا رہا تھا۔یوں جیسے وہ خود پہ قابو پا رہا ہو......اس کے الیوژنز......یہ ختم نہ ہوئے تھے......ہاں البتہ اب یہ تواتر کے ساتھ نہ ہوتا......بس کبھی کبھار......اچانک......دفعتاً...... بے ساختہ...... بے اختیار...... یک دم......اور آج ایسا نہ ہوتا تو کمال ہوتا...... بڑے ہی عرصے بعد وہ تبسم کو پک کرنے ان کے اسکول گیا تھا اور اس کو دیکھ لیا تھا۔

وہ اسکول کے گیٹ کے پاس کھڑی تبسم سے باتیں کر رہی تھی۔

تبسم آپی کو دیکھ کر اس نے گاڑی بڑھا کر گیٹ کے بالکل سامنے روکی اور......اور......بس......

وہ ایک نظر ہی......زہر قاتل بن گئی تھی......اِک لاشعوری نظر ہی......

☆......☆......☆

سوال غیر متوقع تھا......

کتنی ہی دیر وہ بے جان، بے دم، بنا روح کے جسم لیے بیٹھی رہی......اس کے ہاتھ ابھی تک کانپتے تھے اور بدن کی لرزش جان لیوا تھی۔یہ کیا ہوا تھا......کیا......؟ ایسا تو کبھی سوچا ہی نہ تھا......ذہن کے نہاں خانوں کو کھنگالو تو تب بھی ایسی کوئی سوچ، کوئی خیال، کوئی گمان برآمد نہ ہوتا تھا......تو......تو یہ کیا ہوا تھا......؟ ایسے کوئی کیسے کر سکتا ہے......؟ کیسے......؟ یوں سر راہ......روک کر......اس کو......سیدھا سیدھا......کھڑے کھڑے......پرپوز......اور اس نے یک دم منہ پہ ہاتھ رکھا تھا اور اپنی ''ہا'' کو دبا دیا۔

''میرے خدا......!'' لفظ گونگے تھے اور حلق سے پھنس پھنس کر نیچے اترتے تھے......بدن میں اِک جھرجھری نے تازہ انگڑائی لی تھی۔وہ حواس باختہ تھی......اور ابھی تک تھی۔وہاں......گیٹ کے باہر اس کا منتظر شوہر ضرور اس کا چہرہ پڑھتا اور پڑھ کر سوال کرتا۔چلو بات

کی تہہ تک نہ پہنچتا مگر سوال ضرور اٹھاتا......مگر......اندھیرے نے پردہ رکھ لیا...... پردہ رکھ لیا کہ پردہ ڈال دیا......وہ طے نہ کر پائی تھی۔ ہمایوں کا رد عمل کہتا تھا کہ وہ واقعی اس کے میریڈ ہونے سے انجان تھا......ورنہ اسے کیا پڑی تھی کہ وہ اپنی بہن کے اسکول کی کسی پرائمری ٹیچر کو یوں پروپوز کرے اور یہ ہی اِک بات...... یہ ہی اِک بات چبھتی بھی تھی...... مانو کاٹتی تھی...... تیز دھار آرے کی مانند......سر تا پیر ہاں......!اسے کیا پڑی تھی کہ وہ یوں کسی پرائمری اسکول ٹیچر کو پروپوز کر دے۔ عام سی...... معمولی ٹیچر کو......تو کیا وہ واقعی میں......اور وہ ایک بار پھر سے بے آرام ہوئی۔ معلوم نہیں کیوں اِک لمحے کے لیے...... اِک لمحے کے لیے وہ خالی ہوئی تھی......اس سوال پہ اور یہ ہی خالی پن اک دھماکے کے ساتھ اس کے اندر پھیلا اور آنکھوں سے عیاں ہو گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ ہمایوں کی نظریں ابھی تک اس پہ گڑھی ہیں۔ بے یقین......شاکڈ نظریں......اسے محسوس ہوا......اک لمحے کو......اک ساعت کو وہ ان نظروں کے حصار سے اب نہ نکل پائے گی......ان آنکھوں نے گویا اس کے گرد ایک دیوار چننی شروع کر دی تھی...... جیسے حصار باندھنا شروع کر دیا تھا۔

''نہیں......نہیں......نہیں......'' وہ گھبرا کر اٹھی۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا......سانس جسم کو چھوڑ رہا تھا......اس نے آتے ہی...... آتے ہی لباس بدلا تھا کہ وہ خود کو اس روپ میں دیکھنا نہ چاہتی تھی۔ وہ تو یقین بھی نہ کرنا چاہتی تھی کہ وہ کسی کی آنکھ کی توجہ کا باعث بنی تھی۔ رات سخت تھی......تکلیف دہ تھی اور ان دو آنکھوں کا تاثر جان کھینچتا تھا۔ اتنی حبس زدہ تھی کہ دم گھوٹتی تھی۔ کئی بار اس نے جھٹک کر، لاپرواہو جانا چاہا مگر......سب سے تلخ چیز ان آنکھوں میں اُمڈ اُمڈ کر بولتی سچائی تھی......اور مصیبت یہ کہ نیند بھی نہ جانے کدھر کی سیر کو نکلی تھی۔ کم بخت آنکھوں سے بھاگتی تھی......آ کر نہ دیتی تھی۔ آنسو یکبارگی اس کی آنکھوں میں اُمڈ کر آئے اور پھر کناروں سے پھسل پھسل کر بہنے لگے تھے۔ وہ روتی رہی......نہ جانے کب تک......کتنی دیر تک......

''اور اگر میں اِک بامعنی سی بات کروں تو......؟''

''آپ اچھی لگتی ہیں مجھے......''

''میں پروپوز کرنا چاہتا ہوں......''

جملے ہوا میں تیرتے تھے...... آگے پیچھے...... یوں جیسے ہوا انہیں اٹھائے اٹھائے پھر رہی ہو...... بازگشت...... دور سے آتی آوازیں......کبھی اونچی، کبھی مدھم......کبھی سرگوشی کی سی صورت......

''ااا چھی ی ی ی......لگ......لگ......تی تی تی......''

''یا......'' وہ یک دم گھبرا کر اٹھی تھی اور جب اٹھی تو......تو وہاں کچھ نہ تھا......کوئی لفظ......کوئی آواز......نہ کوئی احساس......وہاں بس خاموشی تھی......اندھیرا......سکوت...... جہانگیر کی سانسوں کا مدھم سا شور......اور دور کسی جھینگے کے بولنے کی آواز......گھڑی کی ٹک ٹک......وہ نیم غنودگی سے جاگی تھی......نہ جانے کب آنکھ لگی تھی اور وہ اس کا تحت الشعور تھا۔ جس میں وہ ہچکولے کھا رہی تھی۔ خولہ نے

http://kitaabghar.com

خشک ہونٹوں پہ بے ساختہ زبان پھیری تھی۔ ماتھے پہ آیا پسینہ صاف کیا اور خود کو گھسیٹ کر بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائی تھی۔ یہ تکلیف دہ تھا...... باخدا یہ کسی بھی باحیا عورت کے لیے تکلیف دہ تھا...... یہ اتنی تکلیف دہ چیز تھی کہ بے ساختہ...... بے اختیار وہ ایک بار پھر سے رو پڑی تھی...... منہ پہ ہاتھ رکھے...... وہ گھٹ گھٹ کر مرتی تھی۔ یہ برداشت سے زیادہ تھا...... سخت تھا...... شدید تھا...... روتے روتے...... اچانک...... وہ چپ ہوئی اور پھر حیران......

''مجھے پہلے کیوں نہ خیال آیا......'' وہ بڑبڑائی تھی۔ آدھے جسم پہ لی چادر اس نے اتار پھینکی...... وہ بیڈ سے اتری، چپل اڑسی اور باتھ روم کی طرف بڑھی تھی...... اس کے ہر ہر فعل میں عجلت چھلکتی تھی۔ اس نے وضو کیا اور جائے نماز نکالی...... کہ ہر دکھ...... ہر درد...... ہر پریشانی...... ہر مشکل اور ہر تکلیف کا حل نماز ہی ہے۔

واستعینو بالصبر والصلوٰۃ......

☆......☆......☆

یہ انہی دنوں ہوا کہ جب وہ اسکول میں اپنے پیپر جمارہی تھی۔ اس چیز نے اسے کئی دن پریشان کیے رکھا...... وہ مس مفتی سے بھی یہ بات نہ کہتی...... کبھی بھی نہ...... یہ بھی بھلا کوئی کہنے...... کوئی عیاں کرنے والی بات تھی...... اسے غلط فہمی ہوگئی...... سو ہوگئی۔ وہ کیوں اچھالے اس بات کو...... ہاں! البتہ وہ اپنی کارکردگی کو متاثر ہونے سے روک نہ پائی تھی اور نتیجتاً مس مفتی کی نظروں میں ایک بری ٹیچر بن کر ابھری تھی...... لیکن یہ محض چند دنوں کے لیے ہوا تھا...... وہ ڈسٹرب رہی...... پریشان رہی...... وہ اتنا unexpected تھا کہ وہ ماسوائے حیران اور پریشان ہونے کے، دوسرا کوئی کام نہ کرسکی تھی۔ بہرحال جو بھی تھا محض چند دن کے لیے تھا۔ اس نے نماز اور صبر سے مدد مانگی اور اس کی مدد کردی گئی تھی۔ یہ بات پھر اس کے ذہن سے یوں محو ہوئی تھی کہ دوبارہ یاد تک نہ آئی تھی۔ گمان تک میں نہ ابھری تھی۔ وہ حادثہ تھا اور اس نے بھلا دیا...... یادداشت سے کھرچ ڈالا...... یوں جیسے کہ کبھی ہوا ہی نہ تھا...... مگر نہیں جانتی تھی کہ وقت پھر سے...... ایک بار پھر سے...... اسے ایسے مقام پہ لا کھڑا کرے گا کہ اسے بار ہا...... ہر پہلو سے...... ہر اینگل سے اس بات کو سوچنا پڑے گا...... دیکھنا پڑے گا اور یہ جاننا پڑے گا آیا کہ ہمایوں کی پسندیدگی کے اظہار کا اس کی بہن کی زندگی پہ کیا اثر پڑے گا۔ خولہ کی سب سے بڑی غلطی اور پھر غلط فہمی یہ ہی تھی کہ اس نے ہمایوں کے اظہار کو وقتی بات سمجھا تھا۔ اور جو اس نے سمجھا...... اپنے حساب اور گمان سے ٹھیک ہی سمجھا کہ اس کے بعد ایسا کچھ بھی...... کچھ بھی نہ ہوا تھا جو یہ بتلاتا کہ وہ...... وقتی بات، وقتی جذبہ نہیں تھا...... ہرگز ہرگز بھی نہیں تھا۔

☆......☆......☆

''آپ مجھے میچ میکر کا نمبر دے سکتی ہیں؟ مجھے چاہیے تھا۔''

''وائے ناٹ، شیور...... میں آپ کو نمبر فارورڈ کردیتی ہوں۔''

”تھینکس ......!“ انہوں نے مسکرا کر کہا اور پلٹ گئیں۔ خولہ نے نمبر فارورڈ کیا اور سوچ میں پڑ گئی۔

”مس مفتی کو کیوں چاہیے تھا نمبر......؟ کس لیے......؟ تو کیا......؟“ اور اس کیا کے بعد آنے والا خیال......لفظ ”ہمایوں“ کی شکل میں تھا، جسے اس نے وقتی طور پہ تو جھٹک دیا مگر مزنہ کی خودکشی کی کوشش کے بعد وہ ایسا نہ کر سکی تھی۔ مس مفتی کو پروپوزل درکار تھا......اور اسے بھی......تو اگر وہ ان سے بات کرے......خود پروپوزل دے ڈالے تو......؟ تو......؟ اور اس رات اتنی تکلیف سے گزر کر اس نے بالآخر فیصلہ کر لیا تھا اور تکلیف کی وجہ یہ نہ تھی کہ اسے خود مس مفتی سے ایسی بات کہنی تھی، تکلیف کی وجہ ”ہمایوں“ تھا۔ اسے ہمایوں سے ”انکار“ کا خدشہ تھا۔ اس کو رد عمل کی پریشانی تھی۔ گو کہ وہ اسے وقتی بات سمجھی تھی مگر پھر بھی یہ unpleasant تھا۔ اور اس بات کا چانس زیادہ تھا کہ ہمایوں انکار کر دیتا...... یہ جاننے کے بعد کہ مزنہ، خولہ کی بہن ہے۔ یہ جتنا ناخوشگوار اس کے لیے تھا، اتنا ہی ہمایوں کے لیے ہوتا......تو اس نے چھوٹا سا......رف سا plan بنایا۔

”اگر مس مفتی مان گئیں اور تمام معاملات ٹھیک طرح سے طے ہو گئے تو وہ ہمایوں کے سامنے نہیں آئے گی۔ تب تک جب تک ان دونوں کا نکاح نہیں ہو جاتا......اسے احتیاطاً یہ کرنا پڑا۔ ایک دفعہ شادی ہو جاتی، وہ ذرا ری ایکٹ کرتا اور بس پھر سب ٹھیک......کہ یہ شادی بڑی مضبوط شے ہے۔ ویسے بھی وہ وقتی جذبہ......وقتی اظہار تھا......ایک ذرا سی مس انڈراسٹینڈنگ اور بس......اس بات کو لے کر اب وہ اپنی شادی خراب کرے گا کیا......؟“ بس یہی سوچ کر اس نے تیر چلایا تھا کہ چل گیا تو تیر، نہیں تو تکا......

☆......☆......☆

”ہمایوں......! تم خنجراب سے کب واپس آؤ گے......؟“

”کچھ دن تک آ جائیں گے آپی......! ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا......“

وہ اسے فون کرنے پہ مجبور ہوئی تھی، کیونکہ خولہ نے اپنی بہن کے پروپوزل کے لیے کہا تھا۔

”ہمایوں......! اک لڑکی ہے۔ ذرا سی ذہنی طور پر ڈسٹربڈ ہے......پر اچھی ہے......“ اور ہمایوں جی بھر کر بیزار ہوا۔

”ایک تو یہ آپی بھی نا......“ وہ سننے پہ مجبور تھا۔

”اس کی شادی ٹوٹ گئی تھی، شادی سے کچھ دن پہلے ہی......“ مس مفتی اسے بتا رہی تھیں۔

”تم کہو تو میں جاؤں ان کے گھر......مسز جہانگیر کی بہن ہے۔“ اور یہ بات سنتے ہوئے ہمایوں مر کر بھی یہ گمان نہ کرتا کہ مسز جہانگیر......خولہ تھی۔ مس مفتی کے گمان کے مطابق وہ مسز جہانگیر کو جانتا تھا...... یہ تو پارٹی پہ ملاقات کے علاوہ......خولہ نے ایک دفعہ انہیں لفٹ بھی دی تھی۔ مگر مس مفتی یہ نہیں جانتی تھیں کہ ان دو ملاقاتوں کے باوجود وہ ”خولہ“ کے نام سے واقف تھا اور نہ ہی مسز جہانگیر سے......

ایک تو وہ بیزار......دوسرا وائس کوالٹی......ایک ہی بات دو تین دفعہ دہرانی پڑتی تھی۔

http://kitaabghar.com

”ٹھیک ہے آپی......! آپ دیکھ لیجیے اور اگر آپ کو مناسب لگے تو میری طرف سے اجازت ہے، جو دل ہے کیجیے......“اس نے اکتا کر کہا اور خدا حافظ کہہ دیا۔

☆......☆......☆

خولہ کے گھر والوں نے تصویر دیکھ کر ہی لڑکا پسند کر لیا تھا۔ دوسرا یہ کہ خولہ جانتی تھی انہیں......سو ہمایوں کی غیر موجودگی مسئلہ نہیں بنی تھی۔ اور تبسم اسے ضرور مزنہ کی تصویر دکھاتیں مگر اچانک نکاح کا پروگرام بنا تھا اور وہ نکاح سے ایک رات پہلے گھر آیا تھا اور اتنا تھکا ہوا تھا کہ آرام کرنے کے علاوہ دوسرا کوئی کام نہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اگر تصویر دیکھ لیتا تو مزنہ کی آنکھوں کی خولہ سے مشابہت پر ضرور چونکتا۔ مزنہ کی آنکھیں خوبصورت تھیں مگر وہ ساحر نہ تھیں۔ جیسی گہرائی خولہ کی آنکھ میں تھی، وہ مزنہ کی آنکھوں میں نہ تھی۔ مزنہ کی آنکھیں یک دم گرفت کرتی تھیں مگر خولہ کی آنکھیں......وہ دھیما مگر پر اثر زہر تھا......آہستہ آہستہ سے گرفت کرتا اور کسی کام کے لائق نہ چھوڑتا......یوں کہ نہ زندوں میں اور نہ مردوں میں......آنکھوں کے بعد دوسری مشابہت معصومیت تھی......ہمایوں کو اگر قسمت ذرا سا بھی یہ جاننے کا موقع دیتی کہ مزنہ......خولہ کی بہن ہے تو وہ کسی بھی دوسری تیسری لڑکی سے شادی کر لیتا......مگر مزنہ تو کبھی بھی نہ ہوتی......کبھی بھی نہیں......یہ خولہ کا ایک اور تحفہ تھا جو کہ عذاب بن کر اس کے گلے پڑا تھا۔ اِک ان دیکھا......ان سنا......ان کہا عذاب......

☆......☆......☆

قدموں کی چاپ اس کی پشت پر ابھری......پھر آہستہ ہوئی اور پھر آہستہ تر......وہ نظروں کی تپش اپنی پشت پہ محسوس کر سکتی تھی اور وہ اس کے عین کندھے کے برابر آ کر رک گیا تھا اور خولہ......وہ حرکت کے قابل نہ رہی تھی۔ وہ محسوس کر سکتی تھی......دیکھ سکتی تھی......آنکھوں کے کناروں سے......اس کے جبڑے بھینچے ہوئے تھے......اس کے چہرے ہی تناؤ تھا اور وہ سر اٹھائے سامنے دیکھ رہا تھا۔ وقت جیسے گھڑی کی ٹک ٹک میں بدلا تھا۔ ٹھہر ٹھہر کر گزرنے لگا......سیکنڈ بھی اپنا آپ بتا کر گزرتا تھا۔

“You made my life...”

اور ہمایوں نے یک دم اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ خولہ کے اندر ایک لرزش اتری......بے نام سی لرزش......گہری خاموشی......اس ادھورے جملے کے بعد خاموشی اپنی خاصیت کے ساتھ پھیلی تھی اور وہاں کوئی سانس کی آواز بھی نہ آتی تھی۔

“a mess...”اب کی بار اس نے خولہ کو دیکھ کر لفظ ادا کیے۔ اور خولہ......اس نے اک جھٹکے سے گردن اٹھا کر ہمایوں کو دیکھا اور دیکھتی رہی......وہ نظر نہ ہٹا سکی تھی اور پھر بے ساختہ منہ پہ ہاتھ رکھ کر وہ لڑکھڑا کر پیچھے کو ہٹی تھی۔ یہ اس سے کیا ہو گیا تھا......کیا......؟ خوف اِک بھرپور دھماکے سے اس کے اندر پھیلا تھا......وہ الٹے قدموں مڑی......بھاگی اور واش روم میں جا کر بند ہو گئی تھی......وہ گہرے گہرے سانس بھرتی تھی اور دوہری ہوئے چلی جا رہی تھی۔ منہ پہ ہاتھ رکھ کر وہ دروازے کے ساتھ گھسٹتی نیچے بیٹھتی چلی گئی۔ اس کی آنکھ میں

کوئی آنسو نہ تھا......وہاں خوف تھا......خوف......ہمایوں کے جملے سے زیادہ......یہ اس کی آنکھوں سے ٹپکتے پُر شدت جذبے نے اسے بتایا تھا کہ وہ ''وقتی جذبہ'' نہ تھا اور یہ کہ واقعی اس نے ہمایوں کی زندگی کو ایک mess بنا چھوڑا تھا......مکمل طور پر ایک mess......

☆......☆......☆

ایک سیاہ گاڑی کار پورچ میں آکر رکی۔ دروازے کھلنے کی آواز گونجی اور پھر ٹھک ٹھک ایک کے بعد ایک دروازہ بند ہوا تھا۔ وہ ذراسی ساعت کو اسٹیرنگ کو تھامے بیٹھا رہا تھا اور پھر اِک سرد آہ کو اندر ہی اتارتے ہوئے وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا۔

''کیسے لگے تمہیں وہ لوگ......؟'' اس کی ماں اس کی طرف آتے ہوئے بولی تھیں۔

''اچھے ہیں......'' وہ مسکرا دیا۔

''میری پسند ہے......اچھے کیسے نہ ہوتے......'' تبسم اس کے بائیں کندھے کے برابر آتے ہوئے بولیں اور ہمایوں نے بے اختیار اٹھنے والی تکلیف کو دبایا تھا۔ وہ تینوں باتیں کرتے ہوئے اندر جا رہے تھے۔ لاؤنج میں پہنچتے ہی سب ریلیکس ہو کر بیٹھے تھے۔ ہمایوں نے واسکٹ اتار کر صوفے کی بازو پہ رکھی اور قمیص کی آستین فولڈ کرتے ہوئے ملازم کو پانی لانے کا کہا تھا۔ زہرہ بھی اپنی چادر اتار چکی تھیں اور تبسم چینج کرنے چلی گئی تھیں کہ ساڑھی کو carry کرنا آسان بات نہ تھی۔

''اچھے شریف لوگ ہیں ہمایوں......امید ہے آئندہ بھی سب اچھا ہی رہے گا۔''

''ہوں......'' وہ مکمل سیل فون کی طرف متوجہ تھا اور انگوٹھے سے swipe کرتے ہوئے میلز وغیرہ چیک کر رہا تھا۔

''یہ ''ہوں'' کیا ہوتا ہے......سیدھی طرح بات کرو مجھ سے......'' وہ برا مان کر بولی تھیں۔ وہ چونکا......اِک پل کو ٹھہرا اور پھر بالآخر سیل فون سامنے ٹیبل پہ رکھ دیا تھا۔ تو یہ طے تھا......فرار کی راہ گر کوئی تھی بھی تو اس کے گھر والے اِس راہ کی طرف اسے چلنے نہ دیتے......''

''جی تو کیا کہہ رہی تھیں آپ......؟'' وہ مسکراتے ہوئے متوجہ ہوا۔

''یہی کہ مزنہ کیسی لگی تمہیں......؟''

''آپ کو کیسی لگی تھی......؟''

''ظاہر ہے مجھے اچھی لگی تھی تو اپنے بیٹے کے لیے چنا اُسے......''

''تو جب آپ کو اچھی لگی......تو پھر مجھے بُری کیسے لگ سکتی ہے؟''

''پھر بھی انسان کی ایک پسند ہوتی ہے......کچھ سوچا ہوتا ہے......''

''نہیں......میری کوئی پسند نہیں ہے اور میں نے کچھ نہیں سوچ رکھا تھا۔'' واسکٹ اٹھا کر بازو پہ ڈالتے ہوئے اس نے نرمی سے کہا

اور پھر اپنے کمرے کی طرف چل دیا تھا۔ زہرہ نے اس کے لہجے کو محسوس نہ کیا تھا۔ یہ تبسم تھیں......وہ دکھ کے ساتھ اسے جاتا دیکھتی رہیں۔

☆......☆......☆

کمرے میں اے سی کی کولنگ تھی۔ نیم اندھیرا......ایک کونے میں LCD چل رہی تھی اور اس کی روشنی کمرے کو مکمل اندھیرے میں ڈوبنے سے بچائے ہوئے تھی۔ وہ کاؤچ کی بیک پہ سر رکھے......سیلنگ پہ نظریں جمائے بیٹھا تھا......تو یہ بھی اس کے ساتھ ہونا لکھا تھا......یہ بھی......جھک کر اس نے آنکھیں ملی تھیں۔ وہ اتنا شل ہو چکا تھا کہ ابھی......اس وقت......وہ کسی اِک جذبے کو بھی محسوس نہ کر پا رہا تھا......وہاں کوئی احساس......کوئی خیال باقی نہ بچا تھا......وہاں بس اِک خالی پن تھا......انت خالی پن......یوں جیسے وہ کہیں معلق کر دیا گیا تھا۔ یوں جیسے وجود ذروں کی مانند بکھر چکا ہو......معدوم ہو چکا ہو......خاک میں بدل چکا ہو......تو یہ تھا انجام......تو یہ تھی کہانی محبت کی......بس اتنی سی کیا......؟ ناں......کہانی ختم نہ ہوئی تھی......کہانی تو اب شروع ہوئی تھی۔ آزمائش کسے سمجھا وہ......؟ وہ کیا جو پہلے تھی......ناں......وہ جو کہ اب ٹوٹی تھی۔ وہ ''اس'' کی بہن سے نکاح کر کے آ رہا تھا......اس کی بہن......میرے خدایا......اور اس نے سر اپنے دونوں ہاتھوں پہ گرا لیا تھا۔

☆......☆......☆

وہ حیران نہیں تھی......وہ ساکت بھی نہیں ہوئی تھی......اسے شاک بھی نہیں پہنچا تھا......وہ بس غیر متوقع بات تھی۔ بالکل ہی غیر متوقع سی بات......ایک غلط موقع پر کہی جانے والی غلط سی بات......وہ بس خاموش ہو کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھی......جہانگیر اس کے یوں دیکھنے پر ذرا سا بے آرام ہوا۔

''خولہ......!''

''ٹھیک ہے! تمہیں جانا ہے، جاؤ......اچھی بات ہے۔'' اور اس کے پکارنے پہ خولہ نے جواب دیا تھا۔

''دیکھو پلیز......پلیز سمجھنے کی کوشش کرو......میں کب سے اس کے لیے کوشش کر رہا تھا اور اب اگر یہ چانس مل گیا ہے......میرا داخلہ ہو گیا ہے تو پلیز اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرو......'' وہ اس کے دونوں ہاتھ پکڑے کہہ رہا تھا۔ خولہ تحمل سے سنتی رہی۔

''جہانگیر! سمجھ ہی تو چکی ہوں......یہ تمہارا چانس ہے اور تمہیں اسے چھوڑنا نہیں چاہیے......تمہارے فیوچر کا سوال ہے نا......!''

وہ نرمی سے اپنے دونوں ہاتھ چھڑواتے ہوئے بولی تھی اور جہانگیر......وہ محض اس کا منہ تکتا رہ گیا تھا۔ اب کیا کہے وہ اس کے جواب میں......اس نے اختلاف نہ کیا تھا......اس کا لہجہ......اس کا انداز......اور اس کے الفاظ بھی سب نارمل تھے مگر پھر بھی......پھر بھی کچھ تھا جو محسوس ہوتا تھا......کیا......؟ جہانگیر سمجھ نہ سکا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا......چند وضاحتیں اور......کچھ تسلیاں......مگر کہہ ایک لفظ نہ سکا تھا......وہ چند لمحے اس کے چہرے کو دیکھتا رہا اور پھر ہلکا سا بولا۔

http://kitaabghar.com

"Thank you!" خولہ نے سر کو خم دیا اور اٹھ گئی۔

"جو مجبوری...... حالات کی نزاکت اور موقع پہ اپنے ہونے کی ضرورت واہمیت کو نہ سمجھے...... اسے آخر یہ اہمیت وضرورت پھر سمجھائی ہی کیوں جائے......؟ آخر کیوں......؟" اس نے سر جھٹک کر سوچا۔

"لیکن جہانگیر......! یہ یاد رکھنا...... اچھی طرح سے یاد رکھنا...... میں تمہیں اس کے لیے کبھی معاف نہ کروں گی...... کبھی بھی نہیں...... تم مجھے ایسے وقت پہ چھوڑ کر جا رہے ہو کہ جب مجھے تمہاری سب سے سخت ضرورت ہے...... ضرورت آن پڑی ہے......"

اس نے کہا نہیں...... کیونکہ وہ "لفظ" ضائع کرنے کی قائل نہ رہی تھی۔

☆......☆......☆

اور پھر جس جس نے بھی سنا، سن کر حیران ہوا...... حیران ہو کر انگلی ہونٹوں پہ رکھی اور پھر حیرت سے ہی تکا تھا...... مطلب مزنہ کی شادی سر پہ تھی...... اور گھر بھر کا اکلوتا داماد...... اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے جرمنی جا رہا تھا۔ فرخندہ نے تو خوب سنائی تھیں اسے مگر احمد صاحب کو خولہ نے "سنانے" نہ دیا۔

"کیوں ابو......؟ کیوں......؟ ہم کیوں احساس دلائیں......؟ کیا وہ بچہ ہے یا پھر نوالہ منہ کی بجائے ناک میں ڈالتا ہے......؟ اسے نہیں احساس کیا......؟ اسے نہیں معلوم کیسا موقع ہے یہ...... تو پھر ایسے انسان کو احساس دلایا ہی کیوں جائے......؟ جانے دیں اسے...... اس کے بنا بھی سب کچھ ہو جائے گا...... وقت اور کام...... دونوں کسی کے محتاج نہیں...... ہو جائے گا سب...... میں ہوں نا...... میں کروں گی سب...... اور آپ...... آپ بالکل بھی...... ہرگز بھی ایک لفظ بھی اسے نہیں کہیں گے......" وہ ماتھے پہ بل لیے بگڑے سے انداز میں کہہ رہی تھی۔

"مر نہیں جائیں گے ہم اس کے بنا......" اور پھر اسی بگڑے ہوئے انداز میں کہہ کر وہ وہاں سے اٹھ کر چلی گئی تھی۔ اور احمد حاجب...... وہ عجب احساسِ ضیاع سے اسے تکتے رہے۔ معلوم نہیں کیوں دن بہ دن یہ بات واضح سے واضح تر ہوتی چلی جا رہی تھی کہ جہانگیر اسے deserve نہیں کرتا تھا...... بالکل بھی نہیں......

☆......☆......☆

"امی......!"

"ہوں......!"

"مزنہ کا بہنوئی...... جہانگیر...... وہ جرمنی جا رہا ہے......"

"تو شادی اٹینڈ نہیں کرے گا......؟"

http://kitaabghar.com

''ظاہر ہے......اس کا داخلہ ہو چکا ہے تو پھر شادی میں کیسے شامل ہوگا......''

''اوہ......ایک ہی تو داماد ہے ان کا اور وہ بھی......''اس کے بعد زہرہ نے تاسف سے بات ادھوری چھوڑی تھی۔

''یہ ہی تو میں سوچ رہی ہوں کہ اکلوتا داماد ہے احمد انکل کا تو کیا خیال ہے......اس کے جانے سے پہلے ایک ڈنر رکھ لیتے ہیں......''تبسم نے کہا۔

''ہاں، ٹھیک کہہ رہی ہو......پوری فیملی کو انوائیٹ کر لو......آخر وہ لوگ ہی کتنے ہیں......اچھا رہے گا۔''

''صحیح......میں ہمایوں سے بھی مشورہ کر لیتی ہوں۔ اس کے لیے ہی وقت نکالنا ایشو ہوتا ہے۔''اب کہ تبسم سیل فون پہ کچھ بٹن پریس کرتے ہوئے بولی تھیں۔ وہ یقیناً ہمایوں کو ہی کال ملا رہی تھیں۔ اور جب ہمایوں کے علم میں یہ بات آئی تو......تو یہ کہ اس نے بچنا چاہا......

''اس ڈنر کی کیا ضرورت ہے آپی......؟''یہ کہہ کر بچنا چاہا مگر یہ کہ یہ اِک دو دن کی بات نہ تھی اور یہ کہ ایسے ڈنرز اور لنچ تو اب چلتے ہی رہنے تھے تو وہ چاہ کر بھی بچ نہیں سکتا......تبسم نے اس کی بات کو بری طرح سے رد کر دیا تھا......وہ جہانگیر کو ڈنر پہ مدعو کر چکی تھیں۔

☆......☆......☆

''کل ہمایوں کے گھر ڈنر ہے......تبسم باجی کی کال آئی تھی۔''رات کے کھانے پہ جہانگیر نے اعلان کیا تھا۔ خولہ نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا......یہ اتفاق ہی تھا کہ آج اسکول میں اس کی مس مفتی سے کوئی ملاقات نہ ہو سکی تھی سو وہ لاعلم تھی۔

''ہاں......!احمد بھائی کا فون آیا تھا مجھے......وہ بتا رہے تھے کہ انہیں بھی مدعو کیا ہے انہوں نے......''فرخندہ کے کہنے پر خولہ نے بمشکل حلق سے نوالہ اتارا تھا۔ وہ کوئی ایسی ''ان کہی'' سی......''ان سنی'' سی بات تھی ان دونوں کے درمیان کہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے سامنا نہیں چاہتے تھے اور کمال یہ کہ دونوں ہی اس بات کو سمجھتے بھی تھے۔

''منع کر دیتے جہانگیر......!''خولہ نے اٹک کر کہا۔

اور اس کے یوں کہنے پہ جہانگیر بے طرح حیران ہوا۔

''کیسے منع کر دیتا......اتنے چاہ سے انہوں نے کال کی تھی اور یہ آنر ہوتا ہے محترمہ کہ کوئی آپ کے مقام کو......آپ کی اہمیت کو سمجھتا ہے۔''اور خولہ پریشان ہوئی تھی......یہ اچھا نہیں ہوا تھا......بالکل بھی اچھا نہیں ہوا تھا......یہ مفت کا عذاب تھا جو اس نے گلے ڈال لیا تھا......گلے پڑ چکا تھا۔

☆......☆......☆

''آپ مزنہ کو بھی لے آتے......بچی بیچاری کو گھر چھوڑ آئے......''

''میں نے تو کہا مگر ماموں راضی نہیں ہوئے......'' زہرہ کے کہنے پہ جہانگیر شرارت سے ہمایوں کو دیکھتے ہوئے بولا تھا اور ہمایوں......وہ مسکرا تک نہ سکا تھا۔

''لے کر آنے میں مسئلہ تو کوئی نہیں تھا زہرہ بہن! یہ اسی کا گھر ہے اور اس نے یہیں پہ آنا ہے مگر آپ کو تو معلوم ہے نا کہ معاشرہ اپنے رواج اور اپنے اصول طریقے رکھتا ہے تو بس دنیا کے ''الزام'' دینے سے خوف کھاتا ہوں۔'' احمد صاحب نرمی سے بولے تھے۔

''انکل! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ معاشرے سے بہت سے اختلاف رکھنے کے باوجود کچھ نہ کچھ لحاظ کرنا پڑتا ہے۔'' تبسم نے تائید کی تھی۔

اور وہاں مشروب پیش کیا جا رہا تھا۔ وہ سب بہت خوش دکھائی دیتے تھے۔ لمحے لمحے کے وقفے سے جہانگیر کے قہقہے گونجتے تھے...... باتوں کی بھنبھناہٹ تھی...... خوش، طمانیت بھرے، مسکراتے چہرے تھے۔ اور اک طرف سے کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو اٹھ رہی تھی کہ ملازم میز پہ کھانا چُن رہے تھے اور ایسے میں......وہ تھی جو کہ......سخت بے آرام تھی۔

''ہمایوں کیسا لگ رہا ہے آپی......؟'' مزنہ کا پیغام آیا تھا۔

اور اب اسے کیا بتاتی کہ وہاں......اس طرف دیکھنا بھی اس نے خود پہ حرام کر رکھا تھا۔

''کیسی ڈریسنگ کر رکھی ہے ہمایوں نے......؟'' دوسرا پیغام......اور خولہ نے بے ساختہ جبڑے بھینچے تھے۔ ہاتھ میں موجود سیل فون پہ گرفت بھی بے اختیار سخت ہوئی تھی۔

''ڈیشنگ لگ رہا ہے نا......؟'' اک اور پیغام......اور......اور خولہ چند لمحے اس آنے والے پیغام کو دیکھتی رہی اور پھر اس نے سیل فون آف کر دیا تھا......نہ......وہ اس کی طرف نہیں دیکھ سکتی تھی......بالکل بھی نہیں......اپنے لیے نہیں......''اس'' کے لیے......کہ اس کے دیکھنے سے ''ہمایوں'' بے آرام ہوتا......اسے تکلیف ہوتی......تو فرق نہ پڑتا مگر وہ یہ نہ چاہتی تھی کہ محض اس کی وجہ سے کوئی تکلیف میں ہو، بے آرام ہو......وہ یہ تو نہ چاہتی تھی۔

''مسز جہانگیر......! آپ بہت خاموش ہیں......'' تبسم نے اچانک سوال کیا تھا۔ وہ بری طرح چونکی اور عین اسی لمحے سب اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے ماسوائے ہمایوں کے......اسے ایک دم سیل فون دیکھنا یاد آیا تھا۔

''نہیں......بس ایسے ہی......'' اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے وہ آواز سنی تھی......مدھم مگر شائستہ......اور سیل فون پہ نظر آتے الفاظ گڈمڈ سے ہو گئے تھے۔ یہ کیسا عذاب تھا......کیسا عذاب جو اس پہ مسلط کر دیا گیا تھا۔

بے اختیار اس نے جلتی آنکھیں بند کر کے سوچا تھا۔

☆......☆......☆

http://kitaabghar.com

ہمایوں، تبسم، زہرہ......ان سب کو رخصت کرنے کے واسطے دروازے پہ موجود تھے۔ جہانگیر گاڑی باہر نکال رہا تھا۔ پورچ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ہمایوں اسے گائیڈ کر رہا تھا۔

''جہانگیر! بیک کریں......تھوڑا سا اور......اور......بس......اب کٹ کریں......''

احمد صاحب، زہرہ، تبسم مزنہ کی شادی ڈسکس کر رہے تھے اور وہ خاموش تھی...... بے حد خاموش......معمول سے زیادہ خاموش......گاڑی باہر نکال کر جہانگیر نے ہارن دیا۔ انہوں نے اجازت چاہی......اس نے تبسم اور زہرہ کا شکریہ ادا کیا اور قدم بڑھائے۔ پھپو بھی اس کے ساتھ تھیں۔ احمد صاحب اب ہمایوں سے ہاتھ ملا رہے تھے کہ جبھی اس نے سنا۔

''انکل! آپ بالکل بھی فکر مت کریئے گا...... جو بھی......جیسا بھی کام ہو...... مجھے اک کال کیجیے گا...... بنا جھجکے...... بنا کچھ سوچے......میں حاضر ہو جاؤں گا۔ ہال بک کروانا ہو یا پھر ایسا کوئی بھی دوسرا کام......آپ بس اک کال کر کے مجھے بتا دیجیے گا۔'' اور اس کا خلوص، اس کی آواز سے چھلک چھلک پڑ تا تھا۔ خولہ نے عجب احساس کے ساتھ اسے نہیں...... جہانگیر کو دیکھا تھا۔ مزنہ خوش قسمت تھی......یقیناً اسے ایک بہترین انسان ملا تھا۔

☆......☆......☆

''آپی! کیسا لگ رہا تھا ہمایوں......؟

''کیا کیا باتیں کیں اس نے......؟

میرا پوچھا......؟ ذکر کیا......؟'' آتے ہی مزنہ کے سوال شروع ہو گئے تھے۔ وہ مسکرائی...... دھیرج سے......اور پھر چند لمحے مزنہ کے معصوم، پُر جوش، اشتیاق بھرے چہرے کو دیکھتی رہی......پھر اس نے مزنہ کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اسے صوفے پہ بٹھایا اور کہا۔

''میں تمھیں یہ نہیں بتاؤں گی کہ وہ کیسا لگ رہا تھا، یہ بھی نہیں کہ اس نے کیا باتیں کیں اور تمہارا ذکر ہوا یا نہیں...... یہ بھی نہیں...... میں تمھیں بتاؤں گی مزنہ احمد......کہ وہ کیسا انسان ہے......کیسا......؟''

وہ بول رہی تھی اور مزنہ حیرت سے اسے تک رہی تھی۔

''اس نے ابو کو کہا......''

اور پھر وہ مزنہ کو بتانے لگی کہ وہ کیسا انسان تھا......کیسا......؟ اور مزنہ سب سن کر بھلا اس نے کیا کہا......

''شکر ہے میرے خدا! شکر ہے کہ ہمایوں، جہانگیر بھائی جیسا نہیں......'' اور اک پل میں......اک لمحے میں ''خولہ احمد'' کا چہرہ تاریک ہوا تھا۔ کوئی سیاہی سی اس کے چہرے پہ پھیلتی گئی تھی۔

☆......☆......☆

http://kitaabghar.com

اور پھر جہانگیر چلا گیا تھا۔ بنا یہ احساس کیے...... بنا یہ خیال کیے کہ خولہ کو ابھی ہی تو اس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ ابھی ہی تو......لیکن وہ چلا گیا تھا اور ہمایوں مفتی ان کی زندگیوں پہ چھاتا چلا گیا۔ اس کا وجود اتنا حاوی ہو گیا کہ ہر طرف بس وہ ہی وہ دکھنے لگا تھا۔ اس نے احمد صاحب کو ایسا مان، ایسی عزت دی تھی کہ وہ ہر بات، ہر مسئلہ اور ہر مشورہ بھی اس ہی سے کرنے لگے تھے۔ مہندی کے دن کی کیٹرنگ سے لے کر ہال کی بکنگ تک سب......اور ایسے میں خولہ کو بھی شامل ہونا پڑتا تھا کہ احمد صاحب اس کے بنا بھی چلتے نہ تھے۔

وہ بھی اک ایسا ہی دن تھا......اس دن احمد صاحب کو ہمایوں کے ساتھ جانا تھا......ہال وزٹ کرنے......خولہ چائے دینے آئی تھی۔ ہمایوں اپنے موبائل فون پہ احمد صاحب کو کچھ دکھا رہا تھا۔

"مجھ بڈھے کو ان چیزوں کا کیا معلوم......؟ یہ تو خولہ کو دکھاؤ اور اسی سے پوچھو کہ کیسی سجاوٹ ہو اور کیسی نہیں......میں تب تک چینج کر آتا ہوں......" احمد صاحب تو کہہ کر، اٹھ کر چلے گئے اور ان دونوں کو سکتے میں چھوڑ گئے تھے۔ ہمایوں نے سیل اسکرین بند کی اور سیل واپس رکھ لیا تھا۔ خولہ نے چائے کی پیالی بنائی......اور اس کے آگے رکھ کر اٹھ گئی......وہ دونوں ہی جانتے تھے کہ انہیں ایسی کوئی بھی ڈسکشن نہیں کرنی تھی۔

"اک بات مانیں گی آپ......؟" اس نے اپنی پشت پہ وہ آواز سنی اور خود کو حیرت سے مڑ کر اسے دیکھنے سے باز نہیں رکھ پائی تھی۔ اور وہ......وہ کپ کے کنارے پہ انگلی پھیرتے ہوئے سر جھکائے ہوئے تھا۔

کچھ دیر وہ حیرت سے دیکھتی رہی اور وہ اپنے شغل میں مصروف رہا اور پھر......اس نے اک گہرا سانس بھر کر اسے نہیں......کھڑکی سے باہر دیکھا تھا۔ وہ منتظر کھڑی تھی......وہ جانتا تھا مگر......

"میرے سامنے مت آیا کریں......" اور پھر سلگتے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔ تپش ایسی اور اتنی تھی کہ وہ خولہ احمد تک پوری طرح پہنچی تھی۔ وہ سن سی ہو کر رہ گئی تھی۔ خون میں کچھ اُبلا اور اس کے چہرے کو سرخ کر گیا تھا۔ اور وہ اسی سرخ چہرے کے ساتھ تیزی سے مڑ گئی تھی۔ اور وہ......ہمایوں......وہ اپنی ہی آگ میں بھڑ بھڑ جلتا وہاں بیٹھا رہا تھا۔

☆......☆......☆

گھر اس طرح سے بتیوں سے سجا ہوا تھا کہ جیسے کوئی دلہن Top to toe سجی سنوری ہوتی ہے۔ سنہری بتیوں کی وجہ سے پورا گھر بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ لان میں موجود درخت بھی ان ہی بتیوں کی وجہ سے سبز کے بجائے سنہری زیادہ دکھتے تھے۔ تنوں کے گرد لپٹی بتیاں، شاخوں میں الجھ کر جھولتی، جلتی بجھتی بتیاں، گھر کے باہر بیرونی دروازے کے دائیں بائیں بنے ستونوں پر بتیاں، گلی میں بھی بتیوں اور قمقموں کی سجاوٹ نظر آتی تھی۔ رات کے وقت بھی دن کا گماں گزرتا تھا۔ جس طرف نگاہ کرو، بتیاں ہی بتیاں......خوب صورت لائٹنگ، اک دم شاندار......

http://kitaabghar.com

اس لائٹنگ کے علاوہ ایک مخصوص چہل پہل بھی نظر آتی تھی۔ اِدھر اُدھر بھاگتے بچے، آتے جاتے لوگ، مہمان اور داخلی دروازے کے پاس چہرے پر مسکراہٹ سجائے کھڑے میز بان......اک مخصوص سا شور، ویسا ہی کہ جیسا کسی بھی تقریب میں ہوتا ہے۔اور اگر بیرونی دروازے سے جیسے ہی اندر جاؤ اور قدم جوں جوں اندرونی سمت بڑھتے جائیں تو ساری آوازوں پر حاوی ہوتی اک آواز سنائی دیتی تھی۔ڈھولک کی تھاپ......تھاپ اک لے میں گونجتی تھی اور گونجتے، گونجتے یک دم بے ڈھنگی سی ہوتی اور پھر چند نسوانی قہقہے بلند ہوتے، ذرا سا شور ہوتا اور پھر سے تھاپ اسی لے میں گونجنے لگتی۔سریلی سی آوازیں ماہیے گانے لگتیں۔

آج مہندی تھی اور مزنہ کو خوب غضب کا روپ چڑھا تھا......نظر ٹھہرتی نہ تھی......گوری رنگت اور اس پر چہرہ معصوم، اس کے چہرے کے اک اک نقش میں بنانے والے نے معصومیت کوٹ، کوٹ کر بھر رکھی تھی۔ پیلا جوڑا، پیلی، سبز، سنہری چوڑیاں، پیلے، سفید، سرخ پھولوں سے لدی ہوئی، دوپٹے کا ذرا سا گھونگٹ نکالے وہ شرم سے لال، پیلی ہوئی جا رہی تھی۔اس کی سہیلیاں اس کے کمرے میں موجود تھیں اور اسے چھیڑنے کے ساتھ ساتھ ڈھولک بھی بجا رہی تھیں، ڈھولک پھر سے اک لے کے ساتھ بج رہی تھی۔

”دولھا والے آ گئے، دولھا والے آ گئے......اٹھو، اٹھو......جلدی کرو، پلیٹیں پکڑو، شمی، امبر۔“ ایک دم کسی نے آ کر کہا تھا اور ڈھولک بجنا بند ہوئی۔کئی آوازیں اِک ساتھ بلند ہوئیں۔اک افراتفری سی پھیلی اور چند منٹوں میں ہی کمرا خالی......

مزنہ اکیلی رہ گئی تھی۔اس نے اٹھ کر کھلا دروازہ ذرا سا بھیڑ دیا تھا اور پھر سج سج کر قدم اٹھاتے ہوئے آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔دوپٹے کو چہرے سے ذرا سا سرکایا، اپنا روپ دیکھا اور اک مسکراہٹ اس کے چہرے پر روشنی کی طرح چمک کر پھیلی تھی۔وہ شاید ابھی کچھ دیر اور آئینے کے سامنے یوں ہی کھڑی رہتی کہ دروازہ اچانک کھلا تھا، وہ بے ساختہ مڑی اور آپی کو دیکھ کر وہ بے اختیار جھینپی تھی۔

خولہ اس کے جھینپنے پر مسکرائی تھی۔لیکن اس کی مسکراہٹ کو اِک عجیب سے تاثر نے اچانک ہی ڈھانپ لیا تھا۔وہ چند لمحوں کے لیے ٹھہر سی گئی۔قدم بڑھا کر مزنہ تک نہ جا سکی تھی۔اور مزنہ......وہ وہیں سر جھکائے اسی جھینپے انداز میں کھڑی تھی۔خولہ نے اِک گہری سانس بھری، نرمی سے چلتے ہوئے وہ اس تک آئی۔مزنہ کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے، مزنہ نے سر اٹھا کر مسکراتی مگر جھینپی نگاہوں سے خولہ کو دیکھا تھا۔

”مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“ خولہ نے نرم لہجے میں کہا۔اور پھر اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھایا اور خود بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔کہنے کو تو اس نے کہہ دیا تھا کہ اسے کچھ بات کرنی ہے مگر اب......وہ گونگی ہو کر رہ گئی تھی۔

”آپی......!“ مزنہ نے اس کے نہ بولنے پر آہستہ سے پکارا تھا۔

”ہمایوں بہت اچھا انسان ہے......میں جانتی ہوں مزنہ کہ وہ تمہیں بہت اچھے سے رکھے گا لیکن......لیکن......اسے کبھی بھی یہ معلوم ہونے نہ دینا......کبھی بھی نہیں کہ......“

☆......☆......☆

اس کے ناک کے نتھنوں سے کوئی دلفریب سی خوشبوسی ٹکرائی تھی۔ اتنی دلفریب و مسحور کن کہ اس نے جاگی، سوئی کیفیت میں ہی اس خوشبو کو کھینچ کر اندر تک اتارا تھا۔ اور پھر اس کے بعد وہ آنکھیں کھولنے پہ مجبور ہوئی تھی۔ اپنا ہاتھ منہ پہ رکھ کر اس نے جمائی لی۔ آنکھیں ایک دو بار جھپکیں کہ نیند زور آور تھی اور پھر خوشبو کا منبع نظر کی گرفت میں آیا تھا...... وہ ہمایوں تھا...... اور فارمل ڈریسنگ میں نظر آ رہا تھا۔ یوں جیسے کہیں جا رہا ہو، کیا آفس......؟ مزنہ حیران تھی۔ وہ اب اپنے کھلے بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹ رہی تھی مگر نظریں ہنوز ہمایوں پہ تھیں۔ ہمایوں ٹائی کی ناٹ لگاتے ہوئے اس کے عکس کو دیکھ کر مسکرایا۔

"اٹھ گئیں......؟" وہ مڑتے ہوئے بولا۔

"کہاں جا رہے ہیں......؟" جواب نہیں سوال آیا تھا۔

"آ......" ہمایوں اِک لمحے کے لیے رکا۔

"آفس جا رہا ہوں...... آج 22 ہے نا...... ایک اہم میٹنگ تھی آج بس اٹینڈ کر کے آ جاؤں گا...... ڈونٹ وری......" وہ اب مصروف سے انداز میں جوتے پہنتے ہوئے بولا تھا۔

مزنہ نے برا سا منہ بنایا اور وہ اس کے یوں منہ بنانے پہ ہنس دیا...... پھر اس کے قریب آیا۔ ذرا جھکا اور اس کے سر کو چوما تھا۔

"جلدی آ جاؤں گا......" یہ کہہ کر وہ لیپ ٹاپ کا بیگ اٹھاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ مزنہ نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا اور ایک جمائی لیتے ہوئے وہ پھر سے بستر میں گھس گئی تھی کہ شادی ہوئے آج تیسرا دن تھا...... اسے فی الحال سونے کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہ تھا۔

☆......☆......☆

موبائل بج رہا تھا اور بجے ہی چلا جا رہا تھا۔ وہ کچن سے دوڑتی ہوئی آئی اور جب فون اٹھا کر دیکھا تو...... "جہانگیر کالنگ" کے الفاظ اسے بدمزہ کر گئے تھے۔ اس کا بالکل بھی دل نہ تھا کہ وہ اس سے بات کرتی...... اس نے پھپو کی تلاش میں نظریں دوڑائیں...... وہ باہر لان میں تھیں...... اتنے میں فون اِک بار خاموش ہو کر پھر سے بجنا شروع ہو چکا تھا۔ اب کی بار وہ تقریباً بھاگتے ہوئے باہر آئی اور کال ریسیو کر کے فوراً فون پھپو کو پکڑا دیا تھا۔

"جہانگیر ہے......" ان کی استفہامیہ نگاہوں کے جواب میں اس نے کہا اور خود پھر سے کچن میں چلی گئی تھی۔ دل کی عجب حالت تھی۔ نہ سمجھ میں آتی تھی، نہ پکڑ میں...... جہانگیر سے بات تک کرنے کو دل نہ کرتا تھا، اِک عجب ڈپریسنگ سی کیفیت تھی جو ہر وقت اسے جکڑے رکھتی تھی۔ اسے جہانگیر سے ایسی توقع بالکل نہ تھی اور اب کی بار جیسے وہ ٹوٹی تو بری طرح سے ٹوٹی تھی۔

"خولہ......!" اسے خیالات سے باہر لانے والی پھپو کی آواز تھی۔ بے اختیار اس نے آنکھیں بند کی تھیں کہ پھپو یقیناً اسے فون

دینے کے لیے بلا رہی تھیں اور وہ ناک تک بیزار ہوئی مگر چارہ اور کچھ نہ تھا۔ مرے مرے قدموں سے وہ باہر کی جانب بڑھی اور پھپھو سے سیل فون لیا تھا۔

"السلام علیکم......!" انداز ٹھنڈا سا تھا۔ وہ وہیں سیڑھیوں پہ بیٹھ گئی۔

"وعلیکم السلام......! کیسی ہو خولہ......؟" اور وہاں جوش ٹھاٹھیں مارتا تھا۔

"ٹھیک ہوں......" اکتایا لہجہ......اور پھر وہاں ان نفوس کی سانسوں کی آواز تھی اور بس......

"ناراض ہو......؟"

"کیوں، میں کیوں ناراض ہوں گی......؟"

"اکھڑا اسا لہجہ ہے تمہارا......"

"نہیں تو......!" وہ صاف مکری۔

"اچھا! مزنہ کی شادی خیریت سے ہوگئی......؟ کوئی مشکل......"

"ہاں...... بالکل خیریت سے ہوئی...... بلکہ اچھے سے ہوگئی...... مشکل کیوں پیش آنی تھی جہانگیر......؟ نہیں......کوئی مشکل پیش نہیں آئی...... ہمایوں نے سب سنبھال لیا تھا۔ بڑی مدد ہوئی تھی...... ہمیں تو کچھ کرنا ہی نہیں پڑا......" وہ اس کی بات کاٹ کر بڑے ہی تپتے ہوئے لہجے میں بولی تھی اور جہانگیر......

"جتا رہی ہو......؟" وہ بھی تیکھا ہوا۔

"تمہیں ایسا کیوں محسوس ہوا......؟" وہ الٹا حیران ہوئی۔

"تم نے پوچھا شادی کا...... میں نے بتا دیا......اب اس سب میں تمہیں کچھ "جتاتا" ہوا لگتا ہے تو میں کیا کروں......" اور جہانگیر نے بے اختیار جبڑے بھینچے تھے۔ وہ چند لمحے خاموش رہا......اس نے جھگڑنے کے لیے کال نہ کی تھی۔

"اچھا چلو یہ بتاؤ تم کیسی دکھ رہی تھیں؟"

"پکس بھیج دوں گی......دیکھ لینا۔" اور بیزاریت سوا نیزے پہ آئی۔

"خولہ......! یار کیا ہے؟ سیدھے منہ کیوں نہیں بات کر رہی ہو؟" وہ زچ ہوا اور بے طرح ہوا۔

"جہانگیر......! ہم پھر بات کریں گے......پلیز......" وہ اپنا ماتھا مسلتے ہوئے بولی تھی۔

"اوکے......خیال رکھنا اپنا......" اور خولہ نے کچھ بھی کہے بنا فون کاٹ دیا اور کاٹ کر اپنے برابر زمین پہ ڈال دیا......وہ اب گھٹنوں پہ سر رکھے، خموش بیٹھی تھی...... یہ جانے بغیر کہ فرخندہ کیسی گہری نگاہوں سے اسے تکتی تھیں۔ وہ اٹھیں......اس کے قریب آئیں......

اور پھر اس کا سر تھپتھپا کر اندر چلی گئیں...... خولہ کی ناراضی اتنی غلط نہ تھی۔ وہ جانتی تھیں اور خولہ...... اس کا دل اتنا بھر آیا...... اتنا کہ آنکھوں کے کناروں سے بہنے لگا۔

وہ کتنی خالی ہو گئی تھی نا...... کتنی خالی......

''آہ جہانگیر......! مجھے تمہاری ضرورت تھی...... ابھی تو...... ابھی ہی تو سب سے زیادہ ضرورت تھی......'' وہ بے آواز بڑبڑائی تھی۔

☆......☆......☆

''السلام علیکم!'' میٹنگ روم کا دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہوتے ہوئے بولا تھا۔

بڑے ماموں، ولی ماموں اور جس کمپنی کے ساتھ میٹنگ تھی ان کے نمائندہ افراد نے چونک کر اس آواز اور اس وجود کی جانب تکا اور پھر ان کا دوسرا expression حیرانی کا تھا۔

ہمایوں مفتی کی شادی ہوئے آج تیسرا دن تھا۔ سارا شہر جانتا تھا...... پھر اس کی یہاں موجودگی......؟ چہ معنی دارد؟ بڑے ماموں نے ولی ماموں کو دیکھا...... نگاہوں ہی نگاہوں میں کچھ تبادلہ ہوا...... اور وہ اتنی دیر تک اپنی نشست سنبھال چکا تھا اور اب اپنا لیپ ٹاپ ٹیبل پر رکھ کر اسے آن کر رہا تھا۔ اور بڑے ماموں بڑی ہی چبھتی نظروں سے اسے تک رہے تھے۔ ریلیکس انداز میں بیٹھے، پین کو دونوں ہاتھوں میں گھماتے وہ اسے پلک جھپکے بنا دیکھ رہے تھے۔

''ایسے مت دیکھیں ماموں......! مجھے بھی معلوم ہے کہ میری شادی کو بس تین دن ہی ہوئے ہیں اور یہ کہ مجھے یہاں نہیں ہونا چاہیے......'' وہ لیپ ٹاپ پہ مختلف کیز دباتا، بنا انہیں دیکھے بولا تھا۔

اس طرزِ عمل پہ بڑے ماموں نے پھر سے ولی ماموں کو دیکھا۔ پھر سے نگاہوں ہی نگاہوں میں کچھ تبادلہ ہوا اور وہ کھنکھار کر سیدھے ہوئے، کہنیاں ٹیبل پہ ٹکائیں اور بولے۔

''ولی......!'' ولی ماموں نے پاس موجود بریف کیس سے چیک بک نکالی...... اور اک چیک بھرنے لگے...... اور ان کے ہر اک انداز میں تندی سی جھلکتی تھی...... یوں جیسے وہ ناراض سے ہوں۔

''میٹنگ اہم تھی ماموں......!'' وہ اب کہ سر اٹھا کر ممتاز ماموں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''Hmm...'' ممتاز ماموں نے ہمم سا کیا۔

ولی ماموں چیک بھر چکے تھے۔ انہوں نے ممتاز کو دکھایا اور پھر چیک پھاڑ کر سامنے بیٹھے ہمایوں کے منہ پہ دے مارا تھا۔

''ماموں......!'' وہ شاکڈ ہوا تھا، اس عزت افزائی پہ۔

''گیٹ آؤٹ......!'' یہ ممتاز صاحب تھے۔

''یہ چیک پکڑو اور دفعہ ہو جاؤ یہاں سے......میٹنگ جتنی بھی اہم سہی، لیکن اتنی اہم پھر بھی نہیں جو تم یوں منہ اٹھا کر......

''تیسرے دن......'' ولی ماموں نے لقمہ دیا۔

''ہاں! تیسرے دن......منہ اٹھا کر آفس آ جاؤ۔'' ممتاز ماموں گھن گرج کے ساتھ بول رہے تھے۔ اور ان کا غصہ دکھاوے کا لگتا تھا۔

''لیکن ماموں......؟'' اور وہ حیران حیران سا دکھتا تھا۔

ولی ماموں اٹھے......اس کا لیپ ٹاپ شٹ ڈاؤن کیا......بیگ میں ڈالا......چیک پکڑ کر اس کی جیب میں رکھا اور اسے اٹھاتے ہوئے بولے۔

''گیٹ آؤٹ......!'' حاضرین کی دبی دبی ہنسی کی آواز گونجی اور وہ شاکڈ......حیران......دروازے کی جانب بڑھتا گیا مگر بار بار مڑ کر بھی دیکھتا تھا......حیرت سے......بے یقینی سے......

لیکن وہاں کون تھا جو اس پہ توجہ دیتا......ممتاز ماموں نے ''جینٹل مین'' کہہ کر پھر سے میٹنگ اسٹارٹ کر دی تھی۔ وہ میٹنگ روم سے باہر نکلا......خجالت سے سر کھجایا اور پھر سر جھٹک کر مسکرا دیا۔

چیک یقیناً ہنی مون کے لیے دیا گیا تھا۔

☆......☆......☆

وہ جب گھر میں داخل ہوا تو ابھی ناشتہ ہو رہا تھا۔ وہ صرف جوس کا اک گلاس پی کر گھر سے نکلا تھا۔ ارادہ واپس آ کر ناشتا کرنے کا تھا مگر ہوا کیا تھا......وہ اِک گہری سانس لیتا ہوا ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھا تھا۔

''السلام علیکم......!''

''وعلیکم السلام......!'' سلام کا جواب زہرہ کی طرف سے آیا تھا۔ اس کے سلام کرنے پہ مزنہ نے تبسم کو اور تبسم نے مزنہ کو بیک وقت دیکھا اور دونوں کی ہنسی چھوٹ گئی......زہرہ اور ہمایوں......دونوں نے ہی حیرت زدہ ہو کر ان دونوں کو دیکھا تھا۔

''بڑے بے آبرو ہو کر، ترے کوچے سے ہم نکلے......چچ......چچ......چچ......''

وہ تبسم تھیں......جو چائے کی پیالی زہرہ کو سرو کرتے ہوئے بڑے ہی مزہ لیتے انداز میں بولی تھیں اور مزنہ......وہ کہنی ٹیبل پہ رکھے......گال ہاتھ پہ ٹکائے......بے حد محظوظ انداز میں ہمایوں کو دیکھ رہی تھی۔

ہمایوں کا منہ کھلا......اس نے کچھ کہنا چاہا......مگر چند لمحے سوچتا رہا اور پھر اس نے ہونٹوں کو مس کرتے ہوئے منہ بند کیا......سر کھجایا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا تھا۔ ان دونوں کی ہنسی ایک بار پھر سے گونجی تھی۔

''کیوں ہنس رہی ہو تم دونوں......؟'' زہرہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

http://kitaabghar.com

''اس سوال پہ مزنہ نے سر جھکا کر ہنسی دبائی اور تبسم نے کہا۔

''کچھ نہیں امی......بس صبح صبح ہی کسی کی بڑی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوئی ہے۔

''تو آپ تک خبر پہنچ گئی......؟'' ہمایوں کے یوں کہنے پر تبسم نے فرضی کالر جھاڑے تھے۔

''کس نے کہا تھا شادی کے تیسرے دن آفس جانے کو......؟'' اور ہمایوں نے گھور کر تبسم کو دیکھا تھا۔

''تم آفس گئے تھے......؟'' یہ ازحد حیرت بھرا لہجہ یقیناً زہرہ کا ہی تھا۔

''وہ......امی......دراصل......آہم......'' اور اس کے بعد ہمایوں نے بے ساختہ گلا کھنکھارا تھا......ایک جھاڑ وہ تھی جو کہ تھوڑی دیر پہلے پڑی تھی اور اب اک یہ تھی جو کہ پڑنے جا رہی تھی۔

''ہمایوں......!تم میں ذرا سی بھی سینس ہے کہ نہیں......؟'' اور زہرہ اسٹارٹ ہو چکی تھیں۔

''وہ......امی......وہ......میٹنگ......'' اور ہمایوں......وہ بیچارا اس جھاڑ نما طوفان میں غوطے کھاتا رہا۔

''مزنہ اور تبسم کی ہنسی ایک بار پھر سے گونجی تھی۔اب کہ وہ ہاتھ پہ ہاتھ مار کر ہنس پڑی تھیں اور ہمایوں......وہ بس مزنہ کو گھور کر رہ گیا تھا۔

☆......☆......☆

''مجھے نہیں جانا ملائیشیا......مجھے کالام دیکھنا ہے......چترال گھومنا ہے اور گلگت کی سیر کرنی ہے۔'' وہ ہمایوں کی ملائیشیا جانے کی تجویز کو رد کرتے ہوئے بولی تھی۔

''کمال ہو یار تم بھی......!سوچ لو، ملائیشیا جانے کا موقع بار بار نہیں ملے گا۔''

''پہلے اپنا ملک تو دیکھ لوں......پھر ملائیشیا بھی دیکھ لوں گی......چترال، کالام جانے کا موقع بھی کون سا بار بار ملے گا۔'' وہ کندھے اچکا کر بولی۔

''اچھا......ٹھیک ہے......میں انتظام کرتا ہوں۔گھر ملنے جانا ہے......؟'' ہمایوں نے اپنا سیل فون نکالتے ہوئے کہا۔

''ہاں......!جانا تو ہے......''

''تو ٹھیک ہے......تیار ہو جاؤ......ابھی چھوڑ آتا ہوں......''

''اوکے......!'' وہ کہتے ہوئے اٹھی اور پھر جاتے جاتے یک دم رکی تھی۔

''آپ ٹھہریں گے وہاں......؟'' وہ ڈریسنگ روم کے دروازے پہ رک کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

ہمایوں نے لاشعوری طور پر سر اٹھا کر مزنہ کو دیکھا اور دیکھ کر ٹھہر سا گیا......ان آنکھوں کی مشابہت......اور پھر فوراً نظریں پھیری

تھیں......اس کے حلق سے کچھ نیچے اترتا دکھائی دیا تھا۔

''نہیں......''اس نے مدھم سا کہا تھا۔

☆......☆......☆

''آپی......!''اسے اپنے پیچھے اک چہکتی سی آواز سنائی دی۔وہ چونک کر مڑی اور پھر بے اختیار خوش ہوئی تھی۔

''مزنہ......!''اس کے ہونٹوں نے بنا آواز کہا تھا۔

اور مزنہ دوڑتے ہوئے اس کے گلے لگی تھی۔خولہ نے فرطِ جذبات سے اس کا منہ چوما تھا۔

''کیسی ہو؟''

''بالکل ٹھیک......''

''خوش ہو......؟''

''بہت......''اور مزنہ نے آنکھیں میچ کر جذبات سے پُر لہجے میں کہا۔

''اللہ خوش رکھے......!''خولہ اسے شانوں سے تھام کر بولی تھی۔

''ابو،پھپھو کہاں ہیں......؟''

''یہیں ہیں......کہاں جانا ہے انہوں نے......''

''اکیلی آئی ہو......؟''

''جی......''اور خولہ اک بار پھر ٹھہر کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

''نظر لگائیں گی؟''مزنہ اپنی کلائی میں موجود طلائی کنگن کو گھماتے ہوئے اترا کر بولی۔

''اللہ نہ کرے......جو تمہیں میری چھوڑ......کسی کی بھی نظر لگے......''

خولہ کے دل پہ ہاتھ پڑا تھا......نہ جانے کیوں......؟

''آؤ اندر چلو......''وہ اس کا ہاتھ تھام کر اندر کی طرف بڑھتے ہوئے بولی تھی۔

''ابو......!''اور وہ احمد صاحب کو بھی دیکھ کر بچوں کے سے انداز میں کہہ کر ان کی طرف بڑھی تھی۔

''میرا بچہ......!''احمد صاحب نے اسے بازوؤں میں بھرا تھا۔

''کیسی ہے ابو کی جان......؟''

''بالکل ٹھیک......''

http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com
fb.com/sehar.sajid.official kitaabghar.com

''اور ہمایوں......؟'' اور خولہ انہیں باتیں کرتا چھوڑ کر کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔ مزنہ آئی تھی۔ اسے اب ڈنر پہ کچھ خاص اہتمام جو کرنا تھا۔

☆......☆......☆

''یہ رہی آپ کی چائے......!'' وہ لان میں جھولے پہ بیٹھی آسمان کو تک رہی تھی تبھی مزنہ چائے لے آئی تھی۔ ڈنر کے بعد اس نے خولہ کو مزید کچھ نہ کرنے دیا تھا۔ خولہ نے مسکرا کر اس کے ہاتھ سے مگ پکڑا اور مزنہ بھی اپنا مگ سنبھالتی ہوئی اس کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔ وہ پیر کے پنجوں کی مدد سے جھولا ہلکے ہلکے جھلا رہی تھی۔ اور دونوں ہاتھوں میں مگ تھامے وہ بھی اب چاند کو دیکھ رہی تھی۔

''ہمایوں ٹھیک ہے نا تمہارے ساتھ......؟'' نا معلوم کیسی تسلی تھی جو خولہ کو درکار تھی۔

''ہاں......ٹھیک ہے......ان فیکٹ بہت اچھے ہیں......'' مزنہ نے جذبات سے پُر ہو کر جواب دیا۔

''پر اک بات ہے آپی......!''

اور خولہ کا دل بے وجہ دھڑ کا......اس نے چونک کر مزنہ کو دیکھا۔

''کیا......؟''

''ہمایوں براہِ راست، میری طرف دیکھ کر بات کرنے سے کتراتا ہے۔'' اور خولہ کا سانس خشک ہوا۔

''کیوں......؟''

''معلوم نہیں......ہوسکتا ہے یہ میری اپنی فیلینگز ہوں۔''

''نہیں، ایسے ہی تمہیں محسوس ہوا ہوگا۔''

''ہاں، ہوسکتا ہے......'' مزنہ نے کندھے اچکائے۔ اور اس کے انداز میں لاپرواہی جھلکتی تھی۔

''ویسے ہے بہت کول ہمایوں......اتنا ٹھنڈا اور دھیرج والا مزاج ہے اسکا کہ بس......مجھے نہیں لگتا کہ اگر اسے معلوم ہوا کہ......''

''مزنہ......!'' اور خولہ نے دہل کر اس کے بازو پہ ہاتھ رکھا تھا۔

مزنہ نے بے ساختہ بات ادھوری چھوڑی تھی۔

''آپ اتنی خوفزدہ کیوں ہو جاتی ہیں آپی......؟'' وہ انتہا حیرت سے بولتی تھی۔

''نہیں مزنہ......!نہیں......!تم یہ بات کبھی بھی اسے نہیں بتاؤ گی......وعدہ کرو مجھ سے......کبھی بھی نہیں......'' اور مزنہ......وہ حیرت سے خولہ کا چہرہ دیکھتی رہی۔ پتا نہیں یہ کیسا وہم تھا جو خولہ کو لاحق تھا۔ اسے خوف تھا کہ یہ بات اگر ہمایوں کو معلوم ہوگئی تو کچھ غلط ہو کر رہے گا۔

''ٹھیک ہے......ٹھیک ہے......آپ کی وجہ سے......محض آپ کے کہنے پہ میں اسے نہیں بتاتی......مگر جتنا میں نے ہمایوں کو جانا ہے اسے اگر یہ معلوم ہو بھی جائے تو وہ ری ایکٹ نہیں کرے گا۔''

''اور چار دن میں کتنا جان لیا تم نے ہمایوں کو......؟ ہاں......؟''اب کہ خولہ تپ کر بولی تھی۔

''آپی......! آپ بھی نا......ایویں ہی پریشان ہوتی رہتی ہیں۔''وہ بات اڑانے والے انداز میں بولی تھی۔اور اس انداز پہ خولہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔

''اچھائی کا تب پتا چلتا ہے جب کوئی خلاف فطرت بات انسان کے سامنے آتی ہے۔سو تم کیوں اس کی اچھائی کو آزمانا چاہتی ہو......مزنہ کیوں......؟''خولہ ٹھنڈے لہجے میں بولی تھی۔

اور مزنہ......وہ اب کی بار خاموش ہو کر چائے کی چسکیاں بھرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر سے چاند کو تکتی تھی۔اور خولہ......

''یہ راز اک سلگتی چنگاری ہے......وہ چنگاری جو اک ایسی نار کو بھڑکا دے گی کہ سب کچھ جلا کر بھسم کر دے گی......راکھ میں بدل دے گی......سو راز کو راز رہنا چاہیے......تا کہ''نار''بھڑک نہ سکے......کبھی بھی نہیں......کبھی بھی نہیں......''اور خولہ بھی چاند کو تکتے ہوئے سوچتی گئی پر کہہ نہ سکی تھی۔

❁ ❁

ناول نار ابھی جاری ہے۔اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 5 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

http://kitaabghar.com

قسط نمبر 6

''کیا......؟'' وہ جہانگیر کی کسی بات کے جواب میں پھٹ پڑی تھی۔

''تم جرمن نیشنلٹی لینا چاہتے ہو...... جہانگیر! ناؤ واٹ اِز دِس......سیریسلی ...... واٹ اِز دِس......؟ تمہیں باہر جا کر پڑھنا تھا......فیوچر بنانا تھا......یہاں تک تو ٹھیک تھا......اب یہ کیا ہے......؟ کیا......؟''

وہ حیران سے زیادہ ہرٹ ہوئی تھی یعنی کہ اس کی ساری عمر یوں ہی ڈھوتے ہی گزر جائے گی......کوئی پھل اس کی قسمت میں نہیں تھا کیا......؟

''تم نا خولہ......! تم جہان بھر سے نرالی عورت ہو۔ لوگ تو ترستے ہیں یورپین نیشنلٹی کے لیے اور تم ہو کہ......'' اور اس نے خفگی سے بات ادھوری چھوڑی تھی۔

''اچھا......ٹھیک ہے...... لے لو تم وہاں کی نیشنلٹی ......ٹھیک ہے...... یہ بھی کر لو......لیکن مجھے یہ بتاؤ کہ پیچھے تمہاری جو اِک عدد فیملی ہے اس کا کیا ہوگا......؟'' وہ بھی تنک کر بولی تھی۔

''ظاہر ہے......اپنے اور تمہارے ویزے کے لیے اپلائی کروں گا......''

''چلو میں تو تمہارے پاس آ گئی کہ قسمت سے بیوی ہوا کرتی ہوں تمہاری......مگر ابّو اور پھپو کا کیا ہوگا......؟ کیا......؟ ان کو اس عمر میں کس کے سہارے چھوڑو گے......؟''

اور اس سوال کا جواب نہ تھا جہانگیر کے پاس ......وہ یک دم خاموش ہوا تھا۔

''ان کو بھی بُلا لوں گا......''

''کب......؟ جب اُن کا ویزا لگے گا تب نا......؟ اور اس میں کتنا وقت درکار ہوتا ہے یہ اب میں تمہیں بتاؤں کیا......؟''

''خولہ! تم کیوں میرے لیے مسئلے کھڑے کرتی ہو......؟ آخر کوئی مجھے کیوں نہیں سمجھتا...... میرے بھی تو کچھ خواب ہیں...... مجھے پھر سے ویسی ہی زندگی......ویسا ہی اسٹیٹس حاصل کرنا ہے جیسا کہ میرے باپ کا تھا۔''

''بس کردو جہانگیر......! بس کر دو......ہم تھک چکے ہیں تمہارے خوابوں کی قیمت ادا کرتے کرتے......'' اور اب کے وہ دکھ سے

کہہ رہی تھی۔اور فون کے دونوں جانب خاموشی سی پھیل گئی تھی۔

’’میں کبھی بھی......کبھی بھی تمہارے اس فیصلے میں تمہارا ساتھ نہ دوں گی......اور میرا خیال ہے پھوپھو بھی نہیں دیں گی اور رہ گئے ابّو......تو یقین کرو جہانگیر......! میرا یقین کرو......وہ کبھی بھی تمہارے آسرے پہ......تمہارے پاس مستقبل میں جرمنی شفٹ نہ ہوں گے......کیونکہ تم ان کے بیٹے نہیں ہو......تم ان کے داماد ہو اور تم نے ان کو آج تک یہ ہی بتلایا ہے......‘‘خولہ نے سلگتے ہوئے کہا اور سیل فون بند کر کے پرے پھینکا تھا۔بے اختیار اس نے سر کو دونوں ہاتھوں پہ گرایا تھا۔زندگی کیوں اتنی مشکل ہوتی جا رہی ہے......کیوں......؟

☆......☆......☆

جہازی سائز بیڈ کے اوپر ایک سوٹ کیس کھلا پڑا تھا۔سوٹ کیس کے پاس ہی کپڑوں کا ایک ڈھیر رکھا ہوا تھا......اور ڈھیر سے ذرا فاصلے پہ کاسمیٹکس،لوشنز،باڈی اسپرے،شاور جیلز اور اسی طرح کی دوسری چیزیں اس ننھے سے ہجوم کی صورت موجود تھیں اور اگر بیڈ سے ذرا نیچے جھانکو......پائنتی کی طرف تو وہاں جوتے رکھے نظر آتے تھے۔وہ یقیناً شمالی علاقہ جات کی سیر کے لیے نکلنے والے تھے اور یہ پیکنگ اسی لیے تھی۔مزنہ اب کپڑے تہہ کر کے رکھتی جا رہی تھی۔ہمایوں باتھ لے کر نکلا تھا۔تولیے سے سر رگڑ کر اس نے تولیہ پرے پھینکا......خوشبو کی آدھی بوتل خود پر خالی کی......اور پھر بال بنا کر وہ الماری کی طرف مڑا تھا۔

’’پرفیوم تو یوں انڈیلی ہے جیسے کسی ڈیٹ پہ جانا ہو۔‘‘مزنہ نے اسے چھیڑا......وہ مسکرایا۔

’’کیوں بھئی......خود کے لیے نہیں انڈیلی جا سکتی پرفیوم......ضروری ہے کہیں جانا ہو تو تب ہی لگائی جائے۔ Grow up baby!‘‘

پنجوں کے بل نیچے بیٹھتے ہوئے،اس نے بھی مزنہ کو چھیڑا تھا۔مزنہ ہلکے سے ہنس دی تھی۔وہ اب الماری کے نچلے حصّے سے کچھ نکال رہا تھا۔

’’میرا Shaver رکھ لیا......؟‘‘

وہ وہیں سے بیٹھے بیٹھے بولا تھا۔

’’Oops!‘‘مزنہ نے زبان دانتوں تلے دبائی اور مڑ کر ڈریسنگ کے دراز سے اس کا شیور نکالنے لگی تھی۔

’’اپنی تو ایک لپ اسٹک بھی تم نہیں بھولیں......‘‘اب کی بار وہ اٹھتے ہوئے بولا تھا۔چہرے پر مسکراہٹ تھی۔مزنہ نے دانت نکال کر اسے دیکھا اور......پھر یک دم رک سی گئی۔

’’گٹار......؟‘‘وہ حیران تھی۔

ہمایوں نے ابرو اٹھا کر،اس کی حیرت کو ایک compliment کی طرح وصول کیا تھا۔

http://kitaabghar.com

''آپ کو آتا ہے بجانا......؟'' وہ اب بچوں کے سے اشتیاق سے پوچھ رہی تھی......وہ ایک 12-Strings گٹار تھا۔

''نہیں......ایویں ہی رکھا ہوا ہے۔''

''ہمایوں......!'' وہ ٹھٹکی۔

''ظاہر سے آتا ہے اور اسی لیے نکالا ہے کہ دریائے کنہار کے کنارے بیٹھ کر بجاؤں گا اسے۔'' وہ اب بے حد احتیاط سے ایک کپڑے کے ساتھ گٹار کی strings صاف کر رہا تھا۔

''کچھ سنائیں......'' وہ اشتیاق سے گال پہ اِک ہاتھ رکھے، اس کے سامنے بیڈ پہ ٹک گئی۔ ہمایوں نے اِک نظر اسے دیکھا۔

''چلو......اٹھو......اٹھو......یہ پیکنگ ختم کرو......بڑا کام ہے یہ بھی......'' ہمایوں چٹکی بجا کر اسے اٹھاتے ہوئے بولا اور مزنہ برا سامنہ بنا کر اٹھ گئی تھی۔

''ابھی یہ سیٹ کرنے والا ہے۔ مجھے اس کو پالش بھی کرنا ہے......'' وہ اب کے Tuners کے ساتھ مصروف تھا۔

''اور یہ میں تمہیں دریائے کنہار کے کنارے ہی سناؤں گا......جو مزہ وہاں ہے......وہ یہاں کہاں......'' مزنہ کا چہرہ یک دم کھلا تھا۔

''ہاؤ رومینٹک......!'' وہ آنکھیں میچ کر خوشی سے بولی تھی۔ اور ہمایوں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے جوش کو دیکھا تھا۔

☆......☆......☆

انہوں نے خولہ کو ڈھونڈنا چاہا تو حسبِ توقع وہ انہیں لان میں، جھولے پہ بیٹھی ملی تھی۔ بے ترتیب سا حلیہ......لاپروائی سے گلے میں ڈالا ہوا دوپٹہ......ناک، کان خالی اور کلائیاں بھی سونی......بے ساختہ فرخندہ نے اک گہرا سانس لیا۔

''خولہ......!'' انہوں نے پیار سے پکارا۔

''پھپھو......!'' اور وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔ فرخندہ چھوٹے چھوٹے قدم لیتی اس تک آئی تھیں۔

''ایسے کیوں بیٹھی ہو بچے......؟'' پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انہوں نے پوچھا تھا۔

''بس......ایسے ہی دل گھبرا رہا تھا۔'' اس نے جھکے سر کے ساتھ جواب دیا۔

''جب سے جہانگیر گیا ہے......یوں ہی خالی خالی سی بولائی پھرتی ہو......ناک، کان بھی خالی کر چھوڑے ہیں......یوں نہ رہا کرو بچے......میرے دل کو ہاتھ پڑتا ہے۔'' وہ اب اس کے ساتھ بیٹھیں، اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولی تھیں۔

''بس پھپھو......دل ہی نہیں کرتا......'' اور پھپھو نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''آج تمہاری کوئی اولاد ہوتی......کوئی بچہ ہوتا تو اتنی اداس نہ ہوتی تم......میں نے یہ سوچ کر تم میاں بیوی کے اس معاملے میں دخل اندازی نہیں کی کہ ماشاء اللہ سے دونوں پڑھے لکھے ہو، سمجھدار ہو......خود ہی اس بارے میں سوچو گے......لیکن تم دونوں کو تو لگتا ہے

http://kitaabghar.com

پیسہ کمانے کے علاوہ دوسرا کوئی خیال ہی نہیں......"

اور خولہ......وہ تڑپ کر رہ گئی تھی اس الزام پہ......

"پھپھو......!" اس نے شدید احتجاج کیا۔

"پیسہ کمانا میرا نہیں......آپ کے بیٹے کا شوق ہے اور مجھے بھی اس دوڑ میں اسی نے گھسیٹ رکھا ہے اور آپ کو پتا ہے......پتا ہے کیا پھپھو......! کہ وہ......آپ کا لاڈلا......وہ اولاد نہیں چاہتا......وہ چاہتا ہے کہ پہلے وہ ڈھیر سارا روپیہ کما لے، بینک بیلنس بنا لے، بنگلہ، گاڑی خرید لے......ہاں پھر وہ سوچے گا فیملی کے بارے میں۔" وہ پھٹ ہی تو پڑی تھی۔ فرخندہ شاکڈ ہو کر اسے دیکھ رہی تھیں اور اس کے گالوں پہ آنسو بہتے چلے جا رہے تھے۔

"یہ میری چوائس نہیں تھی پھپھو......" آواز اب کے زکام زدہ سی تھی۔

"یہ اس کی چوائس تھی اور اب......اب معلوم ہے آپ کو وہ کیا سوچے بیٹھا ہے......اسے جرمن نیشنلٹی لینی ہے......" خولہ نے اِک اور دھما کا کیا اور فرخندہ کھلے منہ کے ساتھ اسے تکتی رہ گئی تھیں۔

"تم نے مجھے کیوں نہ بتایا......کیوں خولہ......؟ میں کرتی جہانگیر سے بات......اسے سمجھاتی......"

"اور وہ جیسے آپ کی بات سمجھ لیتا نا......یوں جیسے آج تک وہ آپ کی یا میری باتیں ہی تو سمجھتا آیا ہے۔" خولہ نے ہونہہ کے سے انداز میں کہا تھا اور فرخندہ یکلخت چپ ہوئی تھیں۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی......اور ابھی جو نیشنلٹی کا شوشہ چھوڑا تھا نا اس نے......وہ جانتی تھیں کہ وہ یہ بھی کر کے ہی رہے گا۔ بے اختیار انہوں نے خولہ کو ساتھ لگایا، اس کا سر چوما اور خولہ کے گرم گرم آنسو اس کے گال بھگوتے چلے جاتے تھے۔

☆......☆......☆

"آپی......! آج ہم نکل رہے ہیں۔ آپ ملنے نہیں آئیں گی؟" خولہ نے مزنہ کی بات سن کر بے اختیار ماتھا ملا تھا۔ وہ اسکول سے آئی ہی تھی کہ مزنہ کی کال آ گئی۔

"مزنہ......پلیز......! ویری سوری یار......میں بے حد تھکی ہوئی ہوں اور طبیعت بھی ٹھیک نہیں......ابو اور پھپھو آ جاتے ہیں۔ میں نہیں آ پاؤں گی......" وہ واقعی میں جانا نہ چاہتی تھی۔

"آپی......!" مزنہ کی آواز میں خفگی سی جھلکتی تھی۔

"مزنہ پلیز......! میرے سے ہلا بھی نہیں جا رہا۔"

"تو میں آ جاؤں......ہمایوں کے ساتھ......؟"

"اوہ کم آن مزنہ......! اچھا نہیں لگتا نا......اس طرح سے روز روز تمہارا ملنے آنا......میں ابو اور پھپھو کو بھیج رہی ہوں......او کے......؟"

''او کے......!'' وہ راضی تو ہو گئی تھی پر دل سے راضی نہ لگتی تھی۔

''اچھا اپنا خیال رکھنا اور ہوٹل پہنچتے ہی مجھے اطلاع کرنا۔''

''جی اچھا......!'' انداز لٹکا ہوا تھا۔

''اچھا اب یوں مت بولو......! ہنسی خوشی جاؤ۔''

''او کے اللہ حافظ......!''

''اللہ حافظ......!'' خولہ نے دھیرج سے کہا اور رابطہ منقطع ہو گیا۔

''آپی نہیں آ رہی ہیں......ابو اور پھپھو آئیں گے۔'' فون کاٹ کر اس نے ہمایوں کو اطلاع پہنچائی تھی اور ہمایوں......اس نے سر ہلایا اور دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈالتے ہوئے وہ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا کہ یہاں سرما کی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے ماتھے پہ بل تھے اور وہ دور خلاؤں میں کچھ کھوجتا ہوا محسوس ہوتا تھا......شاید کہ اپنا آپ......

☆......☆......☆

''جہانگیر......! تم جرمن نیشنلٹی لینا چاہتے ہو......؟'' اور جہانگیر ماں کے منہ سے یہ سن کر سکتے میں آ گیا۔

''واٹ دا ہیل اِز دِس......شٹ......بُل شٹ......'' وہ بے آواز بڑبڑایا......اور ایک مکّا دروازے پہ دے مارا تھا۔

''میں نے کچھ پوچھا ہے جہانگیر......!'' فرخندہ سختی سے بولیں۔ جہانگیر چند لمحے جبڑے بھینچے کھولتا رہا اور پھر بولا......

''جی امّی......! ایسا ہی ہے۔''

''اور بوڑھی ماں کا کیا کرو گے......؟ کیا بھائی نے ٹھیکہ لے رکھا ہے اس کا کہ پہلے بہن کی اولاد کو پال پوس کر جوان کرے اور پھر بعد میں بہن کو سنبھالتا پھرے......باوجود توانا اولاد ہونے کے......اُسے کیا کالے پانی کی سزا ہے......؟ اور خولہ......اس سے کس چیز کا بدلہ لے رہے ہو تم......؟ بیوی ہے تمہاری وہ......''

''تو ماں اور بیوی کے لیے ہی کر رہا ہوں سب......مجھے یہ سب کچھ قبر میں تو نہیں لے کر جانا......'' وہ بھی تنک کر بولا تھا۔

''بکواس مت کرو......'' فرخندہ نے تڑپ کر کہا تھا۔

''ہمیں نہیں چاہیے اتنا اور ایسا پیسہ جو ہم سے تم کو دور لے جائے۔ دو وقت کی روٹی مل رہی تھی نا یہاں کہ نہیں......؟''

''یہ ہی تو مسئلہ ہے امی......! کہ مجھے محض دو وقت کی روٹی نہیں چاہیے......اور پلیز......پلیز......مجھے پریشان مت کریں۔'' اور یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا تھا۔ حسبِ معمول فرخندہ اسے کچھ نہ کہہ سکی تھیں۔

☆......☆......☆

http://kitaabghar.com

''اپنا واٹس ایپ چیک کریں آپی......!'' اسے مزنہ کی چہکتی آواز سنائی دی تھی......اور کال منقطع ہو گئی۔

خولہ نے یوں سر ہلایا جیسے کہتی ہو۔''اس لڑکی کا کچھ نہیں کیا جا سکتا۔''

اتنی تصاویر اور سیلفیز اسے واٹس ایپ کرتی تھی کہ اگر انہیں مرتب کر کے ایک البم بنایا جاتا تو بجا طور پر تصویری سفر نامہ کہلاتا۔ کہاں وہ رکے......کہاں کھانا کھایا......کہاں چائے پی......کہاں وہ محض منظر دیکھنے کے لیے ٹھہرے......میرے خدا......!وہ سب وقتاً فوقتاً اسے تصاویر کی شکل میں پتا چلتا رہتا تھا۔خولہ نے بیشتر تصاویر دیکھی ہی نہیں تھیں۔ چیک کر کے ڈیلیٹ کر دی تھیں۔ ابھی بھی معلوم نہیں کیا بھیجا تھا اس نے......خولہ نے واٹس ایپ کھولا تو ایک ویڈیو موصول ہوئی۔اس نے ویڈیو پہ ٹیپ کیا۔ چند لمحے لگے ویڈیو کو ڈاؤن لوڈ ہونے میں اور پھر وہ چلنے لگی۔

''چیک دِس آؤٹ......!'' مزنہ کی شکل دکھائی دی۔ وہ سرگوشی میں بولتی تھی۔خولہ نے جانا کہ وہ کوئی خوبصورت، دل فریب منظر ہوگا جو وہ اسے دکھانا چاہ رہی تھی......لیکن نہیں......ویڈیو میں مزنہ چلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ساتھ میں پانی کے زور و شور سے بہنے کی آواز تھی اور پھر مزنہ رک گئی۔خولہ مکمل طور پہ فون کی طرف متوجہ نہ تھی......وہ ساتھ ساتھ کچن میں کام کر رہی تھی اور فون شیلف پہ دیوار کے ساتھ کھڑا رکھا ہوا تھا......اچانک وہ ٹھہر سی گئی......اور اس نے حیرت سے مڑ کر فون کی طرف دیکھا......اور حیرت دوچند ہوئی۔ وہ اک گٹار کے پلے کیے جانے کی آواز تھی......وہ دو قدم قریب آئی......فون کی طرف غور سے دیکھا اور......

تیری رسوائیوں سے ڈرتا ہوں
جب ترے شہر سے گزرتا ہوں

دفعتاً اس کے پیٹ میں گھونسا پڑا۔ وہ ہمایوں تھا......وہ ہمایوں کے علاوہ اور بھلا کون ہو سکتا تھا۔

حال دل بھی نہ کہہ سکا گرچہ
تو رہی مدتوں قریب مرے
تو مجھے چھوڑ کے چلی بھی گئی
خیر قسمت مری نصیب مرے

آواز خوبصورت اتنی نہ تھی......جتنا آواز کا سوز، درد میں ڈوبا لہجہ اسے خوبصورت بنا رہا تھا......پُر تاثیر کر رہا تھا۔

گو زمانہ تری محبت کا
ایک بھولی ہوئی کہانی ہے
کس تمنا سے تجھ کو چاہا تھا

http://kitaabghar.com

کس محبت سے ہار مانی ہے

اور اس میں اتنی ہمت نہ بچی کہ ہاتھ بڑھا کر اس ویڈیو کو بند کر دیتی......

اشک پلکوں پہ آ نہیں سکتے

دل میں ہے تیری آبرو اب بھی

خولہ نے بے ساختہ ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچی تھیں۔

تجھ سے روشن ہے کائنات مری

ترے جلوے ہیں چار سو اب بھی

اس آواز میں چھپی تکلیف کو، گھاؤ کو، صرف وہ جان سکتی تھی......صرف وہ......

اب بھی میں تجھ کو پیار کرتا ہوں

جب ترے شہر سے گزرتا ہوں

اور اس کے ساتھ ہی تالیوں کی آواز گونجی۔ اور پھر خموشی چھاتی چلی گئی۔ وہاں اب کوئی آواز نہ تھی......کوئی حرکت بھی نہ تھی...... کتنے ہی لمحے وہ بے جان جسم لیے کھڑی رہی۔

''مجھ سے انجانے میں بہت بڑی غلطی ہو گئی......بڑی زیادتی ہو گئی...... وہ کسی بھی X,Y,Z سے شادی کر لیتا مگر کم از کم وہ مزنہ نہ ہوتی......مزنہ تو نہ ہوتی......محبت کا قصور میرا نہیں......اس کا ہے۔ میں انوالو بھی نہیں مگر پھر بھی......پھر بھی اسے اس محبت کی سب سے بڑی سزا بھی میں نے ہی دی......میں نے ہی......یا میرے خدا......! یہ کیا ہو گیا......کیا......؟ مجھ سے یہ کیا ہو گیا......'' اور اس نے شیلف کو مضبوطی سے پکڑا۔

ہمایوں کے ساتھ تو جو قسمت نے کیا......وہ برا ہوا......مگر جو اس نے کیا......وہ بدتر تھا......بلاشبہ وہ بدتر تھا۔ اسے یہ رسک نہیں لینا چاہیے تھا......ہرگز بھی نہیں......اور وہ بھی محض اس بھروسے پہ کہ وہ ''وقتی جذبہ'' تھا......وقتی جذبہ......

☆......☆......☆

گھر والوں کی بھرپور مخالفت سامنے آئی تھی......جرمن نیشنلٹی کے معاملے میں......گھر والوں کے ردِعمل نے اسے مجبور کیا کہ وہ فی الحال اس بارے میں بات نہ کرے اور ایسے کسی بھی معاملے میں ہاتھ نہ ڈالے......وہ سکون سے تعلیم مکمل کرے......پھر دیکھے گا......ابھی پورے دو سال تھے اس کے پاس......سوچنے، سمجھنے اور پھر فیصلہ لینے کے لیے......وہ جرمن زبان کا بنیادی کورس پاکستان سے کر کے آیا تھا۔ یہاں پہ آ کر اس کے آگے levels کلیئر کرنے تھے اسے......جاب ڈھونڈنی تھی تاکہ وہ کم از کم اپنا خرچہ اٹھا سکے۔ پیچھے کی اتنی فکر نہ تھی کہ

خولہ کی جاب بھی تھی اور ویسے بھی اب وہ ماموں کے ہاں ہی رہائش پذیر تھی۔سو اس جھنجھٹ کو پالنے کا وقت تھا نہ ہی گنجائش......اسے تعلیم اچھے طریقے سے مکمل کرنی تھی فی الحال......لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہ تھا کہ وہ اس بارے میں نہیں سوچے گا یا پھر اس مخالفت سے پیچھے ہٹ جائے گا۔وہ جس بات کی ٹھان لیتا تھا......وہ کر کے رہتا تھا......اس کے خاموش ہونے پہ فرخندہ نے سکھ کا سانس لیا تھا مگر خولہ......وہ جانتی تھی کہ جہانگیر یہ بات دوبارہ کرے گا اور ضرور کرے گا۔

☆......☆......☆

چائے تیار تھی......ٹرالی بھی سیٹ تھی مگر وہ تذبذب کا شکار وہاں کھڑی ناخن چبا رہی تھی۔مزنہ واپس آ چکی تھی اور ابھی سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔وہ مزنہ کو وہاں سے بلا نہ سکتی تھی۔اس نے بے بسی سے آنکھیں بند کیں۔لاچاری چہرے سے ٹپکی پڑی تھی۔اک سانس بھر کر خود کو کمپوز کیا اور ٹرالی لے کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی تھی۔

''السلام علیکم......!''سلام کرتے ہوئے وہ میز پر لوازمات رکھنے لگی......ہمایوں نے ریفلکس ایکشن کے طور پر سر اٹھایا۔

''وعلیکم السلام......!''سنجیدہ سے انداز میں کہہ کر وہ پھر سے احمد صاحب سے باتوں میں مشغول ہو گیا تھا۔

''آپ کہاں جا رہی ہیں؟''اسے پلٹتے دیکھ کر مزنہ نے حیرانی سے پوچھا۔

''وہ میں......''

''بہن آئی ہے خولہ......!کام تو ہوتے ہی رہیں گے......''بات فرخندہ نے کاٹی تھی اور مزنہ نے خفگی سے آگے سے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے اسے اپنے پاس صوفے پہ بٹھایا تھا۔وہ سب کے لیے تحائف لائی تھی۔وہیں پہ اسے کھول کھول کر دکھانے لگی۔

''مزنہ......!چلیں؟''ہمایوں کے کہنے پر مزنہ نے آنکھیں پھیلائیں۔

''ابھی......اتنی جلدی؟''اس نے منہ بسورا۔

''ہمایوں......!ابھی تو آئے ہو......کھانا کھا کر جانا......''فرخندہ نے کہا۔

''نہیں آنٹی......پھر کبھی سہی......''اس نے شائستگی سے انکار کیا اور اس سارے میں خولہ تھی جو اصل وجہ سے آگاہ تھی۔اس نے مزنہ کی طرف دیکھا۔

''سنو......!اندر چلتے ہیں......یہاں کیا پھیلاوہ بکھیرتی ہو۔مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔''وہ اس کے کان میں بولی تھی۔

''یہ صحیح ہے۔''مزنہ بھی راضی ہوئی......اور وہ دونوں،دونوں ہاتھوں میں گفٹس سنبھالتے ہوئے،باتیں کرتے ہوئے وہاں سے چلی گئی تھیں۔کمرے میں پہنچتے ہی مزنہ نے ساری چیزیں بیڈ پہ ڈھیر کیں۔

''یہ دیکھیں کتنی......''

http://kitaabghar.com

''اسے چھوڑو...... یہ تو میں دیکھ ہی لوں گی...... مجھے یہ بتاؤ کتنا انجوائے کیا تم نے......؟'' وہ اس کے ہاتھ میں کھلی شال پکڑ کر ایک طرف کرتے ہوئے بولی......مزنہ مسکرائی۔

''بہت......اف اتنے حسین علاقے......اتنے کہ بعض اوقات یوں محسوس ہوتا تھا یہ جگہ زمین پہ ہے ہی نہیں......کوئی اور دنیا ہے آپی......!'' وہ اس کی گود میں سر رکھتے ہوئے بولی۔خولہ پیار سے اس کے بال سہلا رہی تھی......اور مزنہ......وہ اسے دنیا جہان کے قصے سناتی رہی......جن کا آغاز بھی ہمایوں تھا اور انجام بھی ہمایوں......خولہ کا دل چاہا کہ اس سے پوچھے کہ ''گلواسنفنگ'' کی وجہ سے جو ادویات ڈاکٹر نے اسے تجویز کی تھیں کیا وہ لے رہی ہے یا نہیں......مگر وہ اتنی خوش تھی اور بالکل نارمل لگتی تھی سو اس نے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔

''مزنہ......!ہمایوں بلا رہا ہے......'' فرخندہ نے آ کر کہا تو وہ یک دم اٹھ گئی۔

''سدا خوش رہو......!'' ان دونوں کو جاتے دیکھ کر اس نے دل سے دعا دی تھی۔

☆......☆......☆

''آپ کسی اچھے سے ڈاکٹر سے appointment لیں ہمایوں......پلیز......!'' وہ بے حد پریشانی سے بول رہی تھی۔ہمایوں نے اس بات پہ گہرا سانس بھر کر اسے دیکھا۔

''مزنہ......!کیا ہو گیا ہے یار......؟کسی نے کچھ کہا ہے......؟''

''نہیں......کسی نے کچھ نہیں کہا مگر کیا میں نہیں جانتی ہمایوں......!آپ اکلوتے بیٹے ہیں اور آنٹی کو کس قدر ارمان ہو گا نا آپ کی اولاد کا......'' وہ اب دونوں ہاتھ مسلتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''وہ تو ٹھیک بات ہے مگر اس میں اتنا پریشان ہونے والی کیا بات ہے......جسٹ ریلیکس......ریلیکس یار......!''

''آپ پلیز کسی اچھی سی گائنا کالوجسٹ سے ٹائم لیں......''

''میں نہیں لے رہا ٹائم وائم......اللہ کرم کرے گا......خوامخواہ میں تم پریشان ہو رہی ہو...... بلاوجہ ہی ٹینس ہو۔''

''ہمایوں......!'' اس نے بے بسی سے پاؤں پٹخا۔

اور جواباً ہمایوں نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کر دیا تھا۔

''یہ طے تھا کہ وہ اسے کسی بھی ڈاکٹر کے پاس ابھی لے کر جانے والا نہیں تھا۔

☆......☆......☆

ایک سال بعد......

آفس میں ملگجا سا اندھیرا تھا۔زیادہ تر ورکرز جا چکے تھے۔وہ کرسی کی پشت پہ سر ٹکائے چھت کو دیکھ رہا تھا۔اس کے دونوں ہاتھوں

http://kitaabghar.com

میں ایک قلم تھا جس کا کیپ وہ اضطراری انداز میں بند اور کھول رہا تھا۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر چھوڑی تھی......آستینیں اوپر چڑھا رکھی تھیں اور وہ چپ اور سنجیدہ دکھتا تھا۔ ایسے میں کمرے میں اِک روشنی سی چمکی۔ سامنے میز پہ دھرے سیل فون نے بلنک کیا تھا۔ اِک پیغام آیا تھا۔ وہ چونکا......نہ متوجہ ہوا۔ وہ اسی ایک پوزیشن میں بیٹھا رہا۔ دیکھے بنا وہ جانتا تھا کہ وہ پیغام مزنہ کی طرف سے تھا۔ پیغام کیا......یاددہانی تھی کہ اسے آفس سے واپسی پہ رپورٹس collect کرنی تھیں اور یہ غالباً صبح کا کوئی پانچواں پیغام تھا۔ مزنہ اس معاملے میں پریشان تھی اور اس کی پریشانی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ ہمایوں جانتا تھا اور سمجھتا بھی تھا۔

"سر......!" دروازے پر دستک ہوئی۔

"ہوں......"

"سر! فرّخ آپ کا منتظر ہے......"

"ہاں......ہاں بھیجوا سے......" اور وہ جیسے کسی خواب سے جاگا تھا۔

☆......☆......☆

"میری رپورٹس......؟" اور اس نے مزنہ کو داخلی دروازے پر ہی منتظر پایا۔ وہ دو قدم قریب آیا......اس کے پریشانی چھلکاتے چہرے کو دیکھا اور ہمایوں کے حلق سے کچھ نیچے اترتا دکھائی دیا۔ پھر اس نے بے حد پیار سے مزنہ کے چہرے کو چھوا اور پھر ہاتھ میں پکڑی رپورٹس اسے پکڑائی تھیں۔

"سب ٹھیک ہے نا......؟" وہ گھبراہٹ میں کانپتے ہاتھوں سے تیزی سے اینویلپ کھولتی کبھی ہمایوں کو دیکھتی اور کبھی اینویلپ کو......

اور ہمایوں......وہ بس اسے دیکھتا تھا......بنا پلک جھپکے......

"ٹھیک ہے نا ہمایوں......؟" اور وہ اب لرزتے ہاتھوں سے تہہ شدہ کاغذ کھولتی تھی۔ اینویلپ اس کے پیروں کے پاس جا گرا......اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

ہمایوں جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے سر جھکائے پیچھے کو ہٹا......اور پھر سے اسے تکنے لگا......مزنہ کی سانس بے ترتیب تھی اور اس کی نظریں تیزی کے ساتھ رپورٹ پہ دوڑ رہی تھیں۔

"اوہ......اوہ......میرے خدا......میرے خدا......تیرا شکر ہے......!" اور وہ بے دم سی ہو کر چوکھٹ سے ٹکرائی۔

"شکر ہے......یا اللہ! تیرا شکر ہے......" اور مزنہ کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے تھے۔

ہمایوں اس کے پاس سے ہو کر گزرا......ذرا کی دیر کو ٹھہرا......اور پھر اس کا کندھا تھپتھپا کر آگے بڑھ گیا تھا۔

''آنٹی......آپا......تبسم آپا......!'' اور مزنہ خوشی سے بے حال ہوتے ہوئے زہرہ اور تبسم کو آوازیں دیتی ہوئی بھاگی تھی۔

☆......☆......☆

ایک اور سال گزرا تو......تو اس سال میں کچھ بھی نیا نہ تھا۔ وہ ہی زندگی......وہ ہی لگی بندھی روٹین......صبح سے شام اور شام سے پھر صبح میں بدلتے دن......کسی کی زندگی میں بھی بدلاؤ نہ آیا تھا۔ زندگی اِک بار پھر سے رک سی گئی تھی۔ ہاں مزنہ......وہ دن بدن پریشان سے پریشان تر ہوتی جارہی تھی۔ جب سب نارمل تھا تو پھر خدا ان پہ مہربان کیوں نہ ہوتا تھا۔ ہمایوں اسے لندن تک لے کر گیا تھا......ہاں! البتہ وہ اسے پاکستان میں کسی بھی ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتا تھا، نہ لے کر جانے دیتا تھا۔ وہ الٹی سیدھی دوائیوں اور ٹریٹمنٹس کے حق میں نہ تھا اور مزنہ......وہ ایک بار پھر اپنی عادت کے مطابق اس چیز کو سر پہ سوار کر رہی تھی۔ وہ اِن سیکیور محسوس کرتی تھی۔ اسے محسوس ہوتا تھا جیسے تبسم اور زہرہ اس سے بیزار ہیں۔ وہ دونوں جلد ہی ہمایوں کی دوسری شادی کے بارے میں کہہ دیں گی اور اسی طرح کے کئی دوسرے خدشات......

ہمایوں سمجھا سمجھا کر عاجز آجاتا مگر وہ سمجھ کر نہ دیتی تھی اور یہ حالت......یہ حالت خولہ سے چھپی تو نہ تھی۔ مزنہ اک اک بات اس سے شیئر کرتی تھی۔ مشورہ مانگتی تھی اور خولہ کو مجبور کرتی کہ وہ ہمایوں کو بتائے بنا اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جائے مگر خولہ......وہ اب تو ایسا کوئی کام نہ کرتی جس سے ہمایوں کو تکلیف پہنچتی......اور پھر سے اسی کے ہاتھوں سے......نہ......وہ ایسا تو نہ کرتی......جب وہ لندن تک معائنہ کرا آئی تھی......سب ٹھیک تھا......بس خدا کی طرف سے دیر تھی تو وہ کیوں جلد بازی کا مظاہرہ کرتی......وہ کبھی مزنہ کو ڈانٹ دیتی، کبھی پیار سے سمجھاتی اور کبھی وہ بھی عاجز آجاتی تھی۔

حالات شاید ایسے ہی رہتے اور زندگی یوں ہی چلتی رہتی کہ ایک دن اس کے نمبر پہ ہمایوں کا پیغام موصول ہوا تھا۔ وہ جی بھر کر حیران ہوئی اور پھر پیغام کو پڑھتے ہی پریشان بھی ہوگئی۔

''مزنہ سلیپنگ پلز لیتی رہی ہے؟''

اور اس پیغام کو پڑھتے ہی خولہ کا سانس رک سا گیا۔ اسے سمجھ نہ آیا کہ کیا جواب دے......سچ یا جھوٹ یا پھر کوئی درمیانی راستہ......

''کیوں پوچھ رہے ہیں آپ......؟ خیریت......؟'' جوابی پیغام بھیجا گیا۔

''Yes or No?'' اتنا قطعی انداز......خولہ ہونٹ بھینچ کر رہ گئی اور پھر لکھا......

''جی......!''

''کیوں......؟'' نیا سوال پیغام کی صورت آیا اور اب کے خولہ کے حلق سے نیچے کچھ اترتا ہوا دکھائی دیا۔ تو کیا وہ ہمایوں کو بتا دے کہ مزنہ ایڈکٹ رہی ہے......یا پھر اسے اندھیرے میں ہی رکھے......معلوم نہیں کیا بات ہے جو ہمایوں اس سے پوچھ رہا ہے۔ خولہ کا دل گھبرایا۔

''مزنہ ٹھیک ہے......؟''اسی گھبراہٹ میں پوچھا گیا۔

''جی......!''

''اور پلیز میرے سوال کا جواب دیں۔''

ہا......کون کہتا ہے کہ برقی پیغام سے کسی کے موڈ، انداز اور ٹون کا پتا نہیں چلتا......اس جواب پہ خولہ کا منہ سرخ ہوا تھا۔اسے کون سا شوق تھا ہمایوں سے باتیں بگھارنے کا......

''شادی ٹوٹنے کی وجہ سے وہ ڈپریشن میں چلی گئی تھی......اسی وجہ سے لیتی رہی پلز......''

خولہ نے ٹھک ٹھک ٹائپ کیا اور سینڈ کا بٹن یوں دبایا کہ جیسے جواب اس کے منہ پہ دے مارا ہو۔وہ چاہ کر بھی ہمایوں کو مزنہ کی ''گلواسنفنگ'' کے بارے میں نہ بتا سکی تھی اور ہمایوں وہ یہ سب اس لیے پوچھتا تھا کہ مزنہ ایک بار پھر سے ڈیپ ڈپریشن میں جا رہی تھی۔

☆......☆......☆

''مسز جہانگیر......! آپ نے خود کو بہت محدود کر لیا ہے۔زندگی اب ایسی بھی پھیکی نہیں......''بہت عرصے بعد یوں وقت ملا تھا آمنے سامنے بیٹھنے کا......وہ مس مفتی کے اس سوال پر مسکرائی تھی۔

''ابو اور پھپو......دونوں کی ہی صحت کے مسائل ہیں......اور پھر گھر کو بھی میں نے ہی دیکھنا ہوتا ہے......وقت ملتا ہی نہیں......''

''وقت تو ہمیشہ نکالنا پڑتا ہے مسز جہانگیر......!احمد انکل تو چکر لگاتے رہتے ہیں......آپ بھی کبھی آ جایا کریں......اسی بہانے تھوڑی فریش ہو لیا کریں گی......مزنہ کے لیے ہی سہی......''

''کوشش کروں گی......''وہ اب کے پھیکا سا مسکرائی۔

''اور یہ کوشش......کوشش ہی رہے گی۔میں بھلا کیا نہیں جانتی......''ان کے لہجے میں ناراضی تھی۔

''اس ویک اینڈ پہ بناتے ہیں کوئی پروگرام......آپ پہ رہا تو یہ کام پھر ہونے سے گیا......مجھے خود ہی کچھ کرنا پڑے گا......''وہ اب کے مشفق انداز میں کہہ رہی تھیں اور خولہ......اس نے اک تھکن بھری سانس بھری تھی......وہ ہمایوں سے بچتے بچتے......بھاگتے بھاگتے......قصوروار نہ ہونے کے باوجود سزا کاٹتے کاٹتے تھک چلی تھی۔ہاں!اب وہ تھک چکی تھی۔

☆......☆......☆

یہ رات کے کھانے کا منظر تھا۔سب اپنی اپنی پلیٹوں پہ جھکے کھانا کھانے میں مصروف نظر آتے تھے۔وہ ہی ڈائننگ روم کی میز کا مخصوص منظر......چمچ کانٹوں کی آواز......کھانے کی خوشبو اور چار نفوس کھانے میں مصروف......ایسے میں تبسم نے نظر اٹھائی اور ان سب کو دیکھا۔زندگی اتنی مصروف، اتنی پریکٹیکل ہو گئی تھی کہ کسی دوسرے کی زندگی میں جھانکنے تک کی فرصت نہ تھی اور چاہے یہ دوسرا کوئی عزیز ہی

http://kitaabghar.com

کیوں نہ ہو...... بے ساختہ ان کے ماتھے پہ بل پڑے تھے۔

''مزنہ......!'' بظاہر نارمل سا لہجہ......مزنہ نے چونک کر سر اٹھایا۔

''جی......!''

''کتنے دن ہو گئے بہن سے ملے ہوئے......؟'' اور اس سوال پہ سب نے تبسم کو اور پھر مزنہ کو دیکھا اور مزنہ......وہ اس سوال پہ حیران ہوئی اور پھر بولی۔

''معلوم نہیں......شاید دو تین ہفتے......''

''اور آپ ہمایوں صاحب......! آپ نے کب آخری دفعہ سسر صاحب کو اپنی شکل دکھائی تھی......ان کی خیریت دریافت کی تھی......؟'' لہجے میں اب کے طنز جھلکنے لگا تھا۔ ہمایوں کا تیزی سے چلتا منہ بے ساختہ سست ہوا۔ اس نے بے اختیار ہی گلا کھنکھارا تھا۔

''یاد نہیں......'' وہ پھنسی پھنسی سی آواز میں بولا۔ آپی کے تیور ہی ایسے تھے۔ تبسم نے تپ کر چمچ پلیٹ میں پٹخا تھا۔

''اچھے داماد ملے احمد انکل کو......ایک جرمنی میں فیوچر بنا رہا ہے اور دوسرا یہاں بیٹھ کر پیسے بنا رہا ہے اور بہن محترمہ! انہیں اپنے غموں سے ہی فرصت نہیں۔ اس کا حال دیکھو کوئی جا کر......سنجیدہ تو پہلے ہی تھی اب تو لگتا ہے لفظ گن گن کر بولتی ہے۔ کتنا بوجھ ہے اس پر اور مزنہ......کیا یہ سب اسی کی ذمہ داری ہے......؟ تمہارا کوئی فرض نہیں ہے کیا......؟ سارا گھر سمیت دو عمر رسیدہ وجودوں کے اسی کے سر پر ہے۔ بلوں سے لے کر ان کی دوائیوں تک......وہ سب خود کرتی ہے اور اوپر سے وہ کوئی ہاؤس وائف نہیں ہے۔ تمہیں کبھی خیال آیا کہ اور کچھ نہ سہی، باپ کی دوائیاں ہی ہمایوں سے کہہ کر منگوا دو اور ہمایوں تم......تم خود نہیں جا سکتے تو کسی ملازم کو بھیج کر ہی ان کے گھر کے باہر کے کام کروا سکتے ہو۔ وہ اکیلی عورت اور اتنی ذمہ داریاں......لیکن نہیں......ہمیں کیا احساس......؟ ہم اپنے آرام دہ بستر پر لیٹ کر اپنے غموں کو کھلاتے رہتے ہیں اور اس میں مَیں بھی شامل ہوں جسے آج اس کی بے رونق، بیمار زدہ شکل دیکھ کر تم دونوں کو لیکچر دینا یاد آ گیا......'' مزنہ جو شرمندہ ہوئی سو ہوئی......ہمایوں پہ تو منوں مٹی آ گری تھی۔ وہ مرد تھا......وہ کر سکتا تھا......مگر پھر بھی یوں اور ایسا غافل رہا......تف ہے......

''کبھی خیر خبر لینے چلے جایا کرو ان تینوں کی تم دونوں......اس کا بھی کوئی زندگی پہ حق ہے یا نہیں......کہیں نکلتی نہیں......یہاں تک آتی نہیں ہے وہ......''

''جی آپی......! آج ہی جاتے ہیں۔'' یہ مزنہ تھی۔

''کوئی ضرورت نہیں......میں کل ان تینوں کو ڈنر پہ انوائٹ کر رہی ہوں۔'' اور تبسم نے بے حد بگڑے موڈ کے ساتھ مزنہ کی بات کاٹی تھی۔ وہ اک بار پھر شرمندہ ہوئی تھی۔ وہ بہن ہو کر خیال نہ کر سکی اور تبسم......

☆......☆......☆

''تم برسلز میں کیا کر رہے ہو......؟'' وہ حیران ہوئی۔

''ہاں! وہ......بس ایک جاب انٹرویو کے لیے آیا تھا۔'' وہ ذرا سا گڑبڑایا اور پھر روانی سے بولا۔

''تمہارا اسٹڈی ویزا ختم نہیں ہو گیا......؟''

''یار......! کب کوئی......''

''جہانگیر! مگر میرے حساب سے تو......''

''یار خولہ......! کیا تم نے سوالات پہ سوالات کی یلغار کر رکھی ہے۔ ایک ہے کہ بات ہوتی نہیں......اور جب ہو تو لڑائی یا پھر تمہارا ایسا سڑا ہوا موڈ......'' وہ بے زار ہوا اور خولہ خاموش......اور پھر اس کی اک گہری سانس سنائی دی تھی۔ اس کے ذہن میں اور بھی سوالات جنم لے رہے تھے مگر اب کی بار وہ خاموش رہی اور اس کی باتوں کا جواب دیتی رہی......تحمل سے اور خوش مزاجی سے......

''میں تمہیں بہت مِس کر رہا ہوں......خولہ......بہت......'' اور خولہ اس جملے پہ ساکت سی ہو گئی۔

''مجھے معلوم ہے کہ تم یقین نہیں کرو گی......مگر خولہ......یہ سچ ہے......تم پرانی تلخیاں بھلا کیوں نہیں دیتیں......؟ ایک دفعہ اس بات پہ اعتبار کر کے تو دیکھو......'' وہ زچ ہوا تھا۔ خولہ نے بے اختیار ماتھا مسلا۔

''جہانگیر......! ہم اس موضوع پہ تب بات کریں گے، جب ہم آمنے سامنے ہوں گے۔ ابھی اسے رہنے دو......چھوڑ دو......''

آواز مدھم، لہجہ نرم مگر انداز دوٹوک......تو اب سے اپنی بات کہنی آ ہی گئی تھی۔

''اوکے......!'' اور وہ ہار مانتے ہوئے بولا تھا۔

''کب آ رہے ہو واپس......؟''

''کل صبح کی فلائٹ سے......'' جہانگیر نے جواب دیا۔ وہ جرمنی واپس آنے کی بات کر رہا تھا۔

خولہ میں خوبیاں ہوں گی......بہت ہوں گی......مگر یہ اس کی سب سے بڑی خامی تھی......خامی کیا......فطرت تھی......وہ خود کو پہنچنے والی تکلیف کو یوں ہی تازہ رکھتی تھی کہ جیسے وہ ابھی ابھی......آج ہی اور اسی وقت پہنچی ہو......وہ بھول جانے والوں میں سے نہیں تھی۔ وہ خود اذیت پسند تھی یا نہیں......قطع نظر اس بحث کے وہ ایسی بن چکی تھی......اور یہ کمال وقت اور حالات نے انجام دیا تھا۔

☆......☆......☆

آج کل مزنہ نے عجیب ہی کام پکڑ رکھا تھا۔ ہربل نسخے اور ٹوٹکے ہر وقت یوٹیوب پہ سرچ کرتی رہتی اور نہ جانے کون کون سی الم غلم دوائیں بناتی رہتی تھی۔ ہمایوں اسے دیکھ رہا تھا، وقت دے رہا تھا مگر اب......اب یہ برداشت سے زیادہ تھا کیونکہ اب وہ اسے بھی ساتھ گھسیٹ رہی تھی۔

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا......؟'' کوئی عجیب سی پھکی اسے پھانکتے دیکھ کر وہ بری طرح سے تپا اور ہاتھ مار کر اس کے ہاتھ سے پھکی نیچے گرا دی تھی۔

''ہمایوں......!'' وہ شاکڈ ہوئی۔

''بس کردو مزنہ......فار گاڈ سیک......بس کردو......تم میں ذرا سا صبر بھی نہیں ہے۔''

''ہمایوں! میں ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتی اب......پتا نہیں کیوں آپ کو حالات کی سنگینی کا اندازہ ہی نہیں......آنٹی سوچتی ہوں گی کہ اس کی بڑی بہن کی اولاد نہیں......اس کی بھی نہیں ہو گی اور اس طرح سے وہ آپ کو فورس کریں گی کہ آپ دوسری شادی کر لیں......'' اور اس منطق پہ ہمایوں نے بے حد ضبط سے ہونٹ بھینچے تھے۔

''تم سے......آج تک......کسی نے کچھ کہا......؟ کوئی بات، کوئی جملہ، کوئی طعنہ......؟'' ٹھہر ٹھہر کر اور چبا چبا کر الفاظ ادا کیے گئے۔

''نہیں، مگر میں خود......''

''اسٹاپ اِٹ مزنہ......! اسٹاپ اِٹ یار! خود سے assume کرنا بند کر دو......تم خود بھی پاگل ہو جاؤ گی اور مجھے بھی کر دو گی اور یہ......'' اس نے رک کر سائیڈ ٹیبل کی دراز کھولی۔

''یہ کب سے استعمال کر رہی ہیں آپ......؟'' اور پھر نیند کی دوا اس کے سامنے بیڈ پہ پھینکی تھی اور مزنہ......اس کا رنگ فق ہوا تھا۔

''کیوں خود کو ذہنی مریض بنانے پر تلی ہوئی ہو......؟'' اب کے ہمایوں ذرا نرم پڑا۔ مزنہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ ہمایوں نے ''اف'' کے سے انداز میں آنکھیں میچیں اور پھر اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے۔

''دنیا میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو اولاد کی نعمت سے محروم ہیں......اللہ جس کو چاہے نواز دے اور جس کو چاہے نہ نوازے......یہ اس کی مرضی ہے۔''

''ہمایوں......!'' اور مزنہ نے تکلیف سے کہا۔

''اللہ کی طرف سے دیر ضرور ہے تو اب اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم بے اولاد ہی رہیں گے......یوں تو مت کہیں۔'' اور اس کے ساتھ ہی اس کی آواز بھرا سی گئی اور ایک دم ہمایوں پہ انکشاف ہوا کہ اسے سمجھانا دنیا کا ناممکن ترین کام تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور پھر روتی ہوئی مزنہ کو ساتھ لگا لیا۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا......'' اس کے سر کو ہلکے سے تھپتھپا کر اس نے کہا اور تسلی کے سے انداز میں اس کے شانے کے گرد بازو پھیلایا تھا۔ وہ اس کے کندھے کے ساتھ لگی رو رہی تھی۔ اور وہ چاہتا تھا کہ مزنہ اپنا سارا غبار نکال لے......کمرے کی واحد کھڑکی کے باہر اندھیرا اپنی صفت کے ساتھ پھیلا ہوا تھا۔ اور ایسا ہی اک اندھیرا ہمایوں کے اندر بھی پھیلتا چلا گیا تھا۔

☆......☆......☆

http://kitaabghar.com

22مارچ 2016

وہ اسٹاف روم میں بیٹھی کاپیاں چیک کر رہی تھی کہ تبھی اس کا فون بجنا شروع ہوا تھا۔پین روک کر وہ فون کی طرف متوجہ ہوئی اور پھر ''جہانگیر کالنگ'' کے الفاظ دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

اس وقت کال......جبکہ وہ جانتا بھی تھا کہ اس وقت وہ اسکول میں ہوتی ہے۔

''السلام علیکم......!جہانگیر خیریت......''اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''وعلیکم السلام......!ہاں بھئی خیریت ہی خیریت......''وہ ہشاش بشاش سا سنائی دیا۔

''اس وقت کال کی نا،تو میں گھبرا گئی تھی......''

''بس ایسے ہی برسلز ایئر پورٹ کے ڈیپارچر لاؤنج(Departure Lounge)میں بیٹھا ہوا تھا اور تم کل سے بہت یاد آ رہی ہو......''

اور اس ایک بات پہ خولہ کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔

''مذاق اچھے کرنے لگے ہو......''

''اوہ کم آن خولہ......!''وہ بدمزا ہوا۔

''کبھی تو رومینٹک ہو جایا کرو......''اور اس بات پہ خولہ کے ہونٹ بھنچ سے گئے۔

''اچھا تو تم وہاں فارغ بیٹھے انتظار کر رہے ہو......سو تمہیں رومینس سوجھ رہا ہے......میں مصروف ہوں،میرا پیریڈ اسٹارٹ ہونے والا ہے۔''

''اچھا......!''اس کا منہ لٹکا تھا۔

''اپنا خیال رکھنا......خدا حافظ......!''

''خدا حافظ......!''اور پھر اسی لٹکے ہوئے انداز میں اس نے کہا تھا۔خولہ نے سر جھٹک کر فون بند کیا تھا اور پھر وقت دیکھا......

''وہاں اس وقت آٹھ بجنے والے ہوں گے۔''اس نے اندازہ لگایا تھا۔

☆......☆......☆

وہ جب رکشے میں بیٹھ کر واپس جا رہی تھی تو سارے راستے......آج سارے راستے میں جہانگیر کا خیال اس کے ذہن سے چمٹا رہا تھا۔

''تم کل سے بہت یاد آ رہی ہو......''اور اس کے لب بے اختیار مسکرا اٹھے۔

http://kitaabghar.com

”تو جہانگیر صاحب......! آپ کو ہم یاد آنے ہی لگے......ہمارا خیال بالآخر آ ہی گیا آپ کو......مگر آیا بھی تو آیا کب......“

اور وہ سر جھٹک کر مسکرا دی۔

”چلیے دل بہلانے کا اک جواز ہمیں بھی مل گیا بالآخر کہ ہم بھی کسی گنتی میں آئے......“ اس کی آنکھوں میں شرارت سی چمکی تھی۔

”معلوم نہیں تم کب آؤ گے جہانگیر......! خدا قسم اب سکت نہ رہی......ہمت ختم ہو چلی......بس اب آ ہی جاؤ تو اچھا ہے۔“

تو اس ایک دن میں خولہ احمد نے جہانگیر اعجاز کو اتنا سوچ لیا کہ اتنا تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ آج وہ بڑی لمبی گفتگو کرے گی اس سے......لاشعوری طور پر اس کا موڈ خوشگوار تھا اور اسی خوشگوار موڈ کے ساتھ وہ گھر میں داخل ہوئی تھی۔ چینج کر کے اپنے لیے جب کھانا نکال کر وہ لاؤنج میں آئی تو ابا ٹی وی آن کیے بیٹھے تھے۔ کوئی ٹکر چل رہا تھا۔ اس نے سرسری سی نظر ڈالی اور......اور کھانے کی ٹرے اس کے ہاتھ سے نیچے جا گری تھی۔

22 مارچ 2016......07:58 صبح......برسلز ایئرپورٹ

☆......☆......☆

”خولہ......!“ احمد صاحب نے حیرانی سے کہا۔ وہ دونوں ہاتھ منہ پہ رکھے ساکت تھی یوں جیسے انہونی......نہیں......نہیں......

اسے جیسے ہوش آیا۔

”خولہ......! کیا ہوا......؟ کیا ہوا میرے بچے......؟“ اس کی سیکنڈز میں فق ہوتی رنگت کو دیکھ کر احمد صاحب بھی بوکھلائے تھے۔

مگر وہ سنتی نہ تھی۔ کیا کرے......کس سے کہے......ہاں......! جہانگیر......جہانگیر......کو......فون......

”ف......فو......ن......“ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ احمد صاحب نے پریشانی، مگر عجلت سے فون نکال کر اسے تھمایا تھا۔ اور جب اس نے فون پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو ہاتھ میں واضح لرزش تھی۔ وہ فون کو ٹھیک طرح سے پکڑ نہیں پا رہی تھی......گرفت نہیں کر پا رہی تھی۔ اس کی بصارت نے بھی جیسے اس کا ساتھ چھوڑا تھا۔ اسے جہانگیر کا نمبر فون بک میں سے نہیں مل رہا تھا اور اس نمبر کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ بار بار سر جھٹک کر، بصارت کو قائم رکھنے کی کوشش میں تھی۔

جہانگیر کا نمبر ملا......ہاتھ پھسل پھسل جاتے تھے مگر پھر بھی اس نے نمبر ملا ہی لیا تھا۔ دوسری طرف ٹیپ چل رہی تھی اور خولہ کی رہی سہی ہمت بھی دھڑام سے زمین بوس ہوئی تھی۔ بے اختیار وہ سر پہ ہاتھ رکھتے نیچے بیٹھتی چلی گئی۔

”خولہ......!“ احمد صاحب بے ساختہ اس کی طرف بڑھے۔

اب......اب کیا کرے......کس سے کہے......

”ہمایوں......!“

اور اک نام زور سے، کسی کڑکتی بجلی کی مانند ذہن میں آیا تھا۔اس نے ہمایوں کا نمبر ملایا......بیل جا رہی تھی مگر وہ اٹھا نہیں رہا تھا۔ اضطراری انداز میں اس نے پھر سے نمبر ملایا۔

''خولہ......! کیا ہوا ہے......بیٹے کچھ کہو تو سہی......''احمد صاحب اس کے سر پہ کھڑے پوچھتے تھے مگر وہ اب سے بہری تھی۔

''احمد انکل......''ہمایوں فون کو بجتے دیکھ کر حیران ہوا اور پھر جلدی سے کال ریسیو کی تھی۔

''ہمایوں......!''اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا......اس کی آواز سنائی دی اور وہ......بے اختیار......بے ساختہ......یک دم بیٹھے سے کھڑا ہو گیا......یوں جیسے اسے الہام ہوا ہو۔

''خولہ......!''لبوں نے بنا آواز حرکت کی اور وہ اب کچھ کہتی نہ تھی بس سانسوں کی مدہم سی،ٹوٹتی جڑتی سی آواز تھی۔

''خولہ......! کیا ہوا......؟''وہ پریشان ہوا۔

''ہمایوں......! آ جاؤ......پلیز......''اور فون اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا......اس نے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھاما تھا۔

''جہانگیر......جہانگیر......نہیں......یہ نہیں ہو سکتا......''گہرے گہرے سانس لیتی......وہ نا سمجھ آنے والے الفاظ میں بڑبڑائی تھی۔اس کی ساری حسیات نے جیسے اچانک ہی کام کرنا چھوڑا تھا۔

سماعت متاثر، بصارت متاثر اور زبان لکنت زدہ......

ہمایوں نے یوں فون کٹ جانے کی وجہ سے اک بار پھر فون ملایا......اس کے انداز میں پریشانی تھی۔فون کسی نے بھی نہیں اٹھایا۔ ہمایوں نے پھر عجلت میں گاڑی کی چابیاں اٹھائیں اور وہ باہر کو بھاگا تھا۔

''خولہ......خولہ......! میرے بچے کیا ہوا......؟''احمد صاحب اب اس کے چہرے کو تھپتھپا کر پوچھتے تھے،مگر وہ جواب دیتی تو دیتی کیسے......اس کی حسیات تو متاثر ہو چکیں......برسلز ایئرپورٹ پہ خودکش حملہ ہوا تھا۔

☆......☆......☆

''آپ لوگ میری بات کیوں نہیں سنتے......کیوں نہیں......چپ کیوں نہیں ہو جاتے......کیوں......؟''گردن کی رگیں کھنچی ہوئی......چہرہ سرخ......مٹھیاں بھنچی ہوئیں اور وہ پوری طاقت سے چیخ رہی تھی۔

''بند کریں رونا......سب بند کر دیں رونا......وہ ٹھیک ہے......اسے کچھ نہیں ہوا......کچھ نہیں......زخمی ہوا ہو گا......اسپتال میں ہو گا......اسی لیے رابطہ نہیں ہو رہا......اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ رونا کسی نحوست کی طرح پھیلا دو......''اس کی اونچی آواز بتدریج مدہم ہوتی گئی تھی۔

''وہ ٹھیک ہے......ٹھیک ہے......''اور وہ گھٹنوں کے بل، بے دم ہو کر بولتی زمین پہ گری تھی......سر پر جما دوپٹا کندھوں پہ آ گرا......

''آپی......!''مزنہ نے روتے ہوئے آگے بڑھ کر اسے کندھوں سے تھاما۔

http://kitaabghar.com

''نہیں کہو چپ ہو جائیں......مت روئیں......میرا دل بری طرح سے گھبراتا ہے......وہ کیسے مجھے چھوڑ سکتا ہے......کیسے مزنہ......؟ ابھی تو ہم نے اپنی ''زندگی'' گزارنی ہے......تو ایسے کیسے......یوں نہیں ہو سکتا میرے ساتھ......وہ ٹھیک ہے......ٹھیک ہے نا......؟'' عجب بے قرار سا انداز تھا۔

وہ روتی نہ تھی......آنسو نہیں آتے تھے......وجود پہ عجب گھٹن سی تھی اور مزنہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ حملہ شدید تھا اور کسی کے بھی بچ جانے کی اطلاعات نہ تھیں......فرخندہ کو غشی کے دورے پڑ رہے تھے اور وہ......وہ ابھی تک یہ ماننے سے انکاری تھی کہ جہانگیر......جہانگیر نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے مفروضات سے......اپنے لیے زندگی کشید کرنے کی کوشش میں تھی۔

☆......☆......☆

دو دن تک کوئی اطلاع......کوئی خبر نہ مل سکی......کسی سے رابطہ نہ ہو سکا۔ یہ تو طے تھا کہ وہ برسلز ائیر پورٹ کے ڈیپارچر لاؤنج میں ہی تھا مگر پھر بھی ابھی تک کہیں سے، کسی کے ساتھ رابطہ نہ ہوا۔ جرمنی میں مقیم اس کے دوست بھی اسی کوشش میں تھے اور انہی دوستوں سے یہ خبر ہمایوں تک پہنچی تھی کہ وہاں جرمنی میں جہانگیر نے پچھلے کچھ عرصے سے شادی کر رکھی تھی......یہ ہی وجہ تھی کہ اسٹڈی ویزا ختم ہو جانے کے بعد بھی وہ جرمنی میں قیام کر سکتا تھا۔ جہانگیر کا ایک دوست برسلز گیا تھا تا کہ وہاں سے معلومات حاصل کر سکے اور جو اطلاع ملی اس نے ایک بار پھر کہرام مچا دیا۔

جہانگیر اس حملے میں جاں بحق ہو چکا تھا اور ہمایوں اگلی available پرواز سے اس کی ڈیڈ باڈی لینے جا رہا تھا۔ جہانگیر کے دوست کو ہمایوں کے پہنچنے تک سب انتظامات کرنے تھے اور جب وہ ڈیڈ باڈی لینے گھر سے نکلنے لگا تو......

''ہمایوں......!'' خولہ کی پکار نے قدموں کو جکڑ کر رکھ چھوڑا تھا۔

بے ساختہ اس نے تکلیف سے آنکھیں بند کیں اور خولہ......

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اس تک آئی تھی۔

''مجھ سے وعدہ کرو......وعدہ کرو تم اسے لے کر آؤ گے......پلیز ہمایوں......! پلیز......''

''یا خدا......!'' اور اس کا بلکتا، فریاد کرتا لہجہ ہمایوں کے دل پہ زخم لگاتا تھا۔ وہ اس سے نظریں نہ ملا سکا......سر جھکائے کھڑا رہا......

کوئی اسے بتلا دو کہ یہ ''غم''......یہ ''دکھ'' اس کی پیشانی پہ داغ دیا گیا ہے......وہ مان لے......اب مان ہی لے تو بہتر ہے......

مزنہ منہ پہ ہاتھ رکھے روتی رہی......تبسم آگے بڑھی تھیں......اسے کندھوں سے تھاما......

''مسز......'' اور الفاظ ہونٹوں پہ ہی دم توڑ گئے......انہیں ٹوٹ کر رونا آیا۔

''خولہ......چلیں اندر چلیں......'' انہوں نے اسے ہٹانا چاہا مگر اس نے اپنا آپ چھڑوا لیا۔

"بتاؤ نا ہمایوں...... تم اسے لے کر آؤ گے نا...... ؟ ہے نا......؟" وہ پلک جھپکے بنا جواب کی منتظر تھی اور ہمایوں......
اس کے حلق سے کچھ نیچے اترتا دکھائی دیا...... اس نے درخواست کرتی نظروں سے تبسم کو دیکھا اور تبسم نے پوری قوت صرف کر کے اسے ہمایوں کے سامنے سے ہٹایا تھا۔

"مجھے اس سے پوچھنے دیں نا...... پلیز...... مجھے...... ہمایوں...... ہمایوں...... اسے لے آؤ گے نا......؟ ہمایوں پلیز...... تم سن رہے ہو...... سن رہے ہونا......" وہ ان کی گرفت میں مچلتی، چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ اس کی آواز پھٹ سی گئی تھی۔

"ہمایوں......!" اس نے شدت سے پکارا اور پھر بلکتے ہوئے، بے دم ہو کر، ہار ماننے والے انداز میں ڈھے پڑی تھی۔

☆......☆......☆

اس نے ایک بازو تابوت کے گرد پھیلا کر، سر کندھے سے ٹکا رکھا تھا۔ وہ روتی نہ تھی، بین نہ کرتی تھی، بس اک سوگوار اسی، ماتم زدہ...... جامد چپ کی زد میں تھی۔ سیاہ بالوں کی لٹیں چہرے کے اطراف بکھری ہوئیں...... بے ترتیب، ملگجا، شکن زدہ لباس کہ جس پہ چکنائی کے داغ بہت واضح تھے۔ (ٹرے ہاتھ سے گرنے کی وجہ سے چکنائی کپڑوں کو داغدار کر گئی تھی) زرد رنگت، پپڑی جمے ہونٹ...... آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں...... ہا...... تو بہار وجود...... خزاں رت کے نام ہوا...... کوئی نہ کوئی بار بار اس کے کندھوں پہ گرنے والے دوپٹے کو اس کے سر پہ جما دیتا تھا مگر وہ تو یوں بے فکر و لاپرواتھی کہ جیسے اس کے بعد اور آج کے بعد سے اسے کسی چیز کی فکر لاحق نہ ہونی تھی۔ فرخندہ مسلسل بے ہوش تھیں...... ان کا بی پی شوٹ کر گیا تھا اور ڈھے تو احمد صاحب بھی چکے تھے کہ جوان لاشے اٹھائے نہیں اٹھتے...... مگر وہ خولہ...... وہ چپ تھی...... خاموش...... ہونٹوں پہ یوں جیسے مہر لگا چھوڑی تھی۔ آنسو سے عاری آنکھیں اور سب اسے دیکھ دیکھ کر روتے تھے۔ اسے دیکھ دیکھ کر بین کرتے تھے اور وہ...... وہ کہاں تھی؟ تو کیا وہ...... وہاں تابوت کے گرد ایک بازو پھیلائے، سر ٹکائے بیٹھی تھی...... نہیں...... نہیں تو...... وہ تو جہانگیر کے ساتھ، ان لمحوں میں زندہ تھی کہ جو اس کی زندگی میں فقط چند تھے اور انگلیوں پہ گن کر بتائے جا سکتے تھے۔

"میں تمہیں بہت مس کر رہا ہوں......" آواز ہوا کے دوش پہ لہرائی۔

"ہاں......! میں نے یقین کیا...... مان لیا جہانگیر......!" اور اس نے جواب دیا۔

"تم پرانی تلخیوں کو بھول کیوں نہیں جاتیں......؟" آواز کا چابک پھر سے برسا۔

"لو...... میں نے بھلا دیں...... سب بھلا دیں...... مٹا دیں یوں کہ جیسے وہ تھیں ہی نہیں...... مگر...... جہانگیر...... جہانگیر تم کہاں ہو......؟ کہاں......؟"

سوال اس کے ارد گرد کسی بل کھاتے اژدھے کی طرح اپنا آپ کسنے لگا...... اس کا دم گھٹنے لگا......

"کہاں ہو تم...... مجھے آواز دو...... پتا بتاؤ...... کوئی نشانی...... کوئی سراغ دو...... خدا قسم میں وہاں پہنچ کر دم لوں اور خدا قسم مجھ پہ سانسیں حرام جو تمہیں کھوجنے سے پہلے لوں...... تمہارا چہرہ کہاں ہے...... میرے ہاتھ اسے چھونا چاہتے تھے...... تمہارا لمس......"

اور سوچوں میں خلل دونوں ہاتھوں نے ڈالا تھا جو کہ میت کو اٹھانے کے واسطے لپکے تھے اور......اور اس نے سر اٹھا کر دیکھا...... چند لمحے دیکھتی رہی اور پھر وہ اس پہ جھپٹ پڑی۔

''تمہیں کہا تھا......کہا تھا نا تمہیں......اسے زندہ لے کر آنا......زندہ......ایسے کیوں لے آئے تم اسے......کیوں ہمایوں...... کیوں......؟تمہیں ترس نہیں آیا مجھ پہ......رحم نہیں آیا......ذرا سا خیال بھی نہیں آیا......''

وہ ہمایوں کا گریبان دونوں ہاتھوں سے پکڑے، جکڑے......طیش سے سوال کرتی تھی اور ہمایوں......اس کا چہرہ مارے ضبط کے سرخ ہوا......وہ سر جھکائے، نظر جھکائے......اس کے طیش کو سہتا رہا اور اتنے ضبط کے باوجود ایک آنسو خولہ کے ہاتھوں پہ جا گرا......اور وہ......وہ کرنٹ کھا کر پیچھے کو ہٹی......اس نے حیرت سے ہمایوں کو دیکھا......پھر مڑ کر تابوت کو اور......اور......اسی لمحے......ٹھیک اسی لمحے اس پہ یہ انکشاف ہوا......کسی بم کی طرح حقیقت اس کے سر پر پھٹی تھی۔ وہ دہشت زدہ......پھٹی پھٹی آنکھوں سے جہانگیر کی بند آنکھوں کو دیکھتی رہی......

''جہا......ں......گیر......!!!''اور اس کی چیخ سے درختوں پہ بیٹھے سب پرندے خوف زدہ ہو کر اڑ گئے تھے۔

☆......☆......☆

''دکھ کی شاخ پہ کبھی خزاں نہیں آتی......یہ ہمیشہ ہری رہتی ہے......''

تو اب سے وہ بھی دکھ کی اک ایسی ہی شاخ تھی......جسے ہمیشہ ہرا ہی رہنا تھا......وہ اتنی کمزور ہو گئی کہ سیدھا کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔ شانے جھک سے گئے......دل اتنا بے قرار کہ پوچھو ہی مت......رونے پہ آتی روئے ہی چلی جاتی......قرآن پڑھنے پہ آتی تو دن رات کی تمیز ختم کر دیتی......

اسے یقین نہ آتا......ابھی تک یقین نہ آتا کہ وہ ایسے کیسے چلا گیا......کیسے......؟ابھی تو اک بھرپور زندگی جینی تھی اسے......اپنی مرضی کی......اپنے اسٹینڈرڈ کی......اس کے تو ابھی بڑے بڑے خواب تھے......ایک بھی تو پورا نہ ہوا تھا......تو وہ کیسے چلا گیا......کیسے......؟اس کے دل کو سکون نہ آتا تھا......چین نہیں ملتا تھا......یوں جیسے اک آگ سی ہو جو دل کے مقام پہ دہک رہی ہو......

ہوش تو تب آیا جب......

''پھپھو......!''اس نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔ وہ اک کپڑے کو پکڑے سیئے جا رہی تھیں۔

''پھپھو......!آپ کیا کر رہی ہیں......؟''اس نے بے حد حیرت سے ان کے ہاتھ سے سوئی دھاگہ لیا تھا۔

''جہانگیر کے کپڑے سی رہی ہوں......دیکھ نہیں رہیں......''وہ ناگواری سے بولیں اور بولیں کیا......سمجھو کہ بم پھوڑا......خولہ کا دل دھک کر کے رہ گیا......اور وہ بدترین شاک کے تحت انہیں دیکھتی رہ گئی تھی کیونکہ وہ اک بالکل نوزائیدہ بچے کے سائز کا کرتا سی رہی تھیں۔

☆......☆......☆

''مزنہ......!''تبسم کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔تبسم کیا سب ہی اسے حیرانی سے دیکھتے تھے۔

''خیریت مزنہ......؟تم اتنی سویرے سویرے......؟سب ٹھیک ہے نا......؟''زہرہ نے سوال کیا۔

''جی......سب ٹھیک ہے۔''وہ تھکے تھکے سے انداز میں آگے بڑھی اور کرسی پہ جا بیٹھی،تبسم اور زہرہ میں نظروں کا تبادلہ ہوا۔زہرہ نے کچھ بھی پوچھنے سے منع کیا۔

''اچھا......چلو آؤ ناشتہ کرو۔''انہوں نے کہا تھا۔

اور ہمایوں نے بڑی گہری نظر سے اسے دیکھا تھا۔

☆......☆......☆

''تمہیں یوں......انہیں چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا۔بہن عدت میں ہے تمہاری......احمد انکل بھی ہمت گنوائے بیٹھے ہیں اور فرخندہ آنٹی......اف مزنہ......اب کیا میں تمہیں بتلاؤں ان سب کی حالتوں کے بارے میں......؟''ہمایوں شاک سے کہہ رہا تھا۔

''ہمایوں!میں تھک گئی ہوں......اور اب تو......''اور وہ کہتے کہتے رک سی گئی۔

''کیا اب تو......؟''

وہ چند لمحے ہونٹ چباتی،کش مکش کا شکار نظر آئی......وہ جانتی تھی کہ یہ بات ہمایوں کو بتا کر وہ مزید اس کو خفا کرے گی......اس کی ناراضی کا سامنا کرے گی۔

''کیا اب تو مزنہ......؟''وہ ماتھے پہ بل لیے ذرا سختی سے بولا۔

''وہ......پھپھو......انہیں......ان کا......''وہ اٹکی۔

''مزنہ......!''اور ہمایوں کا تنبیہہ کرتا انداز......مزنہ نے بے ساختہ ہونٹوں پہ زبان پھیری۔

''پھپھو بہت عجیب عجیب حرکتیں کرتی ہیں......خولہ کے خیال میں ان کا......ان کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے۔وہ اس حادثے سے بری طرح متاثر ہوئی ہیں......''رک رک کر،اس کی خفا سے خفا تر ہوتی نظروں کو سہہ سہہ کر اس نے بات مکمل کی......ہمایوں اگلے کئی لمحوں کے لیے کچھ کہہ ہی نہیں سکا تھا۔

''ویری گڈ......بہت اچھے مزنہ......!''اور مزنہ نے بے ساختہ آنکھیں بند کیں......لہجہ ہی اتنا طنزیہ تھا۔

''ٹھیک ان حالات میں......ٹھیک اسی وقت میں......تمہیں یہاں......اپنے گھر میں ہی تو ہونا چاہیے تھا۔''اور مزنہ کے ماتھے پہ بے اختیار پسینہ چمکا۔

''تم خود غرض ہو......تم مزنہ تم......ہا......مجھے یقین نہیں آ رہا ہمایوں مفتی کی مسز......ایسی بھی ہو سکتی ہے۔''

''ہمایوں میں بھی......''

''بس ٹھیک ہے......ٹھیک ہے جو تم نے کیا......تم یہاں رہو......آرام کرو......تمہاری زندگی تھوڑی ہے یہ جو تمہیں فرق پڑتا ہو......''

''ہما......''اور اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ بھی کہنے سے روک دیا اور خود اٹھ کر باہر چلا گیا تھا۔مزنہ نے کنفیوز ڈ انداز میں ہاتھوں کو مسلا تھا۔

☆......☆......☆

''کسی کو کیا فرق پڑتا ہے......ہاں......کیا فرق پڑتا ہے......''اسے تکلیف ہوئی تھی مزنہ کے یوں چلے جانے پہ......لیکن اس نے منع نہیں کیا......کچھ کہا نہیں......جو بن کہے نہ سمجھے......کہہ کر بات کو گنوانا کیا......اور ہاں......ابو اور پھپو اس کی ذمہ داری تھوڑی ہیں جو وہ ہلکان ہوتی......یہ تو خولہ کے گلے کے ڈھول تھے نا......اور پھپو......اس نے تھکن اور تکلیف سے آنکھیں بند کیں......ہاں......ان کا ذہنی توازن درست نہ رہا تھا۔اسے حیرت ہوتی اگر وہ اس حادثے کے بعد سنبھل جاتیں......ٹھیک رہتیں......ان کو سنبھالنا......ان کے چھوٹے چھوٹے کام......وہ اتنے سوال کرتیں کہ زچ کر ڈالتیں......کسی بات پہ اڑ جاتیں تو بس اڑ جاتیں......ماننے پہ آتیں تو بلا چوں چرا کیے مان جاتیں......نہ ماننے پہ آتیں تو......تب خولہ کا دل چاہتا کہ دھاڑیں مار مار کر روئے......سر پہ ہاتھ رکھ کے روئے......آہ......جہانگیر......! آہ......دیکھو تو سہی......تم زندگیوں کو......ہماری زندگیوں کو کیا سے کیا بنا گئے......اک عمر تمہارے خوابوں کے لیے ہم نے زندگی کو ڈھویا اور اب......اور وہ تھک جاتی......تھک کر نیند کی گولی لیتی اور بے خبر ہو جاتی مگر اس کا یوں بے خبر ہو جانا بھی کب آسان تھا۔ذرا سی دیر کے بعد ہی احمد صاحب کو''مجبوراً''اسے اٹھانا پڑتا......اور وجہ فرخندہ......اس کے علاوہ انہیں اور کوئی نہ سنبھال سکتا تھا۔

ہا......تو زندگی اسے کچھ یوں ملی تھی......

کہ پل پل کسی مشقت کی طرح کاٹا جاتا تھا۔

☆......☆......☆

''مزنہ......!''

''جی......!''

''دو دن ہو گئے ہیں آپ کو آئے......کیا اب واپس نہیں جائیں گی......؟''

اور''آ''......اس کا منہ کھلا کا کھلا ہی رہ گیا۔صبح ہمایوں کے ہاتھوں عزت افزائی اور اب آپی......

''آہم......وہ آپی......میں بس......چند دنوں کے لیے آئی تھی......چلی جاؤں گی......''وہ ہکلائی۔اور آپی نے محض سر ہلایا تھا۔

''مزنہ......!یہ آپ کا گھر ہے......آپ نے یہیں واپس آنا ہے......چاہے جتنے بھی دن آپ وہاں رہ لیں......آنا تو یہیں ہے

نا......؟ لیکن اس وقت آپ کی وہاں ضرورت ہے...... احمد انکل کیا سوچیں گے ہمارے بارے میں...... کیا ہم نے آپ کو مجبور کیا واپس آنے پہ......؟ اور ہمایوں بتا رہا تھا کہ آنٹی فرخندہ کی حالت......" اور تبسم نے بے ساختہ تاسف سے ہونٹ بھینچے تھے۔

"بہرحال......! یہ آپ کا گھر ہے...... آپ اپنی مرضی کی مالک ہیں۔ لیکن آپ کے گھر والے مشکل میں ہیں۔" اور پھر گہری سانس لے کر انہوں نے بات مکمل کی اور اٹھ کر وہاں سے چلی گئی تھیں اور مزنہ...... اس نے بے اختیار سر اپنے ہاتھوں پہ گرایا تھا...... اس نے خود کو خود ہی اپنے شوہر اور سسرال والوں کی نظروں میں De-value کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

چار ماہ دس دن بعد......

"آج گیارہواں دن تھا۔"

تو جہانگیر کو اس کی زندگی سے گئے ہوئے...... چار ماہ، گیارہ دن ہو گئے اور وہ ایک دم، اچانک بے طرح سے خالی ہوئی جیسے کرنے کو کچھ نہ رہا ہو...... اب...... تو اب وہ کیا کرے......؟ چار ماہ دس دن...... تو اس کا سوگ ختم ہوا...... اسے زندگی کی طرف آنا تھا...... اسے اجازت تھی کہ وہ زندگی کو جیسے چاہے گزارے...... مگر...... لیکن...... اسے سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ اب سے...... آج کے بعد سے وہ کیا کرے گی...... جہانگیر کے بعد وہ کیا کرے گی......؟ یا میرے اللہ...... اوہ خداوند......! ایسا تو اس نے سوچا نہ تھا...... کون سوچتا ہے ایسا...... کوئی بھی تو نہیں...... کوئی بھی تو نہیں...... وہ یوں ہو گئی تھی کہ جیسے کوئی مفلوج...... اس کی زندگی کے پیر بھی تو مفلوج ہو کر رہ گئے تھے اور اب جب اس نے پیر زمین پہ جمانے چاہے...... چلنا چاہا تو معلوم ہوا کہ وہ تو چلنا بھول چکی...... اس کو کوئی اب...... قدم رکھنا...... قدم جمانا سکھائے...... انگلی پکڑ پکڑ چلائے...... ہا...... تو اب کون......؟ بیڈ پہ بیٹھی، گود میں ہاتھ رکھے، وہ اتنی ساکت بیٹھی تھی کہ لگتا تھا اب تو وہ حرکت نہ کرے گی...... نا...... اب تو کبھی بھی نا...... اور آنسو واحد تھے جو کہ حرکت پذیر تھے...... موم کی طرح پگھل پگھل کر بہتے ہوئے...... اک تواتر سے...... مسلسل...... کون کہتا تھا کہ آنسو بھی خشک ہو جاتے ہیں...... آہ...... اس کے تو نہ ہوتے تھے...... کون کہتا ہے کہ وقت کے ساتھ صبر آ جاتا ہے...... اسے تو نہ آتا تھا۔

جہانگیر سے کیا رشتہ تھا اس کا...... محبت کا...... نہیں...... وہ اس کا جوڑ تھا...... وہ اس کا شوہر تھا...... تمام تر تلخیوں کے باوجود...... اس نے یہ تو نہ چاہا تھا کہ وہ یوں چلا جائے...... اک ناآسودہ سی زندگی گزار کر...... وہ ایسے بھری جوانی میں چلا جائے...... اسے یہ دکھ مارتا تھا...... اس کا شوہر نہ رہا تھا کہ جس کے ساتھ اس نے ساری زندگی بتانی تھی۔ اسے یہ غم کھاتا تھا...... تو اب...... اب وہ کیا کرے...... زندگی کیسے بتائے...... کس سے جھگڑے...... کس سے خفا ہو...... کس کی تلخ باتوں پہ روئے...... ہا...... وہ کیا کرے...... کیا......؟ کرے تو آخر کرے کیا......؟ اور اس نے سر دونوں ہاتھوں پہ گرایا تھا۔ اس کی سسکیاں کمرے میں بلند ہونے لگی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ آنکھیں نہیں کوئی

بھرا سمندر تھا جو بہتا ہی چلا جاتا تھا......کئی لمحوں بعد......دروازے پہ ہونے والی دستک نے اسے چونکایا تھا......اس نے ہونٹ بھینچ کر بند دروازے کی جانب دیکھا تھا......جانتی تھی کہ باہر کون تھا......ابو تھے......اور اسے یوں زیادہ تر اکیلا نہیں رہنے دیتے تھے۔

''خولہ......!'' دستک دوبارہ ہوئی مگر وہ چپ بیٹھی رہی......وہ اس حال میں اور اس وقت ان کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی......وہ چاہتی تھی کہ ابو اسے سوتا سمجھ کر چلے جائیں......دستک ایک بار پھر ہوئی......اس کا نام پھر سے پکارا گیا اور وہ اک بار پھر سے ہونٹ بھینچے خاموش رہی......بالآخر احمد صاحب چلے گئے تھے۔

وہ چند لمحے بیٹھی رہی اور پھر اٹھ کر آئینے کے سامنے آئی تھی۔ اور اسے اپنا ہی چہرہ دیکھ کر دھچکا لگا تھا۔ اتنے مہینوں سے اس نے کب دیکھا تھا آئینہ......نہیں دیکھا تھا اور اب وہ حیرت سے خود کو دیکھتی رہ گئی......بال کئی دن سے چٹیا میں بندھے ہوئے......مسلا ہوا لباس اور بیمار سا چہرہ......اس کے چہرے پہ چیک بونز بے حد واضح ہو گئی تھیں۔ سیاہ حلقے بہت نمایاں تھے۔ کالر بونز بھی پہلے سے زیادہ ابھر چکی تھیں۔ مزنہ کو جب وقت ملتا تھا وہ ہی اس کے بال بنا دیا کرتی تھی......اس نے تو کب سے ایسی چیزوں پہ توجہ دینا چھوڑ رکھا تھا......شیشے میں سے ہوتی ہوئی نظر......سنگھار میز تک گئی تھی......وہاں کاسمیٹکس کا اک ڈھیر پڑا ہوا تھا......پرفیومز، Make up Accessories......Nail Paints......جیولری......اسکول جوائن کرنے کے بعد سے وہ ایسی چیزوں پہ توجہ دینے لگی تھی اور اب......وہ چند لمحے ان چیزوں کو دیکھتی رہی اور پھر سے اس نے خود کو آئینے میں دیکھا۔ معلوم نہیں اسے کیا سوجھا......اس نے چٹیا کے بل کھولنے شروع کیے تھے......بال کھول کر......اس نے سنگھار میز پہ نظر دوڑائی......پھر ہاتھ لپ اسٹک کی طرف بڑھایا......اس نے لپ اسٹک کھول کر ہونٹوں پہ لگانی چاہی اور اک دم سے سکتے میں آئی تھی......ٹھہر گئی......اس کا دل دھک کر کے رہ گیا اور اس پہ اک بدترین انکشاف ہوا......آج کے بعد سے وہ کوئی سنگھار کرنے کے قابل بھی نہیں رہی تھی۔ اس کا دل خالی تھا......ویران تھا......بنجر ہو چکا تھا......اس نے یک دم لپ اسٹک سنگھار میز پہ پھینکی......یوں جیسے کسی ناپاک چیز کو چھو لیا ہو......اک لہر سی اٹھی تھی اندر اور اس نے ساری چیزوں کو......ساری چیزوں کو ہاتھ مار کر گرا دیا......Nail Paints کو کھول کھول کر ضائع کر دیا......ڈسٹ بن میں گرا دیا......وہ چند لمحے ان بکھری چیزوں کو تکتی رہی اور پھر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی تھی کہ جہاں سورج کی تمازت پھیل چکی تھی......اس نے بند آنکھوں کے ساتھ چہرہ اٹھا کر سورج کی تمازت کو محسوس کرنا چاہا......اس کی بند آنکھوں میں چبھن تھی......تکلیف سی تھی......سورج کی تمازت نے اس تکلیف کو ذرا سا کم کیا تھا......اور وہ یوں ہی چہرہ اٹھائے کھڑی رہی۔ اور اس طرح سے کھڑی وہ کسی گم شدہ روح کی مانند لگتی تھی اور بے اختیار اسے اک عنوان دینے کو جی چاہتا تھا۔

''The Lost One......''

☆......☆......☆

اس کی عدت ختم ہوئی تو ہمایوں کی ساری فیملی ملنے آئی تھی۔ باقی سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے اور تبسم اس کے پاس تھیں۔

''خولہ......!'' وہ اب دانستہ اسے مسز جہانگیر کہنے سے گریز کیا کرتی تھیں۔

اس نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔تبسم شفقت سے مسکرائیں پھر انہوں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔

''جاب اسٹارٹ نہیں کرو گی......؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا......تبسم جانتی تھیں کہ یہ ہی جواب آنا تھا۔انہوں نے بے ساختہ اک گہری سانس بھری۔

''اچھا ہوتا اگر تم continue رکھتیں جاب کو......لیکن تمہاری مرضی......''

اور خولہ نے سوچا ''جس'' کے لیے جاب کی تھی جب وہ ہی نہیں رہا تو......تو......؟ کس لیے کرے وہ سب......؟ کس لیے......؟

''چلو آؤ......سب تمہیں ملنے آئے ہیں......'' اٹھتے ہوئے انہوں نے اسے بھی ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہا......

''میں......؟ مجھ سے......؟'' وہ حیران ہوئی۔

چار ماہ دس دن......اس نے گھر سے باہر قدم نہ رکھا تھا، کسی سے ملتی بھی نہ تھی......چھت تک نہ جاتی تھی......اور اب اسے یوں......سب کے سامنے جانا......بے حد مشکل لگ رہا تھا......وہ اب بھی اک کمرے میں بند، ساری دنیا سے چھپ کر رہنا چاہتی تھی۔ نہ کسی کو نظر آئے، نہ دکھائی دے اور نہ ہی کسی کو وہ دیکھے......

تبسم نے اک نظر اس کے حیران چہرے کو دیکھا اور پھر اس کے شانے کے گرد بازو پھیلا کر بولیں۔

''ہاں......! تم سے......چلو اٹھو......شاباش......'' اور ان کے زبردستی اٹھانے پہ وہ اٹھ گئی......وہ اسے ساتھ لیے......ڈرائنگ روم تک آئی تھیں۔اندر سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔

اور جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئی......یک دم خاموشی چھا گئی تھی۔

''میرا بچہ......!'' زہرہ نے اٹھ کر اسے گلے سے لگایا۔اس کا منہ چوما......اور نا چاہتے ہوئے بھی آنسو گالوں پہ بہہ پڑے......

اور ہمایوں......چار ماہ دس دن اور وہ کیا سے کیا ہو گئی......؟ کیا کوئی یوں......اس قدر......اس طرح سے بھی بدلتا ہے......بدل سکتا ہے......

وہ سخت شاک میں تھا۔وہ تو پہچاننے سے بھی پہچانی نہ جاتی تھی۔وہ چاہ کر بھی اس سے نظریں نہ ہٹا سکا......زہرہ اسے پاس بٹھائے اس سے باتیں کر رہی تھیں۔اسے تسلی دے رہی تھیں اور ہمایوں......جب جب اس نے خولہ پہ نظر ڈالی......جتنی بار اسے دیکھا......ٹھیک اتنی بار......ٹھیک اتنی ہی بار اس کے دل پہ زخم لگا......اور ہر دفعہ زخم گہرے سے گہرا تر ہوتا چلا گیا یوں جیسے اک ہی زخم پہ کوئی بار بار تیز دھار آلہ چلائے......خولہ کا غم تو تھا جو تھا......ہمایوں کا غم اس سے بھی سوا تھا......اپنی بے بسی، اپنی لاچاری پہ اب اسے غصہ آرہا تھا......اس نے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔آنکھیں سرخی مائل تھیں اور جب ضبط حد سے گزرنے لگا تو وہ اٹھ کر باہر چلا گیا......اور جب وہ باہر نکلا تو خولہ پہ

اچانک انکشاف ہوا......

''تو وہاں وہ بھی موجود تھا......'' اسے حیرت ہوئی کہ وہ اس کی موجودگی کو محسوس نہ کر سکی تھی۔ تو اب وہ ہر چیز، ہر جذبے سے بے پرواہ ہو چکی تھی۔ حتیٰ کہ اس بات سے بھی کہ ہمایوں کو اس کی ذات سے کیا فرق پڑتا ہے اور کیا نہیں......

☆......☆......☆

ہمایوں کا وجود ایک دم سے ان کے گھر پہ حاوی ہوا تھا۔ اس نے سب معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ بلز جمع کرانا، فرخندہ اور احمد صاحب کی دوائیاں لانا، ان کو چیک اپس کے لیے لے کر جانا...... کئی مہینوں تک یوں ہی چلتا رہا...... خولہ اپنی ذات کے خول میں بند...... اس سب سے لاپرواہ رہی اور پھر ایک دن...... اچانک ہی...... یوں ہی...... بیٹھے بٹھائے وہ جیسے نیند سے جاگی تھی...... اسے یوں جیسے ہوش آیا...... یہ ہو کیا رہا تھا......؟ ہاں ٹھیک ہے وہ یہ سب ہمدردی میں کرتا تھا...... پرواہ کرتا تھا ان لوگوں کی مگر...... لیکن...... خولہ کو یہ ''چبھنے'' لگا۔ یہ ٹھیک نہیں تھا...... بالکل بھی نہیں...... اسے معاملات پھر سے اپنے ہاتھ میں لینے چاہئیں...... ہمایوں کا اتنا عمل دخل صحیح نہیں تھا۔ سب کچھ اگر ''حد'' میں ہی رہے تو یہ ہی بہتر ہوتا ہے۔ کسی بگاڑ کی نوبت ہی کیوں آئے......؟ اور اس نے...... اس مہینے کے بلز خود جمع کرائے...... میڈیسنز بھی خود ہی خرید کر لائی اور اس کا ارادہ پھپھو کو بھی خود ہی ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا تھا...... مگر احمد صاحب نے ڈانٹ دیا تھا۔ وہ پہلے تو یہ خیال کر کے چپ رہے کہ مصروف رہے گی تو اچھا ہے...... مگر وہ تو خود کو ہلکان کرنے پہ تل آئی تھی۔ اس کے منع کرنے کے باوجود انہوں نے ہمایوں کو کال کر کے بلایا تھا۔

☆......☆......☆

''آپ کو میرا یہاں آنا برا لگتا ہے کیا......؟'' اس نے اپنے پیچھے یہ آواز سنی اور یوں ہو گئی کہ جیسے اب سے وہ سنگ مرمر کا اک مجسمہ تھی۔ کوئی حیرت سی حیرت تھی...... ہمایوں نے کبھی...... کبھی بھی...... اسے یوں بے تکلفی سے مخاطب نہ کیا تھا کجا کہ یہاں...... اس کے پیچھے کچن تک آنا...... کئی لمحے وہ شیلف کا سہارا لیے کھڑی رہی...... وہ جانتی تھی کہ وہ جواب لیے بنا نہیں جائے گا۔

''ایسی بات نہیں......'' اور آواز پھنس سی گئی۔

''ایسی ہی بات ہے...... ورنہ آپ یوں خود کو ہلکان نہ کرتیں۔''

اس نے بھرپور طریقے سے نفی کی تھی۔ جواب میں خولہ کچھ نہ کہہ سکی تھی۔

''اپنا خیال رکھا کریں خولہ......! کیا حال بنا لیا ہے آپ نے......'' لہجہ نرم اتنا کہ سماعت میں شہد کی مانند ٹپکے...... اور وہ اس نرمی پہ بھی حیران سی رہ گئی۔ اسے کب عادت تھی اس کا یہ لہجہ سننے کی...... خولہ نے حیران ہو کر، لاشعوری طور پر نظریں اٹھائیں تو اس کی پشت دکھائی دی تھی۔

اس نے باپ کے بعد آج کسی دوسرے مرد کو...... یوں اتنے نرم لہجے میں بات کرتے دیکھا تھا...... وہ حیرانی سے اس کی پشت کو تکتی رہ گئی تھی۔

☆......☆......☆

سر کے بالوں سے لے کر پیر کے انگوٹھے تک...... وہ پسینے میں بھیگی ہوئی تھی۔ وہ اپنے چہرے، گردن کی پشت اور جسم پر آیا پسینہ لکیر کی صورت بہتا محسوس کر سکتی تھی۔ اتنا پسینہ کہ اس کی پلکوں پر بھی نمی کے قطرے موجود تھے۔ اسے سانس نہیں آ رہا تھا۔ وینٹی لیٹر پر ہونے کے باوجود سانس نہیں آ رہا تھا اور ہر دو سیکنڈ پر اسے اِک لمبا سانس کھینچ کر تنفس کے عمل کو بحال رکھنا پڑ رہا تھا۔ اس نے آہستگی سے پلکیں جھپکیں...... منظر دھندلا سا تھا۔ کچھ لوگ تھے، کچھ آوازیں...... اس نے ایک اور لمبا سانس کھینچا...... سب کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا۔ سب کچھ...... گہرے، گہرے سانس لیتے ہوئے وہ اپنی پلکوں کو بند ہونے سے روک رہی تھی مگر غنودگی زور آور تھی۔ وہ نیم بے ہوشی کی سی کیفیت تھی یا پھر...... یا پھر شاید وہ مر رہی تھی۔

اس نے پھر سے پلکوں کو جھپکا اور اب کی بار وہ انہیں کھول نہ سکی تھی...... مگر اس سے پہلے اس نے کسی کے رونے کی آواز سنی تھی۔ اس کے ہونٹ بِنا آواز ہلے...... وہ آواز بڑی واضح اور صاف تھی...... اور جیسے اس کی سماعتیں وہ ہی اِک آواز سننے کے لیے سلامت تھیں۔ اس کے ہونٹوں نے بن آواز کے پکارا تھا۔

”میرا بچہ......!“

اور پھر وہ اپنے بچے کو دیکھ بھی نہ سکی تھی، چھونا تو دور کی بات محسوس تک نہ کر سکی...... اور اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا...... یوں جیسے اس کے جسم کو کسی اندھی، گہری، تاریک کھائی میں پھینک دیا گیا ہو...... وہ نیچے ہی نیچے گرتی جا رہی تھی...... یہ جانے بنا کہ اس نے ایک بچی کو جنم دیا تھا...... اس کی بیٹی...... ہو بہو اس کی آنکھوں والی...... ویسی ہی خوبصورت، دل کش اور بڑی بڑی آنکھوں والی...... اس کی بیٹی......

❁ ❁

ناول **نار** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **5** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 7

http://kitaabghar.com

''خولہ! میں آپ کو لینے آئی ہوں۔'' مزنہ اور تبسم شاپنگ کے لیے نکلیں اور واپسی پہ خولہ کو دیکھنے چلی آئیں، تب ہی تبسم نے کہا تھا۔

''جی......!'' وہ چائے سرو کر رہی تھی جبھی ہاتھ روک کر حیرانی سے بولی۔

''جی......!''تبسم نے دہرایا۔

''آپ تو بس گھر کی ہی ہو کر رہ گئی ہیں......کہیں آتی جاتی ہی نہیں......کہیں اور نہیں تو ہماری طرف ہی آ جایا کریں۔''

''ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں آپی......!''مزنہ نے تائید کی۔

''وہ بس پھپو کی وجہ سے بہت مصروف رہتی ہوں اور ویسے بھی ضرورت نہیں محسوس ہوتی کہیں آنے جانے کی۔''

''لو بھلا اب کیا ضرورت کے تحت ہمارے گھر آیا کریں گی......؟''وہ ناراض سی دکھی تھیں۔

''نہیں......میرا یہ مطلب نہیں تھا......وہ میں......''اور مزنہ ہنس دی۔

''ارے آپی......!تبسم آپی تنگ کر رہی ہیں آپ کو......''

''بس آج یہ ہمارے ساتھ جائیں گی......ٹھیک ہے مزنہ......؟''

''بالکل ٹھیک......ڈن!''مزنہ نے انگوٹھا اٹھا کر اشارہ کیا اور خولہ کے چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگیں۔

''میں وہاں چلی جاؤں گی تو پھپو کو کون دیکھے گا......ابو نہیں سنبھال سکتے انہیں......وہ بہت مسئلہ کرتی ہیں۔'' گھبرایا سا انداز......اڑا اڑا چہرہ......

''ارے تو انہیں بھی ساتھ لیے چلتے ہیں......اب احمد انکل اکیلے گھر کیا کریں گے۔''

''نہیں......نہیں......پھپو بہت پرابلم کرتی ہیں۔ان کو کہیں بھی نہیں لے جایا جا سکتا۔''

''کم آن خولہ......!وہ کسی غیر کا گھر تو نہیں جو آپ یوں uneasy ہو رہی ہیں۔''تبسم نے اس کی بات کو اڑایا۔

''مگر پھر بھی مس مفتی......یہ آسان نہیں ہے۔اور آج تو ویسے بھی ان کا وزٹ ہے ڈاکٹر کے ہاں......''

''کوئی کام مشکل نہیں ہوتا......چلیں آپ آج نہیں آسکتیں تو کوئی بات نہیں......کل کا پروگرام رکھ لیتے ہیں......کیوں مزنہ؟''

''ہاں یہ صحیح رہے گا......ہمایوں بھی گھر پہ ہی ہوں گے......''

''پروگرام......؟''خولہ نے حیرت سے دہرایا۔

''بھئی ہمارے گھر رات چھوٹی سی باربی کیو پارٹی ہے......گھر کے ہی افراد ہوں گے۔ ہمایوں کرے گا باربی کیو اور ہم سب اڑائیں گے۔''تبسم نے اپنی ہی بات کا مزہ لیا تھا۔

''تو پھر کل شام ڈن......؟''

''ڈن!''اور جواب مزنہ کی طرف سے آیا تھا۔

''احمد انکل اور آنٹی کو بھی لے کر آنا اور یاد رکھنا خولہ......!تم نے کوئی عذر تراشا......حیل و حجت سے کام لیا تو میں خود آکر تمہیں اٹھا کر لے جاؤں گی......لکھ چھوڑو میری یہ بات......''وہ انگلی اٹھا کر اسے وارن کرتی ہوئی بولیں اور وہ ان کے اس تھانے دارانہ انداز پہ ہلکا سا مسکرادی تھی۔

''جی ٹھیک ہے......''اور اس نے مدھم سا کہا۔

☆......☆......☆

وارڈروب میں ایک سے ایک بڑھ کر سوٹ موجود تھا مگر کسی کو بھی پہننے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ جو پسند آیا تو سادہ...... بالکل سادہ سیاہ پیور شیفون کا سوٹ......اس نے وہ ہی نکال لیا تھا۔ بالوں کا گردن کے ساتھ لگا جوڑا بنایا اور سر پہ دوپٹا جمالیا......لو جی وہ تیار تھی۔ سادہ سے چہرے کے ساتھ وہ جب تیار ہو کر باہر آئی تو احمد صاحب فرخندہ کو سیریل کھلا رہے تھے۔

''ابو! آپ تیار نہیں ہوئے......؟''وہ حیران ہوئی۔

''نہیں......میں نہیں جا رہا......میں اور فرخندہ گھر پہ ہی رہیں گے......مزنہ کو کال کر دی ہے میں نے......وہ گاڑی بھجوا رہی ہے۔''اور اس کا منہ ابو کی بات سن کر کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''میں اکیلی جاؤں گی کیا اب......؟انہوں نے آپ کو بھی انوائیٹ کیا ہے۔''وہ اکیلی نہیں جانا چاہتی تھی......یہ صاف دکھتا تھا اور احمد صاحب اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتے تھے کہ ایسے میں......وہاں بھی اسے فرخندہ کو سنبھالنا پڑتا......وہ خاک انجوائے کرتی......انہوں نے اک گہرا سانس بھر کر چمچ پلیٹ میں رکھی اور اس کی جانب تکا تھا۔ فرخندہ جہانگیر کو سلانے لگی تھیں۔

''میں بچہ نہیں ہوں خولہ......!فون کر کے تبسم سے معذرت کر چکا ہوں۔ گاڑی آتی ہوگی......تم تیار رہو......''قطعی انداز میں کہہ کر وہ اک بار پھر سے فرخندہ کی جانب متوجہ ہوئے......وہ چند لمحے ہونٹ کاٹتی کھڑی رہی......یوں جیسے تذبذب کا شکار ہو۔

''اور پھپھو......؟''

''نیند کی دوا کھلا کر سلا دوں گا......تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں......''اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے وہ ترنت بولے تھے......یوں جیسے جانتے ہوں کہ وہ کیا کہنے والی تھی۔خولہ نے ٹھس سے انداز میں انہیں دیکھ کر اک گہرا سانس لیا۔ایسے کہ جیسے اب کچھ بھی نہ کیا جا سکتا ہو۔اسی وقت باہر گاڑی کا ہارن سنائی دیا تھا۔اور اس نے بے ساختہ آنکھیں میچی تھیں۔

☆......☆......☆

سارا راستہ وہ کار ونڈو کے ساتھ سر ٹکائے......باہر کے مناظر کو دیکھتی رہی۔ڈرائیور بھجوایا تھا مزنہ نے......اس کا ذہن اک دم خالی تھا۔باہر دوڑتے مناظر اک سیکنڈ میں اس کے ذہن کی اسکرین پہ شبیہ کی صورت میں نمودار ہوتے اور پھر جب وہ گزر جاتے تو ذہن پھر سے خالی......اور اس خالی پن کو دوبارہ سے کوئی منظر......پاس سے زن سے گزرنے والی گاڑی......کوئی درخت......بلڈنگ یا اس طرح کی دوسری چیزیں بھر دیتی تھیں۔اور کچھ لمحوں بعد پھر سے ذہن خالی......کوئی سوچ......کوئی خیال تک نہ تھا۔وہ گم صم......کار ونڈو سے سر ٹکائے،دونوں ہاتھ گود میں رکھے بیٹھی تھی۔ڈرائیور اسے اگر سمندر پار بھی لے جاتا نا تو تب بھی اسے خبر نہ ہوتی کہ وہ کدھر ہے......کہاں ہے اور کس سمت میں جا رہی ہے۔وہ کچھ ایسی ہی حالت میں تھی۔اتنے بہت سے دنوں کے بعد وہ کسی گیدرنگ کا حصہ بننے جا رہی تھی......کسی گیدرنگ میں شمولیت کے لیے جا رہی تھی......بڑا بے تکا سا لگ رہا تھا اسے یہ سب......یوں جیسے کہ یہ سب اس کے لیے نہ تھا......نہیں ہونا چاہیے تھا......وہ اب اس طرح کی گیدرنگز اٹینڈ نہیں کر سکتی تھی......اسے نہیں کرنا چاہیے تھا......معلوم نہیں یہ ''نہیں'' کا لفظ اس کے دماغ میں کس نے فیڈ کر چھوڑا تھا کہ اس نے ہر چیز......ہر شے کو خود پہ ممنوعہ کر رکھا تھا۔

کوئی اس سے پوچھے کہ تمہیں کس نے کہا......کس نے بتلایا کہ اب سے تم پہ زندگی اور اس کی خوشیاں بند ہیں......اک حادثہ تھا......ہونا تھا،زندگی میں آنا ہی تھا......اس کی عمر اتنی ہی تھی سو وہ چلا گیا۔یہ ہو گیا تو اب......؟تو اب کیا وہ ہر خوشی،ہر راحت کو خود پہ حرام کر لے گی کیا......؟اور جب کار مزنہ کے گھر کے دروازے پہ رکی تو اسے عجب سا خوف محسوس ہوا۔یکدم اسے ادراک ہوا کہ وہ کس قدر ان سوشل ہو چکی ہے......اتنی کہ اب چار لوگوں کا سامنا کرتے ہوئے اسے بے حد عجیب محسوس ہو رہا تھا یوں جیسے اس کا کانفیڈینس مجروح ہو چکا ہو......جیسے وہ odd one out ہو......سب اسے دیکھیں گے......انگلی اٹھا اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کریں گے......اور اس نے وہاں سے بھاگ جانا چاہا۔اس کا دل چاہا کہ وہ کار کا دروازہ کھولے اور الٹے پیروں پڑے اور اک ایسی دوڑ لگائے کہ کسی کے ہاتھ نہ آئے......کوئی اسے ڈھونڈ نہ سکے......پا نہ سکے......دیکھ نہ سکے......خولہ کہہ کر پکار نہ سکے......مگر یہ کہ......یہ زندگی ہے۔اگر آپ نہ بھی ناچنا چاہیں نا تو تب بھی یہ پیروں میں گھنگھرو باندھ چھوڑتی ہے اور کہتی ہے......لو اب

ذرا سا ناچ کر تو دکھاؤ! تو یہ زندگی ہے اور یہ نچاتی ہے...... کار نے ڈرائیو وے عبور کیا اور پورچ میں آ کھڑی ہوئی۔ وہ دم سادھے بیٹھی رہی...... ڈرائیور نے آگے بڑھ کر اس کی طرف کا دروازہ کھولا اور خولہ کے حلق سے کچھ نیچے اترتا دکھائی دیا...... عجب حالت تھی...... دل ڈوب رہا تھا...... Cold sweats وقفے وقفے سے لہر کی صورت پورے بدن میں اٹھ رہے تھے اور ٹانگوں میں لرزش تھی...... اور اسے رونا آیا...... بے طرح رونا آیا...... اپنی اس حالت پہ اسے بے طرح رونا آیا اور قریب تھا کہ وہ وہیں بیٹھ کر رونا شروع بھی کر دیتی کہ اچانک مزنہ اندرونی دروازے سے باہر آئی تھی۔

''اوہ میرے خدا! دیکھیں تو سہی کون آیا ہے...... آپی، آنٹی، ہمایوں...... ! خولہ آ گئی ہیں......'' وہ چلاتے ہوئے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس تک آئی تھی اور اسے بازو میں بھر کر اس کا منہ چوما۔

''ہا...... آپی اتنی ٹھنڈی کیوں ہو رہی ہیں......؟'' اور اس سے ملتے ہی اس نے خولہ کے دونوں ہاتھ پکڑ کر سوال داغا تھا اور وہ پھیکا سا مسکرا بھی نہ سکی۔ مسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں پہ آنے سے پہلے ہی دم توڑ دیا تھا...... اس کے ہونٹ کانپے اور ایک آنسو آنکھ سے ٹپک پڑا۔

''نہ...... نہ میرے بچے...... نہ...... ایسے نہیں کرتے...... بس۔'' زہرہ نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگایا اور وہ رو کر ان لوگوں کا ایونٹ خراب نہیں کرنا چاہتی تھی سو خود پہ قابو پاتے ہوئے وہ زہرہ کے ساتھ اندر کی طرف بڑھی تھی۔

☆......☆......☆

پورے لان میں باربی کیو کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے سمجھا تھا کہ محض گھر کے افراد ہوں گے مگر وہاں تو تبسم کے ماموں کی فیملیز بھی موجود تھیں۔ خولہ نے خود کو ایک بار پھر سے بے آرام ہوتا محسوس کیا تھا۔ لیکن اب کی بار یہ محض چند لمحوں کے لیے ہوا تھا۔ وہ سب اس سے بے حد نارمل سے انداز میں ملے تھے۔ کسی نے اسے ترحم بھری نظروں سے نہیں دیکھا، کوئی ایسا سوال بھی نہ پوچھا جو اسے تکلیف دیتا یا پھر کم از کم بے آرام کرتا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ تھوڑی دیر بعد خولہ نے خود کو نارمل ہوتے محسوس کیا تھا۔ لان کے ایک کونے میں ہمایوں اور اس کے کزنز باربی کیو کر رہے تھے۔ ابھی تک ہمایوں سے اس کا سامنا نہیں ہوا تھا اور اچھا ہی ہوا تھا۔ کھانے کے بعد وہ سب لان میں گول دائرے میں کرسیاں لگائے چائے پی رہے تھے۔ بچہ پارٹی گھاس پہ براجمان تھی کہ تبھی انہوں نے مزنہ کی آواز سنی۔

''آج کی محفل اس کے بنا ادھوری ہے۔'' وہ گٹار اٹھائے ہوئے تھی۔

''مز...... نہ!'' ہمایوں نے شاک سے کہا۔ مزنہ نے شرارت سے کندھے اچکائے اور بچہ پارٹی نے ''Yeah'' کہتے ہوئے شور مچا ڈالا۔ مزنہ نے گٹار لا کر اس کی گود میں رکھ دیا...... اس نے مزنہ کو مصنوعی گھوری ڈالی تھی۔ مزنہ کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔

ہمایوں چند لمحے Strings کے ساتھ مصروف رہا۔ گٹار سیٹ کرتا رہا۔ اس نے ٹون سیٹ کرنے کی کوشش کی مگر کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ جو وہ گانا چاہتا تھا اسے گٹار پہ گانے کے لیے پہلے مشق کی ضرورت تھی۔ اس نے گلا کھنکھارا اور اک نیچی سی نگاہ خولہ پہ ڈالی تھی۔ وہ چائے کی پیالی پکڑے گم صم سی بیٹھی تھی۔

''آج کی رات......

آج کی رات......سازِ دلِ پر درد نہ چھیڑ......

آج کی رات......''

''واہ......واہ......!'' اک دم شور سا اٹھا دیا تھا بچہ پارٹی نے......

کیا آواز تھی......کیا درد تھا......اور کیا سوز......

''قولِ الفت کا جو ہنستے ہوئے تاروں نے سنا

بند کلیوں نے سنا، مست بہاروں نے سنا

سب سے چھپ کر جسے دو پریم کے ماروں نے سنا

خواب کی بات سمجھ کر اس کو حقیقت نہ بنا''

وہ ساتھ ساتھ گٹار پہ ٹیپ کر رہا تھا......

''آج کی رات سازِ دلِ پر درد نہ چھیڑ......

آج کی رات......

اب ہیں ارمانوں پہ چھائے ہوئے بادل کالے

پھوٹ کر رسنے لگے ہیں میرے دل کے چھالے

آنکھ بھر آئی، چھلکنے کو ہیں اب یہ پیالے

مسکرائیں گے میرے حال پہ دنیا والے''

خولہ نے جھٹکے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا......اس کی آنکھیں بند تھیں...... ہاتھ گٹار پہ مدہم مدہم سا بجتا ہوا......اک ردھم کے ساتھ اور وہ......وہاں اس وقت ''موجود'' نہ لگتا تھا۔ خولہ کا منہ سرخ ہوا اور اس نے چہرہ پھیر لیا۔

''آج کی رات سازِ دلِ پر درد نہ چھیڑ......

آج کی رات......

بے بسوں پر یہ ستم خوب زمانے نے کیا
کھیل کھیلا تھا محبت کا ادھورا ہی رہا
ہائے تقدیر کہ تقدیر سے پورا نہ ہوا
ایسے آنی تھی جدائی مجھے معلوم نہ تھا
آج کی رات سازِ دلِ پر درد نہ چھیڑ......آج کی رات......
آج کی رات......سازِ دلِ پر درد نہ چھیڑ......آج کی رات......"

اور جیسے ہی اس نے گانا ختم کر کے آنکھیں کھولیں تو نظر سیدھی خولہ کے چہرے پہ پڑی تھی۔ خفا خفا تاثرات......سرخ چہرہ......بھینچے ہوئے ہونٹ......

"اوہ......!" ہمایوں کے ہونٹ سکڑ کر رہ گئے۔

"واہ......ہمایوں بھائی......واہ......کیا گایا ہے......!" بچہ پارٹی اش اش کر رہی تھی اور وہ اک دم سے تاسف کا شکار ہوا...... تو آج اک جذبہ عیاں ہو ہی گیا تھا...... اس نے ایک ٹھنڈا سانس بھر کر گٹار زمین پہ رکھا اور مسکرا کر بچہ پارٹی کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

☆......☆......☆

"کیا مطلب ہے اب اس بات کا......؟" اس نے شاکڈ ہو کر مزنہ کی بات سنی اور پھر تپ کر پوچھا تھا۔

"اب آدھی رات ہونے کو ہے......یہیں پہ رک جائیں نا......صبح چھوڑ دیں گے آپ کو گھر......"

"مزنہ......فار گاڈ سیک......فار گاڈ سیک میرا دماغ خراب نہ کرو......ابو پھپھو کو کیسے سنبھالیں گے......؟" اسے بے طرح سے تاؤ آ رہا تھا۔

"احمد انکل سے بات کی ہے میں نے......انہوں نے خود کہا ہے کہ اس وقت آپ مت آئیں......صبح صبح چلی جایئے گا۔" مزنہ کی بجائے جواب تبسم نے دیا تھا۔ وہ ترنت پلٹی تھی۔

"اتنی ہائپر کیوں ہو رہی ہیں خولہ......؟" وہ نرمی سے پوچھتی ہوئیں اس تک آئی تھیں۔

"مس مفتی! ابو کو بہت مشکل ہو گی......پھپھو رات میں اٹھ گئیں تو......؟" اب کہ وہ پریشان تھی۔

"فون کیا تھا میں نے......وہ کہہ رہے ہیں کہ آنٹی دوا کے زیرِ اثر سو رہی ہیں اور ابھی رات کے چند گھنٹے ہی تو ہیں......اللہ بہتر کرے گا......" انہوں نے اس کا کندھا تھپتھپایا تھا۔ خولہ چاہ کے باوجود ان کی بات کی نفی نہ کر سکی تھی۔ وہ رکنا نہیں چاہتی تھی مگر

http://kitaabghar.com

رات کے اس وقت جو بھی اسے چھوڑنے جاتا......اس کا جانا اور پھر آنا......دونوں خطرے سے خالی نہ تھے۔بس اسی ایک وجہ کے باعث وہ خاموش ہوگئی تھی۔اس نے بڑی ہی خفا سی نظر مزنہ پر ڈالی اور جواباً مزنہ نے کندھے اچکا دیئے......یوں جیسے کہتی ہو......

''میں کیا کرسکتی ہوں......؟''

☆......☆......☆

وہ کمرے میں جاتے جاتے رک سا گیا۔اس نے اچنبھے سے رسٹ واچ کو دیکھا اور پھر اس وجود کو......وہ ٹیرس کی گرل پہ دونوں کہنیاں ٹکائے کھڑی تھی۔ہمایوں چند لمحے آنکھیں سکیڑ کر اس کی پشت کو تکتا رہا اور پھر جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اس کی طرف بڑھا تھا۔

''آپ سوئی نہیں ابھی تک......؟''خولہ کرنٹ کھا کر مڑی تھی۔

وہ اس سے چند قدم کے فاصلے پہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا۔لہجہ سادہ......انداز عام سا مگر خولہ کو پھر بھی برا لگا۔

''آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں......''خشک لہجے میں کہتے ہوئے اس نے رخ موڑا تھا۔وہ اس کی اس بات پہ زخمی سا مسکرایا۔

''سو جایئے خولہ......!رات بہت ہوگئی ہے۔''نرم سے لہجے میں کہتے ہوئے وہ پلٹنے ہی لگا تھا کہ......

''آپ میرے سامنے نہ آیا کریں ہمایوں......!بڑی مہربانی ہوگی آپ کی......''انداز تپا ہوا......لہجہ گرم اور تاثرات میں غصہ......

ہمایوں نے چونک کر اسے دیکھا......اسی کی بات،اسی کے منہ پہ ماری گئی تھی۔اسے ہنسی آئی......چھپانی چاہی......مگر ذرا سی چھلک ہی گئی۔

''آپ کو میرے لیے اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں......آپ کی فیملی ہے......آپ اس پہ توجہ دیں......''

وہ خاموش رہا......

''مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں نے کب سونا ہے......کب جاگنا......آپ کو آ کر بتانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔''وہ اس پر تپی ہوئی تھی......صاف دکھتا تھا اور کیوں تپی تھی......ہمایوں کو سمجھنے میں دیر نہ لگی تھی......

''اور کچھ......؟''چند لمحوں بعد بڑے ٹھنڈے لہجے میں سوال آیا تھا جو کہ خولہ کو اور تپا گیا تھا۔وہ کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھتی رہی......ہمایوں سر جھکائے منتظر رہا اور پھر اک ٹھنڈا سانس بھر کر سر اٹھایا......ذرا سی دیر اسے دیکھا اور پھر......

''آئی ایم سوری......''کہا اور مڑ گیا۔

http://kitaabghar.com

اور خولہ......وہ شاک سے اسے تکتی رہ گئی تھی۔ وہ معذرت کیوں کی گئی تھی اور کس لیے کی گئی تھی اسے اچھی طرح سمجھ آ گیا تھا۔ ''تو وہ اس کی پروا کرنے سے خود کو باز نہیں رکھ سکتا تھا۔'' تو یہ معذرت اس لیے کی گئی تھی۔ اور چند ماہ بعد اپنی کہی بات کا ثبوت بھی ہمایوں نے پیش کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

''یہ بیٹھے بٹھائے آپ کو ہو کیا گیا ہے ابو......؟'' وہ فرخندہ کو سوپ پلا رہی تھی کہ یکدم ہاتھ روک کر پوچھا تھا اور بے حد حیرت سے پوچھا تھا۔ ہاتھ جو کہ فرخندہ کے منہ کی جانب اٹھا تھا وہیں پہ ساکت ہو گیا تھا اور وہ ششدر دکھتی تھی۔

''اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے......؟''

''ہے......اور بڑی شدید ہے......'' وہ باؤل واپس رکھتے ہوئے بولی۔

''اچھا......کیا ہے؟ ذرا مجھے بھی بتاؤ......؟'' وہ اس سوال پہ زچ نظر آتی باپ کو تکنے لگی۔

''پھپھو......پھپھو کا کیا ہو گا......؟'' چند لمحے بعد وہ فرخندہ کا منہ صاف کرتے ہوئے بولی۔

''اچھا تو اب اس ایک ''وجہ'' کے پیچھے میں تمہاری زندگی برباد کر دوں......؟''

اس کے لبوں پہ ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔

''وہ تو ہو چکی......'' اور پھر وہ بڑبڑائی تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے......چلیں فرض کرتے ہیں کہ میں آپ کی بات مان لوں تو یہ بتایئے پھپھو کو کیسے سنبھالیں گے آپ؟ کیا اب Asylum بھیجیں گے انہیں......؟''

''کیوں......؟ کیا میں ٹٹ پونجیا ہوں......؟ کیا میں اپنی بہن کے لیے میڈ افورڈ نہیں کر سکتا......؟''

''اور آپ کو لگتا ہے کہ میڈ بڑے اچھے سے سنبھالے گی پھپھو کو......؟''

''اوہ کم آن ابو! آپ کو آخر ہو کیا گیا ہے......'' اس نے جیسے بات اڑائی تھی۔

احمد صاحب ماتھے پہ بل لیے اسے تکتے رہے اور وہ ان بلوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک بار پھر سے فرخندہ کو سوپ پلانے لگی تھی۔

''میری بات کان کھول کر سن لو خولہ......! میں تمہیں یوں بٹھا کر رکھنے والا نہیں......آج نہیں تو کل......''

''ابو پلیز......!'' اور وہ لاؤڈ ہوئی تھی۔

''میں نے جتنی زندگی گزارنی تھی......گزار لی......جو جو خوشیاں چکھنی تھیں......چکھ لیں......اب مجھے زندگی سے اور کچھ

بھی نہیں چاہیے......‘‘احمد صاحب چند لمحے اسے تکتے رہے۔

’’ٹھیک ہے......ابھی تم اس بارے میں نہیں سوچنا چاہتیں کوئی بات نہیں......وقت لینا چاہتی ہو......لے لو مگر یاد رکھنا میں تمہیں یوں زندگی ضائع نہیں کرنے دوں گا۔ ہمایوں سے میری بات ہو چکی ہے اور وہ اس سلسلے میں کوشش کرے گا سو تم تیار رہنا......‘‘

اور اگر اسے 440 وولٹ کے کرنٹ کا جھٹکا بھی دیا جاتا نا تو اس کی وہ حالت نہ ہوتی جواب ہوئی تھی۔

’’ہمایوں......!‘‘اس کے لب بنا آواز کے ہلے......تو اس نے کر دکھایا تھا۔ خولہ کے گال تپنے لگے تھے......تو وہ باز نہیں آیا تھا......اسے اچھی طرح سے سمجھ آ گئی تھی کہ اس سب کے پیچھے آخر ہاتھ کس کا تھا۔

☆......☆......☆

’’سر......!‘‘پیون نے دستک دے کر دروازہ کھولا۔

’’ہوں......‘‘اس نے مصروف سے انداز میں سر اٹھایا۔

’’کوئی مسز جہانگیر ہیں......آپ سے ملنے آئی ہیں۔‘‘

’’آ......‘‘اور وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اک جھما کا سا ہوا تھا۔

’’خولہ......!‘‘وہ اچنبھے کا شکار ہوا......اک لمحے کے لیے وہ حاضر دماغ نہ رہ سکا تھا۔

’’آ......بھیجو......بھیجوانہیں اندر......‘‘

’’خولہ......؟ وہ......وہ کیوں آئی تھی......؟ وہ بھی یوں اس کے آفس......‘‘وہ سخت حیرت میں تھا۔ اسی اثنا میں دروازے پہ دستک ہوئی......اس نے جواب نہ دیا......وہ اٹھا اور خود جا کر دروازہ کھولا......خولہ کو اس کی توقع نہ تھی......وہ اک دم پزل سی ہوئی......

’’آیئے پلیز......!‘‘

’’شکریہ......!‘‘ کہتے ہوئے وہ اندر آئی......اس نے جان بوجھ کر مسز جہانگیر کا حوالہ دیا تھا۔ وہ اسے لیے آفس میں ایک طرف رکھے صوفوں کی جانب آیا، اسے بیٹھنے کا کہا اور خود انٹر کام اٹھا کر کہا۔

’’نو فون کالز......نو میٹنگز......‘‘

’’آپ نے مجھے حیران کیا......‘‘ وہ خوشگوار انداز میں کہتا اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ خولہ نے ہونٹ بھینچے......اس نے نظریں اٹھائیں اور اک تیز سی نظر سے اسے دیکھا۔

’’حیران تو آپ نے بھی مجھے کیا ہے......‘‘لہجہ بے حد تیکھا تھا۔

’’سمجھایئے گا ذرا......‘‘اور خولہ دانت پیس کر رہ گئی۔ سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ اس نے ہمایوں پر سے نظریں ہٹائیں۔

''آپ نے کوئی فلاحی ادارہ کھولا ہے یا پھر کوئی میرج بیورو......؟''اور لفظ یوں ادا ہوئے گویا کہ منہ پہ تھپڑ مارتے ہوں۔

ہمایوں کو یک دم ساری رام کہانی سمجھ آئی تھی۔وہ بے اختیار سنجیدہ ہوا تھا۔

''آئی ایم سوری آپ کو برا لگا تو......مگر احمد انکل نے مجھ سے بات کی تھی اس لیے میں نے وہ پرپوزل بھجوایا تھا۔''

''اوہ پلیز......احمد انکل نے بات کی تھی یا آپ نے احمد انکل کو پٹی پڑھائی تھی......؟''وہ بل کھا کر بولی۔اور اس کے یوں کہنے پہ وہ بے اختیار ہنس پڑا۔

''ایکسکیوز می......!میں کوئی چھاچھا کٹنی نہیں......''

''آپ ہیں......''وہ غصے سے زور دے کر بولی......اور وہ اور زور سے ہنس دیا۔

اور خولہ......وہ کھلے منہ......اور پھیلے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔وہ سخت غصے میں تھی اور اپنا غصہ دکھا بھی رہی تھی اور وہ......وہ ہنس رہا تھا۔آخر مسئلہ کیا تھا اس کے ساتھ......؟اسے اور طیش آیا......اس نے بیگ سنبھالا،کھڑی ہوئی......

''ہمایوں صاحب!میرے معاملات اور میری زندگی سے دور رہیں......''

اس کی ہنسی ایک دم غائب ہوئی......ماتھے پہ اک بل نمودار ہوا۔

''I won't let you to fry your life......''

اور خولہ کے چہرے پہ حیرت ہی حیرت پھیل گئی اور اس نے سخت سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا......تو......تو کیا وہ کہہ رہا تھا کہ ہاں!وہ اس کے معاملات میں دخل اندازی کرے گا......ہاں!وہ اس کی زندگی سے دور نہیں رہے گا......

''کیوں......؟کیوں......؟یہ میری زندگی ہے میں جو چاہے کروں......جیسے چاہے اسے گزاروں......؟Who the hell are you''وہ اب سخت حیرت سے......رک رک کر پوچھتی تھی۔

''اس بات کے جواب میں......میں آپ کو لیکچر دے سکتا ہوں......بوڑھے باپ کا حوالہ دے سکتا ہوں......لمبی عمر کیسے گزرے گی؟یہ سوال اٹھا سکتا ہوں مگر میں یہ نہیں کہوں گا......میں یہ کہنا نہیں چاہتا......بات بس یہ ہے کہ میں آپ کو اپنی زندگی خراب کرتے دیکھ ہی نہیں سکتا......''

خولہ اتنی حیرت میں تھی کہ وہ اس کی آخری کہی بات کو سمجھ ہی نہ سکی تھی۔

''آپ کو لگتا ہے کہ جہانگیر کے بعد......میں اپنی زندگی میں کسی کو space دے سکتی ہوں......؟آپ کو لگتا ہے کہ اب میں یہ کر سکتی ہوں......؟''

''نہیں......یہ مشکل ہے......میں جانتا ہوں......لیکن موو آن تو کریں......وقت کے ساتھ......''

''اوہ پلیز......!''خولہ نے ہاتھ کے اشارے سے ہونہہ کرتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔

''مجھے کسی سے شادی نہیں کرنی......میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔''وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

''اوکے......صحیح......''اس کا انداز......خولہ رک سی گئی۔

''یعنی کہ آپ باز نہیں آئیں گے؟''اسے پھر تپ چڑھی۔ہمایوں نے سر جھکایا......مسکراہٹ ضبط کی اور خولہ بے بس ہوئی۔

''آخر کیوں......؟''وہ زچ ہوئی۔اور اس سوال پہ وہ ٹھہر سا گیا۔اس سارے میں پہلی بار اس نے براہ راست خولہ کو دیکھا......

''کیوں......؟''اور دہرایا......پھر نظر جھکا لی......

''کہا نا کہ میں آپ کو یوں اپنی زندگی خراب کرتے نہیں دیکھ سکتا......''نرم لہجہ......دھیما انداز......اور جھکی نظر......خولہ اب سمجھی......

اس کا دل دھک کر کے رہ گیا اور رنگ فق......

''آپ خوش رہیں گی تو مجھے سکون رہے گا......''

اور اس کا دوسرا کہا جانے والا جملہ......خولہ وہاں سے سر پہ پیر رکھ کر بھاگی تھی۔

اس کے جانے کے کئی لمحے بعد وہ یوں ہی بیٹھا رہا......صوفے پہ سر ٹکائے......آفس کی کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا......

''تمہیں یوں تکلیف میں دیکھنا آسان نہیں ہے......تمہاری خوشی چاہیے اور بس......''پھر وہ ہلکے سے بڑبڑایا تھا۔

☆......☆......☆

''مزنہ......!''

''آپی کیا ہوا......؟''وہ فون کے دوسری طرف بھی خولہ کی آواز میں موجود سراسیمگی کو بھانپ سکتی تھی۔

''تم......تم ہمایوں کو مت بتانا ......کبھی بھی مت بتانا وہ بات جو کہ اک راز ہے......اور راز چنگاری ہے......چنگاری......''

''اوہ گاڈ......آپی آپ کو پھر سے دورہ پڑ گیا ہے......نہیں بتائی یہ بات اور نہ بتاؤں گی......کم آن کیا ہو گیا ہے آپ کو......''مزنہ نے سخت بے زار ہو کر اس کی بات کاٹی......اسی بیزاریت بھرے انداز میں اپنی بات کہی اور فون بند کر دیا تھا۔

''اوہ میرے خدا......!تمہیں کیسے سمجھاؤں مزنہ......کیسے......؟''اور خولہ بہت بے بس تھی۔

☆......☆......☆

اس کے بعد چند ماہ تک تو یہ بات نہیں ہوئی......نہ ہی اس موضوع کو چھیڑا گیا مگر چند ماہ بعد پھر سے وہ ہی سب ہونے

http://kitaabghar.com

لگا۔اب کی بار اس نے مزنہ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

''بات سنو مزنہ......!'' وہ سخت برہم تھی۔

''جی......!''

''اپنے شوہر کو کہو شادی کا دفتر کھول لے اور یتیم بچیوں کی شادی کروانا شروع کر دے......یقین مانو وہ جھولی بھر بھر دعائیں دیں گی......میرے سے تو بد دعا ہی لے گا پھر......''

''ہا......آپ بد دعا دیں گی ہمایوں کو......؟'' لوخولہ کیا کہہ رہی تھی اور اسے کیا فکر چڑھ دوڑی تھی۔

''مزنہ......!'' دانت پیستے ہوئے اس نے کہا۔

''کیا ہوگیا ہے آپی......؟ بی پریکٹکل یار......کیا اب ساری عمر ایسے ہی گزار دیں گی......؟'' اور مزنہ کو یہ کہتے سن کر ہمایوں نے جانا کہ دوسری طرف خولہ تھی۔وہ دونوں اس وقت لان میں آمنے سامنے بیٹھے شام کی چائے انجوائے کررہے تھے۔

ہمایوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے فون دینے کا کہا۔

''ہم سب آپ کی خوشی چاہتے ہیں خولہ......!'' اور وہ فون پہ اس کی آواز سن کر اک لمحے کے لیے چپ ہوئی۔

''میں بیوہ ہوں ہمایوں صاحب......!اور بیوہ کی مرضی کے بنا اس کا نکاح نہیں کیا جا سکتا......سن رکھیں آپ......'' یہ کہہ کر اس نے ٹھک سے فون بند کیا تھا۔ہمایوں نے اک گہرا سانس بھر کر فون مزنہ کو پکڑایا۔

''کیا ہوا......؟''

''فون بند کر دیا......اچھا نہیں لگا شاید انہیں......''

''شاید نہیں یقیناً......'' مزنہ ہنسی۔

''وہ بری طرح سے تپی ہوئی تھیں۔''

''وہ ناحق ضد میں آ رہی ہیں۔''

''ہاں......ہیں تو آپی بہت سلجھی ہوئیں مگر پتا نہیں کسی کسی بات پہ ان کی سوئی اٹک جاتی ہے......''

''اچھا......مثلاً......؟'' وہ نرمی سے مسکرا کر بولا......

مزنہ نے رک کر اک لمحے کے لیے اس کو دیکھا......اتنا پیارا شخص ہے......یہ بھلا کسی کو تکلیف دے سکتا ہے......نہیں......وہ سوچتے ہوئے مسکرائی۔

''تم نے بتایا نہیں......؟'' ہمایوں چائے کا سپ بھرتے ہوئے بولا۔

http://kitaabghar.com

''بتاتی ہوں...... بڑے راز کی بات...... بقول آپی......'' اور وہ یہ کہہ کر کھل کر ہنسی......

تو چنگاری کو پھونک مار کر سلگانے کے لیے تیار کیا جانے لگا تھا......

''جب سے میری شادی ہوئی ہے نا...... آپی کی سوئی اسی بات پہ اٹکی ہوئی ہے...... بقول ان کے یہ بات جو کہ ان کے نزدیک راز ہے...... آپ کو نہ بتایا جائے......''

''اچھا...... ایسا کیا ہے......؟'' اس نے جھک کر کپ سا سر میں رکھا۔

''وہ یہ ہے کہ میں............'' مزنہ کہہ رہی تھی اور...... اور زور کی ہوا چلی...... راکھ اڑی...... چنگاری یکدم دہکنے لگی...... آگ کو رستہ دینے لگی۔

''کیا......؟ کیا کہا تم نے......؟'' وہ بدترین حیرت کے ساتھ مزنہ کو دیکھتا تھا اور......

اور نار اپنے پورے معنی کے ساتھ...... اک پرزور دھماکے کے ساتھ بھڑک اٹھی تھی۔

☆......☆......☆

''کیا...... کیا کہا تم نے......؟''

''میں اور خولہ سگی بہنیں نہیں ہیں......'' مزنہ نے کہا اور وہ اک جھٹکے سے سامنے کو جھک آیا۔ مزنہ نے اس کی حیرت سے حظ اٹھایا اور اسے رفتہ رفتہ سب بتاتی گئی...... اور جوں جوں وہ بتاتی جا رہی تھی نار بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔

''آپی کو ایسے محسوس ہوتا تھا کہ آپ لوگ اس بات کو مائنڈ کریں گے۔ وہ میرے ابو کی...... یونو......'' اور مزنہ نے کہہ کر کندھے اچکائے۔ وہ اور بھی کچھ کہہ رہی تھی مگر ہمایوں...... وہ کہاں سنتا تھا...... اس کا دماغ بھک سے اڑ چکا تھا...... ماؤف ہو رہا تھا...... وہ جیسے اپنی بنیادی صلاحیت سے ہی محروم ہو رہا تھا...... سوچنے کی...... سمجھنے کی...... سماعتوں نے بھی جیسے آواز کو سننے سے انکار کر دیا تھا۔ ذہن اگر سوچتا تھا تو فقط اک بات......

''خولہ اور مزنہ...... سگی بہنیں نہیں ہیں......؟ نہیں ہیں......؟''

''اوہ میرے خدا......!'' اس نے بے اختیار دونوں ہاتھ منہ پہ پھیرے...... اس کا چہرہ تپ رہا تھا۔ رنگ بدل رہا تھا۔

''ہمایوں! آپ پریشان ہو گئے ہیں کیا......؟'' وہ اس کی بدلتی رنگت کو دیکھ کر خود بھی پریشان ہوئی۔

کیا اس نے صحیح کیا تھا......؟

''ہاں...... آ...... نہیں...... بس حیرت ہے......'' وہ چونکا۔ اور پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد کہہ سکا۔

''اوہ اچھا......'' وہ ریلیکس ہوئی اور پھر سے وہیں سے شروع ہوئی کہ جہاں سے داستان چھوڑی تھی۔ وہ بلاتکان بولتی جا رہی تھی...... وہ چند لمحے غائب دماغی سے سنتا رہا اور پھر یک دم اپنی جگہ چھوڑی۔

''کیا ہوا......؟''مزنہ کی چلتی زبان کو بریک لگی اور حیرت سے استفسار کیا گیا۔

''کچھ نہیں......کچھ......ایک کام......کام یاد آ گیا ہے......'' بے ربط بولتا وہ اندر کی جانب بڑھا تھا۔مزنہ حیرت سے اس کی پشت تکتی رہ گئی۔

''یہ کون سا کام تھا جو یوں اچانک یاد آیا تھا۔''

☆......☆......☆

اس کے ہاتھ سختی سے اسٹیئرنگ پہ جمے تھے۔جبڑے بھینچے ہوئے، تاثرات جامد......گردن کے پاس سے رگیں پھولی ہوئیں اور وہ بے حد ریش ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ذہن میں اک ہی جملہ بار بار غوطے کھا رہا تھا۔

''خولہ اور میں سگی بہنیں نہیں......نہیں......نہیں......''اس کے تاثرات اور جامد ہو جاتے......ہاتھوں کی سختی میں اور اضافہ ہوتا اور بے ساختہ اس نے ایکسیلیٹر پہ دباؤ بڑھا کر اک خطرناک موڑ کاٹا۔

تو نار بھڑک چکی......اپنی پوری شدت کے ساتھ......اپنے پورے معنوں کے ساتھ جھلسا رہی تھی......سلگا رہی تھی اور اس کا وجود بھڑ بھڑ جلتا......راکھ میں بدلتا جا رہا تھا......

گاڑی اک جھٹکے سے رکی اور وہ اگلے کئی لمحے یوں ہی ساکت......اسٹیئرنگ پہ ہاتھ جمائے بیٹھا رہا......نظریں اک ہی جگہ فوکسڈ......ہونٹ بھینچے ہوئے اور پھر وہ یک دم دروازہ کھول کر باہر آیا......اک جھٹکے کے ساتھ دروازہ بند کیا اور پھر اس نے احمد صاحب کے گھر کی گھنٹی بجائی تھی۔

☆......☆......☆

''ہمایوں......! کیسے ہو بیٹا......؟''احمد اسے دیکھ کر بے اختیار خوش ہوئے اور وہ ان کے اس پرتپاک انداز کے جواب میں اک مسکراہٹ تک نہ دے سکا۔اس کے تاثرات جیسے ٹھٹھرے ہوئے تھے۔

''کیسے آنا ہوا......؟''

اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور چند لمحے دیکھتا رہا۔

''خولہ......خولہ سے بات کرنی ہے......پرسنل ایشو......''اور انداز حد سے بڑھ کر سنجیدہ......احمد صاحب حیران ہوا ہی چاہتے تھے کہ یک دم کلک ہوا......خولہ شادی کے لیے نہیں مان رہی تھی اسی سلسلے میں بات کرنے آیا ہوگا......انہوں نے خود اسے کہا تھا خولہ سے بات کرنے کو......

''اوہ......اچھا......اچھا......بھیجتا ہوں......''وہ کہہ کر خولہ کو بلانے کے واسطے مڑے۔

''انکل......!''وہ رک سے گئے۔

http://kitaabghar.com

''مجھے اکیلے میں......''

''ہاں، ہاں......میں سمجھتا ہوں......'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولے۔

''ہمایوں آیا ہے ملنے......'' اطلاع پہنچائی گئی۔

''مجھ سے......؟'' وہ حیران ہوئی۔

''ہاں......!''

''کیوں......؟'' حیرت اور بڑھی۔

''بات کرنا چاہتا ہے تم سے......''

''مجھے نہیں کوئی بھی بات کرنی......''

''وہ آیا ہے......تمہیں بلا رہا ہے اور میں جا کر کہہ دوں کہ تمہیں کوئی بات نہیں کرنی......اس گھر کا داماد ہے وہ خولہ......! کوئی عزت ہے کہ نہیں......''

''داماد ہے تو داماد رہے......پرسنل معاملات میں کیوں گھس رہا ہے......'' وہ چڑی۔

''میں نے ہی کہا ہے اسے......اجازت دی ہے۔''

''تو پھر آپ کریں نا بات......مجھے کیوں انوالو کرتا ہے......'' اور خولہ بدتمیز ہوگئی۔

''خولہ......!'' احمد صاحب غصے سے بولے تھے۔ اور اسے ان کے غصے پہ غصہ آیا۔

''اٹھو اور جاؤ......اس کی بات سنو......! صرف سننی ہی تو ہے......کوئی گن پوائنٹ پہ نہیں منوائے گا تم سے......'' ان کے لہجے میں سختی تھی۔

''وہ منوا بھی نہیں سکتا......'' وہ پاؤں میں چپل اڑستے تنک کر بولی۔

''اور ابو......آپ ہر دفعہ میرے ساتھ زبردستی کرتے ہیں۔'' غصے میں کہہ کر وہ تو نکل گئی۔ احمد صاحب کے چہرے پہ سایہ سا گزرا۔

''چائے پانی کا پوچھنا اس سے......'' پھر سر جھٹک کر انہوں نے پیچھے سے آواز لگائی تھی۔

☆......☆......☆

وہ اتنی تپی ہوئی تھی آج اس شخص پہ کہ کھری کھری سنا دینا چاہتی تھی۔ وہ بے حد برہم موڈ کے ساتھ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی تھی۔ دروازے میں رک کر اک کڑی......قہر برساتی نظر سے اسے دیکھا اور بڑے ہی تند مزاج کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ وہ ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے......صوفے کے بازو پہ کہنی ٹکائے......کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ ہاتھ کی مٹھی بند ہونٹوں پہ دھری تھی۔

''جی فرمائیے......!'' انداز سخت، لہجہ برہم اور مزاج تیز......

اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ چند لمحے دیکھتا رہا براہ راست......اور اس کی نظر میں کچھ تھا......آج کچھ تھا......خولہ کے بدن میں سنسناہٹ سی اتری تھی۔ اس کی سرخ سلگتی آنکھیں......وہ جلتی ہوئی نظر......وہ بے اختیار دھیمی پڑی۔

''ہمایوں......!'' اس نے اچنبھے سے پکارا۔

''جھوٹ......جھوٹ بولا مجھ سے؟'' اور خولہ ناسمجھ ہوئی۔

''جی......؟''

''آپ اور مزنہ......!''

خولہ نے آنکھیں سکیڑیں۔ بھنوؤں کے درمیان ایک بل در آیا۔ وہ کیا کہنے والا تھا اور خولہ مر کر بھی گمان نہ کر سکتی تھی کہ وہ کیا کہنے والا تھا۔

''بہنیں نہیں ہیں نا......!'' اور خولہ کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ منہ پہ ہاتھ رکھے بے اختیار دو قدم پیچھے کو ہٹی تھی۔

نار بھڑک اٹھی......اس کی تمام تر احتیاط کے باوجود......نار بھڑک اٹھی تھی۔ وہ دیکھ سکتی تھی......سامنے کھڑے شخص کی آنکھوں میں بھڑ بھڑ جلتے شعلے......

☆......☆......☆

''آپ نے مجھے چیٹ کیا......'' وہ اک قدم آگے بڑھا......لہجہ کیسا سرد تھا نا......

خولہ سے تھوک نگلنا مشکل ہوا۔

''میں کس قدر عذاب سے گزرا ہوں......جان سکتی ہیں آپ......؟ اپنی بیوی کی بہن سے محبت......آخ......کس قدر ذلت میں ڈوبا ہوا پایا میں نے خود کو......سوچ سکتی ہیں آپ......؟'' اور خولہ نے بے اختیار آنکھیں بند کیں۔

''کم از کم اس اذیت سے تو نجات مل سکتی تھی مجھے یا کہ نہیں......؟''

اور آواز پر درد مگر سخت تھی۔

''اس مشقت کی روح کی گرد بھی آپ نہیں پا سکتیں کہ جس مشقت سے ایک شادی شدہ عورت کے لیے میں نے دل میں کوئی بھی جذبہ ابھرنے سے روکا......میں آپ کے پیچھے نہیں آیا......آپ سے کچھ کہا تک نہیں......کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا......وہ راہ تک بدل لی کہ جو راہ آپ کی طرف جاتی تھی اور پھر......پھر آپ نے کیا کیا......؟

اپنی کزن کو بہن بنا کر مجھ سے بیاہ دیا......''

''This is Inhuman......Murderous......''

اور ضبط کی وجہ سے اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے، چہرہ سرخ تھا۔

''آپ کو ترس نہیں آتا مجھ پر......؟'' وہ یوں بولا کہ جیسے خولہ کے فعل پہ حیران ہو......بہت ساری حیرت ہو.......

''ہیں......؟ ذرا سا بھی نہیں آتا......؟'' وہ اک قدم اور آگے بڑھا۔ اور خولہ کے رونگٹے کھڑے ہوئے...... چند لمحے خاموشی کو دان ہوئے۔ وہ اس کے چہرے پہ نظریں جمائے کھڑا تھا اور وہ نظریں جھکائے......

''آئی ایم سوری ہمایوں......!''

''واٹ ربش......!'' اور وہ تڑخ کر بولا۔

''مزنہ کی تب بہت بری کنڈیشن تھی اور میں......''

''میری کنڈیشن کیوں نظر نہیں آئی آپ کو......؟ کیوں......؟''

اور وہ پہلی بار بے بس نظر آیا۔

خولہ نے ایک بار پھر سے آنکھیں بند کیں۔

''بہرحال......اب کچھ نہیں ہوسکتا......جو ہو گیا...... جو گزر گیا......اس پہ کیا کیا جا سکتا ہے......میری وجہ سے آپ کو تکلیف پہنچی......اس کے لیے میں ساری عمر معذرت خواہ اور شرمندہ رہوں گی......''

اس کے یوں کہنے پہ ہمایوں کے ہونٹوں پہ زخمی سی مسکراہٹ ابھری۔

''I didn't get a single pleasure from my life...... Khola!''

''میں نے کہا نا......!''

''ہشش...... خاموش......!'' برہم لہجہ......تحکم بھرا انداز......اس نے بات کاٹی تھی۔ خولہ نے حیران نظروں سے اسے تکا۔

''You have to heal the pain......''

اور ان نظروں کی حیرت کچھ اور بڑھی......وہ کیا کہہ رہا تھا۔

''You have to......'' اور وہ اک تلخ مسکراہٹ اس کی طرف اچھال کر باہر کو نکل گیا تھا۔ خولہ نے اپنی حیران حیران نظروں سے اسے جاتا دیکھا تھا۔ وہ کیا کہہ رہا تھا......کیا......؟ اور جب سمجھ آیا تو......تو...... وہ منہ پہ ہاتھ رکھ کر لڑکھڑا کر صوفے کے بازو کا سہارا لیتے ہوئے......صوفے پہ گر سی گئی تھی۔

''یا میرے خدا......!'' اب کی بار اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپایا تھا۔ وہ کیا کہہ کر گیا تھا۔ کیا......؟

کمال کرتے ہو صاحب! زوروں کی نار بھڑکی تھی اور تپش بھی نہ پہنچتی......؟

یہ بھلا اب کیسے ہوتا......؟ کیسے ہوتا......؟

☆......☆......☆

ہر آہٹ پہ دل کانپ جاتا تھا۔فون کال بیل پہ وہ سانس روک لیتی......کال بیل کی آواز پہ ساکت ہو جاتی......اسے بری طرح سے دھڑکا لگا ہوا تھا......وہ......وہ کچھ کر ڈالے گا......کچھ......اس کے دن خوف کے معنی اوڑھے گزرتے اور راتیں پریشان......ہر طرف خاموشی......سناٹا......اور اس سنّاٹے میں ابھرنے والی ہر آواز اسے بے طرح سے چونکاتی......ڈراتی تھی......وہ وارن کر کے گیا تھا نا......کہیں......کہیں وہ مزنہ کو......اوہ میرے خدا......یا خداوندا ایسا تو نہ ہو......ایسا تو بالکل بھی نہیں......مزنہ مر جائے گی۔وہ تو......وہ تو......نہیں......نہیں......خداوندا ایسا نہ ہو۔اس کی دعائیں لمبی ہونے لگیں......سجدے طویل تر......

وہ ہر وقت عجب بوکھلائی بوکھلائی سی رہتی تھی۔ہر کام الٹا پڑ رہا تھا......کچھ بھی ٹھیک ہوتا تھا نہ سیدھا......آہ......یہ کیسی سزا تھی......؟ کیسی......؟ چند دن اور گزرے تو ذرا سکون آیا......کہ وقتی غصہ تھا اس کا......اتر گیا ہوگا......یوں اپنی شادی شدہ زندگی برباد یا خراب کرنے سے تو رہا اب......وہ خود کو دلائل دینے لگی......طرح طرح کی تسلیوں سے خود کو بہلانے لگی......کچھ ہونا ہوتا تو ہو چکا ہوتا......وہ اتنا سلجھا......نفیس انسان......بھلا کیونکر ایسا کرے گا؟ نہیں......نہیں......ایسا کیسے ہو سکتا ہے......نہیں ہو سکتا۔

تمام تر دلائل اور تسلیوں کے نتیجے میں اس کے دل کو لاحق وہم میں کمی تو آئی مگر دھڑکنوں کی تہہ میں اک دھڑکا ابھی بھی موجود تھا......یوں جیسے کچھ نہ کچھ تو ہوگا ہی......کچھ نہ کچھ......

اور اس دن......

وہ پھپو کو لے کر باہر صحن میں آئی تھی......تازہ ہوا کے لیے......احمد صاحب بھی وہیں موجود کیاریوں کو دیکھ رہے تھے کہ اچانک کال بیل کی آواز گونجی......وہ بے طرح سے ڈری......اور پھر ساکت ہو گئی......

احمد صاحب دروازے پہ دیکھنے کے لیے اٹھے۔ان کے ہر بڑھتے قدم کے ساتھ اس کا دل ایک بیٹ مس کرتا تھا۔اور......اور......پھر جو چہرہ اسے دکھائی دیا تھا اس نے خولہ کی روح تک کھینچ کر رکھ لی تھی۔وہ ساکت......سفید ہوتے چہرے کے ساتھ اسے تکتی رہ گئی تھی۔

☆......☆......☆

''آپ کہاں گئے تھے......؟'' اور اس سوال پہ اس نے مزنہ کو دیکھا۔وہ پریشان سی نظر آتی تھی۔ہمایوں نے تھکن بھرا اک سانس لیا۔وہ یقیناً اس کے یوں اٹھ کر چلے جانے سے پریشان ہوئی تھی۔

''بتایا تو تھا کام سے گیا تھا۔'' اسی تھکے تھکے انداز میں اس نے چابیاں کارنس پہ رکھی تھیں۔

"چائے لاؤں......؟"

"نہیں پلیز......! میں اسٹڈی میں جا رہا ہوں۔ کوئی ڈسٹرب نہیں کرے......" وہ کہہ کر چلا گیا اور مزنہ پریشان سی اس کی پشت کو تکتی رہی اور پھر اس ایک دن کے بعد مزنہ نے ہمایوں کو بے حد چپ چپ......الجھا اور سنجیدہ پایا۔ وہ پوچھ پوچھ کر تھک چلی کہ آیا اسے اس انکشاف سے کوئی ایشو ہے......؟ کوئی مسئلہ......کوئی پرابلم یا پھر کوئی الجھن......؟ اور وہ ہر بار بڑی وضاحت سے اس کی نفی کرتا......اپنے موڈ کو کام کے اسٹریس سے جوڑ دیتا......کاروبار کے مسائل کہہ کر ٹال دیتا اور مزنہ......وہ کبھی مطمئن ہو جاتی اور کبھی اس کا اطمینان ادھڑنے سا لگتا......یہ کیسی بے نام سی بے سکونی تھی جو اس کی شادی شدہ زندگی میں در آئی تھی۔

کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا کہ آپی ٹھیک کہتی تھیں۔ یہ راز واقعی اِک چنگاری تھا جس نے بے سکونی کی نار بھڑکا رکھی تھی۔ مزنہ کو طرح طرح کے وہم تنگ کرنے لگے۔ اسے محسوس ہوتا کہ ہمایوں اولاد نہ ہونے کی وجہ سے ڈسٹرب ہے سو اسی لیے اس طرح پریشان سا دکھتا ہے۔ کبھی اسے محسوس ہونے لگتا کہ وہ اس سے بیزار ہو گیا ہے اور تو اور اب ہمایوں کا اتنا سنجیدہ رویہ گھر والوں کی نظر میں آ گیا تھا۔

زہرہ اور تبسم دونوں ہی مزنہ سے اس بارے میں سوال کر چکی تھیں......اور وہ......ظاہر ہے، وہ مزید پریشان ہونے کے علاوہ اور کیا کر سکتی تھی۔ اس کی بڑھتی پریشانی کو دیکھ کر ہمایوں نے اسے گھر جانے کا کہا تا کہ وہ فریش ہو سکے۔ مزنہ راضی ہو گئی اور ہمایوں اسے احمد انکل کے گھر چھوڑنے آیا تھا۔

☆......☆......☆

وہ دونوں شام کی واک کے لیے نکلے تھے اور دونوں ہی بے حد خاموش تھے۔ فضا میں خنکی سی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی بارش ہوئی تھی تو ہر چیز نم نم سی تھی۔ بھیگی سڑک......نم، بھیگے پیڑ پودے......فضا میں بسی پھولوں کی خاص مہک......ابر آلود موسم، وقفے وقفے سے گرجتا بادل......وہ اک خوشگوار دن تھا اور وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے بے حد چپ......

"بہت خاموش خاموش رہنے لگے ہو ہمایوں......!"

"نہیں تو......آپ کو محسوس ہوتا ہے آپی......!"

"آ......ہاں......جھوٹ نہیں......" اور وہ جواباً پھیکا سا مسکرا دیا۔

"میں تم سے ایک سیریس ایشو پہ بات کرنا چاہتی تھی۔ ان فیکٹ امی مزنہ سے کرنا چاہتی تھیں مگر میں نے منع کر دیا......یو نو مائیں ذرا پوزیسو ہو جاتی ہیں اولاد کی اولاد کے بارے میں......میں نے سوچا ایسے ہی مزنہ ہرٹ نہ ہو جائے تو میں تم سے بات کروں......" اور وہ ٹھہر گیا......اچنبھے سے رک کر انہیں دیکھا......تبسم نے اس کی نظروں کی حیرت کو اِک گہرا سانس بھر کر دیکھا۔

"بہت ٹائم گزر چکا......آخر تم کچھ تو بتلاؤ پرابلم کیا ہے......؟ امی سے اب یہ نا قابلِ برداشت ہوتا جا رہا ہے۔"

اور وہ ان کی بات سن کر خاموش سا ہو گیا تھا۔ ہر بار کی دفعہ اس نے اِس بار یہ نہیں کہا تھا کہ اللہ کی طرف سے دیر ہے۔ اس بار وہ چپ ہو گیا......اتنا چپ کہ تبسم کو اسے متوجہ کرنا پڑا۔

''ہمایوں......!'' انہوں نے نرمی سے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ مگر اس نے مڑ کر نہ دیکھا......وہ سیدھا کسی نقطے کو، کسی خلائی مقام کو گھورتا رہا۔

''آپ جانتی ہیں نا میں کسی سے محبت کرتا ہوں......؟'' اور تبسم کو لفظ ''ہوں'' نے حیران کیا۔

''تو کیا اب بھی......؟'' حیرت نے 2 کے ہندسے سے ضرب کھائی اور وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے سیدھا تکتا رہا۔

''تو......؟ اس کا یہاں کیا ذکر......؟ میں تم سے......''

''آپ جاننا چاہیں گی وہ کون تھی......؟'' ایڑیوں کے بل گھوم کر اس نے تبسم کی بات کاٹی......تبسم کا منہ کھلا......

''یا میرے خدا......! اس افسانے کا اِدھر کیا ذکر......؟''

''کون......؟'' ان کے منہ سے لاشعوری طور پر نکلا......

وہ کئی لمحے ان کے چہرے کو تکتا رہا اور پھر بولا......

''خولہ......!''

نام اس کے منہ سے ادا ہوا......سرگوشی کی صورت چاروں اور پھیلا......اور بادل زور سے گرجے......بجلی بری طرح سے کڑکی اور کڑک کر جیسے وہ تبسم کے وجود پہ آن گری تھی۔

☆......☆......☆

وہ مزنہ تھی......

''اکیلی آئی ہو......؟'' ابو پوچھ رہے تھے۔

''نہیں......! ہمایوں چھوڑ گئے ہیں......'' وہ کہہ رہی تھی اور خولہ کا رکا سانس جاری ہوا۔ اس نے تکلیف سے سانس بھری اور گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر دوہری ہو گئی تھی۔

اور اس کا دوسرا ابھرنے والا احساس سخت غصے کا تھا۔ وہ سیدھی ہوئی......غضبناک نظروں سے اسے گھورا......تیزی سے اس کی طرف بڑھی اور اس کا ہاتھ کھینچ کر اندر کی طرف لے جانے لگی۔

''آپی......! آپی......! اوہ ہو......کیا ہوا......اف......آ......آؤچ......'' وہ اس کے ساتھ ساتھ چیزوں سے ٹکراتی، گھسٹتی جا رہی تھی۔ احمد صاحب ابھی تک خولہ کے فعل کو حیرت سے تک رہے تھے۔

''خولہ......! کیا ہو گیا......؟'' انہوں نے آواز لگائی مگر وہ سنتی نہ تھی۔

''ادھر مروز راتم......'' اس نے پیچھے سے کھینچ کر لا کر مزنہ کو بیڈ پہ پٹخا اور پھر دھاڑ سے دروازہ بند کیا تھا۔

''اچھا ہوگا آپس کا کوئی مسئلہ......'' چند لمحے حیرت کی زد میں رہنے کے بعد احمد صاحب پھر سے اپنے کام کی طرف چل دیئے۔ فرخندہ کو آج خاموشی کا دورہ پڑا تھا سو وہ چپ چاپ...... ہاتھ کو گود میں رکھے کرسی پہ بیٹھی تھیں۔

''منع کیا تھا نا تمہیں......کیا تھا یا نہیں......؟ وہ غرائی۔

اور مزنہ......اس کا منہ کھلا......آنکھیں پھٹیں۔

''ہمایوں آئے تھے......؟''

''ہاں......!''

''کیا شکایت کرنے......؟'' لو جی ہمیشہ کی طرح اسے اپنی فکر لاحق ہوئی۔

خولہ جھنجھلائی۔

''شٹ اپ......! میری بات کا جواب دو......''

''ہاں میں نے بتا دیا پر آپی ہمایوں نے مجھے تو کچھ نہیں کہا......'' وہ آپی کے یوں تلملانے پہ حیران حیران سی تھی۔

''ضروری تو نہیں ہر بات تمہیں کہنے والی ہو......'' وہ بل کھا کر بولی۔

''تو آپ دونوں کو کچھ کہا......؟''

''مزنہ......!'' اب کی بار خولہ بے طرح سے زچ ہوئی اور زچ ہو کر دھاڑی تھی۔

''تم سے اک بات کہی تھی راز رکھنے کو......وہ بھی نہیں ہوا تم سے......اب کچھ ہوا نا تو بھگتنا پھر......'' طیش سے لفظ منہ سے صحیح ادا نہ ہوتے تھے۔ ناک کے نتھنے پھولے ہوئے......آنکھوں سے قہر ٹپکتا......یوں جیسے اس کا بس چلے تو وہ مزنہ کا گلا ہی دبا دے۔

''مجھے سمجھ نہیں آ رہی آپ کو......''

''شٹ اپ......!'' اور وہ اس کی بات کاٹ کر......تھپڑ مارنے والے انداز میں بولی اور کمرے سے باہر......اور جاتے جاتے دروازہ پوری قوت سے بند کرنا نہیں بھولی تھی۔ اور مزنہ حق دق...... ششدر وہیں کی وہیں بیٹھی رہی......آخر ہوا کیا تھا......؟ وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ سمجھتی بھی تو آخر سمجھتی کیسے......؟

☆......☆......☆

''آپ ابّو کی طرف گئے تھے؟'' وہ چونکا اور اخبار سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔ مزنہ اس کے سامنے بیٹھی پوچھ رہی تھی۔ وہ الجھی سی دکھتی تھی۔

''ہاں! گیا تھا۔'' وہ اخبار کو جھٹکا دے کر سیدھا کرتے ہوئے بولا۔

''کیوں......؟ کیا شکایت کرنے......؟''

''نہیں...... یہ پوچھنے کہ یہ بات چھپائی کیوں......؟ ایسی چھپانے والی بات تو کوئی نہ تھی۔'' اس نے بات بنائی۔

''اوہ...... اچھا...... پھر آپی کیوں اتنے غصے میں تھیں......؟'' وہ اسی طرح الجھی الجھی اٹھی تھی۔ ہمایوں کے تاثرات خوامخواہ میں ہی چٹخے تھے۔

☆......☆......☆

تبسم کالنگ کے الفاظ نے اسے حیران نہیں کیا۔ وہ اکثر اس سے بات چیت کرتی رہتی تھیں۔

''السلام علیکم......!'' اس کا لہجہ خوشگوار تھا۔

''وعلیکم السلام......! کیسی ہیں خولہ......؟'' خولہ کو ان کے لہجے میں غیر معمولی سنجیدگی محسوس ہوئی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ آپ ٹھیک ہیں......؟'' اور جواب میں اِک گہری سانس سنائی دی۔

''ٹھیک ہوں......'' اور ان کا دھیما سا جواب۔

''خیریت مس مفتی......؟''

''خیریت ہی ہے......''

''تو پھر......؟'' اور وہاں خاموشی سی پھیل گئی تھی۔

''ہمایوں نے تمہیں پرپوز کیا ہے خولہ......!''

''اور وہ خاموشی ہی تھی جو کہ سناٹے کی شکل میں اک دھماکے کی طرح اس کے پورے وجود میں پھیلی تھی۔

کتنے ہی لمحے...... کتنی ہی دیر وہاں سناٹا رہا......

''ہمایوں سے کہیں میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔''

اور پھر بڑے ہی ٹھنڈے لہجے میں کہہ کر اس نے فون بند کر دیا تھا۔

ناول **نار** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 5 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

http://kitaabghar.com
fb.com/sehar.sajid.official kitaabghar.com

قسط نمبر 8

آپی نے کہا وہ ملنا چاہتی ہے......اور وہ منتظر تھا.......

ایک ریسٹورنٹ کا منظر تھا۔ اردگرد اشتہا انگیز کھانوں کی خوشبو، مہک پھیلی ہوئی تھی۔ گرم گرم کھانوں سے دھواں اٹھ رہا تھا......مگر دھواں تو کہیں اور بھی اٹھ رہا تھا......

دل جل رہا تھا......دل......اور وہ جیسے وہاں پہنچ گیا کہ جب مزنہ اسے ماضی کے بارے میں بتاتی تھی اس کے کانوں میں مزنہ کی آواز گونجنے لگی اور ماضی مجسم ہو کر اس کی آنکھوں میں تھرکنے لگا۔

☆......☆......☆

چراغ دین کے ہاں دوسرے بچے کی پیدائش متوقع تھی۔ وہ ہر بار کی طرح اس بار بھی ہر ہر قدم مولوی اللہ رکھا سے پوچھ پوچھ اٹھاتا تھا۔ اب کی بار بھی اللہ نے اسے بیٹا عطا کیا تھا مگر اس کے لیے یہ مولوی صاحب کا فیض تھا......ان کی دعا تھی۔ وہ ایک بار پھر سے دوڑا دوڑا مولوی اللہ رکھا کے پاس گیا۔ مولوی صاحب نے آ کر بچے کو گھٹی دی، اس پر دم کیا......اسے ساری عمر کی بلاؤں سے محفوظ کیا......کانوں میں اذان دی اور جب نام رکھنے کی باری آئی تو مولوی صاحب نے فال نکالی اور فال نکال کر بولے......

''تمہارے اس بیٹے کے لیے بھی ''ا'' اور ''ح'' یعنی کہ ''اح'' سے شروع ہونے والا نام موزوں رہے گا۔ اگر کوئی اور نام رکھو گے تو یہ اس بچے پہ بھاری پڑے گا۔ بچہ بیمار رہے گا۔ کامیاب نہیں ہوگا......لو بھلا اب چراغ دین کی مجال کہ وہ کوئی اور نام رکھتا۔ مولوی اللہ رکھے کا حکم ٹالتا......اور پھر اللہ رکھا صاحب نے ہی اس بچے کا نام تجویز کیا تھا......اور نام تھا۔

''احمد مرتضیٰ......''

☆......☆......☆

''احمد مرتضیٰ......میرے لعل......! ماں سے زیادہ پیاری ہے وہ تجھے......؟'' ماں جی کا لہجہ آزردہ تھا۔ احمد مرتضیٰ کی ضد تھی کہ ٹوٹنے میں ہی نہ آتی تھی......کیا کیا نہ کر دیکھا......پر وہ بھی اپنے نام کا ایک ہی مرد تھا۔

''ماں جی......! سوال یہ نہیں کہ وہ پیاری ہیں یا آپ......؟ یہ تو کوئی موازنہ ہی نہیں......کوئی مقابلہ ہی نہیں......ماں ماں

http://kitaabghar.com

ہوتی ہے اور پسند پسند ہے......

آپ نے کہا شادی وہاں نہیں کرنی......خدیجہ سے نہیں کرنی......میں چپ کر گیا......واپس آ گیا......اب میں اس سے زیادہ کچھ اور نہیں کر سکتا ماں جی......!اختیار میں نہیں ہے میرے......یقین کریں اختیار میں ہوتا تو یوں آپ کے دل کو تکلیف نہ دیتا......''اور احمد مرتضیٰ کا لہجہ ماں جی سے بھی زیادہ ٹوٹا ہوا تھا۔

''پتر......!دنیا بھری پڑی ہے......اتنی اتنی سوہنیاں......جوان......کنواریاں کڑیاں ہیں......جس پر ہاتھ رکھے گا لے آوں گی......پر......''

''یہ ہی تو مسئلہ ہے ماں جی......!ہاتھ کہیں اور جاتا ہی نہیں......نظر کو کچھ اور نظر آتا ہی نہیں......میں تو خود چاہتا ہوں مسئلہ ختم ہو، میرا دل اس سے پھر جائے مگر میرا دل پھرتا ہی نہیں ماں جی......!دعا کریں میرے لیے......دعا کریں کہ یہ جو آتش بھڑکی ہے نا دل میں یہ بجھ جائے......مگر مجھے راکھ نہ بنائے......''اور احمد مرتضیٰ کا لہجہ آنچ دیتا تھا......سلگتا سا تھا۔

''ضرور اس جادوگرنی نے تعویز کیے ہوں گے......جادو کرایا ہوگا......گیا تھا نا ان کے گھر......میٹھے میں کچھ ملا کر کھلا دیا ہوگا......ایسے تو ہی تیری آنکھوں پر پٹی نہیں بندھی......آج ہی تیرے باپ سے کہہ کر توڑ کرواتی ہوں مولوی اللہ رکھے سے......''ماں جی پھر جو بھڑکیں تو احمد مرتضیٰ کو فون ہی بند کرنا پڑا تھا۔

''ہاں ماں جی......!جادوگرنی ہے......محبت کا سحر پھونکا اس نے......پیار کے تعویز سے باندھ دیا اور اب سے میں عشق کے دائرے میں ہوں......باہر نکلا تو بھسم ہو جاؤں گا......ماں جی میرا اختیار ختم ہوا......بے بس ہوں میں......بے بس......''

اور وہ فون بوتھ کی دیوار سے سر ٹکائے بڑبڑاتا تھا۔

☆......☆......☆

مولوی اللہ رکھے نے لڑکی کی تصویر مانگی تھی توڑ کرنے کے لیے اور جب تصویر دیکھی تو جھٹ سے اپنے بیٹے کا رشتہ بھیج دیا کہ جس کی بیوی چھٹے بچے کی پیدائش پر دم توڑ گئی تھی اور جس کو مرے ہوئے ابھی چالیس دن نہ ہوئے تھے......یہ ہوا تھا توڑ......

خبر احمد مرتضیٰ تک پہنچی اور سمجھو کسی نے جلتی پر تیل ڈالا......نار زوروں سے بھڑکی......سخت ٹینشن پھیلی تھی......لڑائی ہوئی تھی احمد مرتضیٰ کی باپ سے اور باپ نے اسے عاق کر دیا تھا......غصے میں اور احمد مرتضیٰ نے بڑے دکھ سے اک آخری خط ماں کو لکھا......

اماں......!انسان جب بچہ ہوتا ہے نا......ٹھیک ہوتا ہے......اسے بچہ ہی رہنا چاہیے......بڑا نہیں ہونا چاہیے......کم از کم ماں کی گود میں سر رکھ کر رو تو لیتا ہے......خود کو پہنچنے والی چوٹ، زخم ماں کو دکھا تو سکتا ہے اور ماں بھی کبھی پھونک مار کر، کبھی چوم کر آنسو پونچھ کر سینے سے لگا لیتی ہے......میں بھی اپنی چوٹ......اپنا زخم لے کر آیا تھا آپ کے پاس......دل کھول کر رکھا تھا آپ کے

سامنے......آپ نے گود میں جگہ ہی نہیں دی......آنسو پونچھے ہی نہیں......شفا والی پھونک ماری ہی نہیں......اور تب میں سمجھ گیا کہ میں بڑا ہو گیا ہوں نا......بچہ جو نہیں رہا......مجھے اپنی چوٹیں خود سہلانا ہوں گی......اپنے زخموں سے رسنے والا خون خود صاف کرنا ہو گا مگر ماں جی......! رشتوں سے پہنچنے والے زخم جب ناسور بنتے ہیں نا تو تکلیف یک طرفہ نہیں رہتی......میرے زخم کو ناسور مت بنائیں ماں جی......! آپ کو اللہ کا واسطہ......اس رسول ﷺ کا واسطہ جس کی شریعت کو آپ بھی مانتی ہیں اور میں بھی......اسی شریعت کی رو سے مجھے میری مرضی کرنے کا حق ہے......چاہے عورت طلاق یافتہ ہو یا کنواری......مجھے میری مرضی کرنے کا حق ہے......اور آپ مجھے یہ حق لینے نہیں دے رہیں ماں جی......! پیغمبر ﷺ نے بھی تو کی تھی طلاق یافتہ سے شادی......آپ کہتی ہیں وہ پیغمبر ﷺ تھے ہم عام انسان ہیں......تو ہم عام انسانوں کے لیے ہی کی تھی نا ماں جی......! چلیں ٹھیک ہے......آپ نہ مانیں......ابّا نے عاق تو پہلے ہی کر دیا......آپ بھی اپنی ممتا سے ہاتھ کھینچ لیں......آج کے بعد تنگ نہیں کروں گا آپ کو......آخری سلام بھیج رہا ہوں۔ دعا دے دیں ماں جی......کوئی ایسی دعا جو میری آگ کو گلزار کر دے۔

والسلام

احمد مرتضیٰ

قطر (دوہا)

☆......☆......☆

اس کا خط گھر والوں پر قیامت بن کر ٹوٹا تھا۔ فرخندہ پڑھتی جاتی تھی اور روتی جاتی تھی۔ ماں جی کا دل بھی پسیجا......کمزور سی آواز میں اسے فون ملانے کا کہا......فرخندہ نے کال بُک کروائی تو وہ اِک اور قیامت تھی جوان پر ٹوٹی......احمد مرتضیٰ وہاں سے نوکری چھوڑ کر جا چکا تھا۔

''کہاں......؟'' یہ تو کسی کو معلوم نہ تھا۔ ماں جی تو دوڑی تھیں......خدیجہ کے گھر......اور خدیجہ وہ تو ماں جی کو دیکھ کر ایسی سہمی کہ کمرے سے باہر ہی نہ نکلی تھی۔ ماں جی خود اس کے پاس گئیں......اس کو دیکھ کر ابال تو چڑھا مگر......!

''تجھے بتایا اس نے کچھ......؟ کدھر گیا......؟ کوئی اتا پتا......؟'' اور یہ سن کر خدیجہ کے پیروں تلے بھی زمین سرکی۔

''کیا ہوا اسے......؟'' اور وہ اپنی ہی بے ساختگی پہ حیران ہوئی۔ اس کا دل کیوں ڈوبا......؟ کیوں......؟

''تمہیں نہیں معلوم کیا ہوا......؟ تمہیں تو سب معلوم ہوگا......دیکھ مجھے......میری ممتا کو نہ آزما......بتا دے......''

''میرا اس سے......کبھی بھی......کوئی بھی رابطہ نہیں رہا ماں جی......! میں تو آپ کے منہ سے سن رہی ہوں......مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم ہوا کیا......؟ میں آپ کے سامنے بھی ہاتھ جوڑتی ہوں اور اس کے سامنے بھی جوڑے تھے......کہ بدنام نہ کریں

مجھے......پہلے کیا کم ہوئی ہے میرے ساتھ......؟''

اور وہ ہاتھ باندھے بلک بلک کر روتی تھی......اور اس کا رونا کہتا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی تھی۔ ماں جی سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھیں۔

''کہاں گیا......؟ کہاں گیا وہ......؟''

''ہوا کیا ہے......؟'' خدیجہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''تیری وجہ سے نوکری چھوڑ کر خدا جانے کہاں چلا گیا ہے......'' ماں جی اسے کاٹ کھانے کو دوڑی تھیں اور وہ......اس کا دل دھک کر کے رہ گیا تھا۔

☆......☆......☆

کانپتے ہاتھوں سے اس نے جائے نماز بچھائی تھی، مگر نہیں جانتی تھی کہ وہ ایسا کیوں کرتی تھی......کیوں اس کے نام کے نفل پڑھتی تھی......کیوں خیر مانگتی تھی......کیوں سجدوں میں اس کے لیے روتی تھی......کیوں اس کی سانس اٹک اٹک جاتی تھی...... آنسو نہیں تھے ساون بھادوں کی بارش تھی جیسے جو اس کی آنکھوں سے بہہ بہہ جاتی تھی......اور وہ ان کے یوں بہنے پر حیران تھی...... ششدر تھی......یا خدا......! کس صحرا میں یہ محبت کا بوٹا پھوٹا تھا......یا خدا......! یہ کیا ہوا تھا......؟ کیا ہو گیا تھا۔ احمد مرتضیٰ کے ساتھ تو جو مسئلہ تھا......سو تھا......وہ کیوں اس کے ساتھ، اسی جذبے میں رگیدی گئی......

''یا اللہ جی......! یوں نہ کریں میرے دل کو اس کے لیے نرم نہ کریں......میری آنکھ سے اس کے نام کا آنسو نہ بہے......میرا سر اس کی خیر مانگنے سجدے میں نہ جھکے......لب اس کے لیے دعا نہ کریں......یا خدا......! مجھے یوں بے مول نہ کر......''

وہ بلکتی، تڑپتی، روتی مگر ''محبت'' کم بخت تو وہ ''نار'' ہے جسے بھڑکنے کے لیے کسی ایندھن کی ضرورت نہیں......اس میں ایندھن وجود بنتا ہے اور جلتا دل ہے......سو اس کا وجود بھی اب سے ایندھن تھا اور اس کا دل جلتا تھا......لب ہر دم اس کی خیر مانگتے......اور آنکھ اس کے نام کے آنسو بہاتی تھی۔

''ہائے احمد مرتضیٰ! یہ تم نے مجھ مسکین کے ساتھ کیا کیا......؟ آخر کیا کیا......؟''

اور ابھی جب وہ تازہ تازہ اس محبت نامی غم سے دوچار ہوئی تھی اسے ایک اور جان لیوا صدمہ سہنا پڑ گیا تھا۔

گھر والے مولوی اللہ رکھے کے بیٹے کے لیے ہاں کہنے والے تھے۔

☆......☆......☆

آج پندرہ دن ہو گئے تھے احمد مرتضیٰ کا کچھ اتا پتا نہ تھا۔ وہاں مقیم اس کے دوستوں کا کہنا تھا کہ اس کے بارے میں صرف اعجاز کو معلوم ہے اور اعجاز پاکستان آیا ہوا تھا۔ اس زمانے میں گھر گھر فون کی سہولت نہ تھی سوا اعجاز کے گھر بھی فون نہ تھا، ورنہ اس

سے فون پر رابطہ کر لیا جاتا۔ احمد مرتضٰی کے دوستوں کا کہنا تھا کہ اس کا تعلق فیصل آباد سے ہے۔ اب اتنے بڑے فیصل آباد میں کون اعجاز کو ڈھونڈے۔ اللہ جانے وہاں کتنے اعجاز ہوں گے...... نہ گلی محلے کا پتا...... نہ علاقے کا معلوم...... بس نام اعجاز اور شہر فیصل آباد کا معلوم تھا اور احمد مرتضٰی کا معلوم کرنے کے لیے یہ سب کافی نہ تھا۔ ماں جی کو تو غشی کے دورے پڑنے لگتے...... خدیجہ کو بد دعائیں دینے لگتیں...... اسے کوسنے لگتیں کہ جس کی وجہ سے ان کا بیٹا ان سے جدا ہوا تھا۔

''فرخندہ...... فرخندہ......! فون ملا...... پوچھ احمد مرتضٰی کے دوستوں سے...... پتا کر کہ خبر آئی کہ نہیں میرے لعل کی......؟'' وہ دن میں کئی کئی بار فون کرواتی تھیں مگر......

''فون کرنے سے کیا ہوگا ماں جی......؟ اسے کچھ بتا کر جانا ہوتا تو بتا کر جاتا......''

''اللہ کرے مر جائے خدیجہ...... خدا کا قہر ٹوٹے اس پر......'' وہ رونے لگتیں۔

''اسے بد دعا دینے سے کیا ہوگا ماں جی......؟ جو آپ کو کرنا چاہیے...... وہ ہی آپ نہیں کرتیں...... مجھے ڈر ہے کہ ہم پھر ساری عمر بھائی کو......''

اور اس سے آگے وہ کہہ نہ سکی دوپٹہ منہ پر رکھ کر رونے لگی تھی۔

''تو کیا کروں میں......؟ کیا کروں......؟''

''ماں جی......! اللہ کا واسطہ ہے آپ کو...... اپنی انا کے ہاتھوں اپنا بیٹا نہ گنوا دیں...... جائیں اور جا کر خدیجہ کا رشتہ مانگ لیں...... ورنہ ساری عمر پچھتائیں گی...... یہ ہی چیز احمد مرتضٰی کو واپس لائے گی اور اگر ایسا نہ ہوا...... اگر خدیجہ کا رشتہ مولوی اللہ رکھے کے بیٹے سے ہو گیا تو یاد رکھیں...... یاد رکھیے گا ماں جی......! آپ کو احمد مرتضٰی کبھی نہیں ملے گا...... کبھی بھی نہیں...... انا کے استھان پر بیٹے کی قربانی مت چڑھائیں ماں جی...... مت چڑھائیں......'' فرخندہ ہاتھ جوڑے روتی رہی اور ماں جی یوں سکتے میں آئیں کہ جیسے آج کے بعد حرکت نہ کر سکیں گی......

''تو جانتی ہے نا اسے طلاق کس وجہ سے ہوئی تھی...... پھر بھی......؟'' اسی سکتے کی سی کیفیت میں وہ بڑبڑائی تھیں۔

''پھر بھی...... پھر بھی ماں جی......! بیٹے کی بلی مت چڑھائیں......''

اور ماں جی کے کندھے ڈھلک گئے تھے۔

☆......☆......☆

خدیجہ کی پہلی شادی نذر حسین سے ہوئی تھی۔ یہ ایسی ہی شادی تھی کہ جیسی گاؤں میں ہوا کرتی ہے۔ عمر میں تیرہ سال بڑا تو تھا مگر اچھا کھاتا کماتا تھا۔ اپنی زمین بھی تھی اور گھر بھی...... زندگی میں بظاہر کوئی کمی نہ تھی مگر نذر...... وہ ایک منہ پھٹ، پیسہ دے کر

لڑائی لینے والا انسان تھا۔ بیوی کم عمر تھی، خوبصورت تھی مگر پھر بھی وہ اسے جوتی کی نوک پر رکھتا تھا۔ فصل کو پانی لگانے پر جھگڑا...... لین دین پر تنازعے اور پھر اس نے زمین پر بھی قبضہ کر رکھا تھا۔ وہ کہتے ہیں نا کہ اللہ لٹھ نہیں مارتا، مت مارتا ہے......سو اس کی مت مارنے کا وقت آ گیا تھا۔ نہ جانے کہاں سے جوئے کی لت لگی اور پھر سب کچھ بکنے لگا......زمین سے لے کر خدیجہ کے کانوں کی بالیاں تک......سب کچھ بک گیا اور جب اس کے پاس بیچنے کو کچھ نہ رہا تو اس نے وہ ہی کیا جو کوئی بھی ایسا شخص کر سکتا ہے......وہ خدیجہ کو جوئے میں ہار آیا تھا۔

وہ عشاء کی نماز پڑھ رہی تھی جس وقت وہ گھر آیا تھا۔

''کیا کر رہی ہے......؟ چھوڑ یہ مصلّے اور نمازیں......'' اس نے آگے بڑھ کر اسے بازو سے کھینچا......خدیجہ مارے حیرت کے گنگ رہ گئی مگر ہاتھ نہ کھولے۔

''سنتی نہیں......'' اور اس نے کھینچ کر تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔

وہ بیچاری اوندھے منہ گری......آنکھوں کا دریا تو جیسے ہر وقت طغیانی میں ہوتا تھا......کناروں سے بہہ پڑا۔

''میں نے کیا کیا ہے نذر......؟'' منہ پر ہاتھ رکھے وہ دکھ سے چلائی تھی۔

''زبان گدی سے کھینچ لوں گا اور یہ جو دیدے پھاڑے مجھے دیکھ رہی ہے نا......نکال کر ہتھیلی پہ رکھ دوں گا۔'' وہ اسے بالوں سے پکڑ کر غراتے ہوئے بولا تھا۔

''میرا قصور تو بتا دے......آخر ہوا کیا ہے......'' تکلیف جسمانی نہ تھی......ضرب روح پر پڑی تھی۔

''چپ چاپ خاموشی سے اٹھ کر تیار ہو جا......اور جس کے ساتھ بھیج رہا ہوں، چلی جا......ورنہ تو اچھی طرح جانتی ہے مجھے......'' وہ حکم نہیں تھا......پیٹ میں گھونپا جانے والا چھرا تھا......الفاظ نہیں تھے......چنگاریاں تھیں چنگاریاں......جھلس ہی تو گئی تھی......زخم زخم ہوئی تھی۔

''تو جانتا ہے کہ تو کیا......کیا کہہ رہا ہے؟'' دکھ سے، رنج سے اس کا گلا بیٹھا تھا......آواز نکلتی نہ تھی......حیرت نے جیسے حلق بند کر چھوڑا تھا۔ اور لرزتے ہونٹوں......کانپتے بدن کے ساتھ جب وہ سوال کرتی تھی آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر آنکھوں سے گرتے تھے۔

''بہت اچھی طرح جانتا ہوں میں کیا کہہ رہا ہوں......اس لیے دماغ نہ چاٹ اور چپ چاپ وہ کر جو کہہ رہا ہوں......''

اس بات پر چند لمحے وہ اس کا مکروہ چہرہ تکتی رہی۔

''جوئے میں ہار کر آیا ہے نا مجھے......ہے نا......؟''

''ہاں......!'' اور وہ غرایا تھا۔

http://kitaabghar.com

''ہار کر آیا ہوں...... پھر......؟'' اسے آج پتا چلا تھا...... آج معلوم ہوا تھا کہ جب قیامت کسی انسان پر ٹوٹتی ہے نا...... تو آسمان نہیں پھٹتا...... زمین کا سینہ شق نہیں ہوتا...... کوئی چھت نہیں گرتی اور نہ ہی پیر کے نیچے کی زمین اپنی جگہ چھوڑتی ہے...... ہوتا کچھ بھی نہیں...... مگر انسان کھڑے کھڑے...... سانس لیتا ہوا...... دھڑکن کو محسوس کرتا ہوا...... پورا کا پورا اک پل میں دفن ہو جاتا ہے...... شاید مرنے کی تکلیف اس قدر نہ ہو...... شاید کہ مرنا اس کی نسبت آسان ہو...... اسے سہنا اتنا تکلیف دہ نہ ہو کہ جس قدر اذیت ناک یہ سننا تھا...... وہ ساکت...... بنا کوئی حرکت، جنبش کیے اس کا چہرہ دیکھتی تھی۔

''میرا منہ کیا تک رہی ہے......'' اس نے دانت پیستے ہوئے ہاتھ سے اس کا منہ جکڑا تھا۔ اور خدیجہ نے اس کے منہ پر تھوک دیا...... اب کی بار سکتے میں آنے والی ذات نذر کی تھی۔

''کراہیت، گھن بہت چھوٹے الفاظ ہیں اس کیفیت کو بیان کرنے کے لیے جو اس وقت میں تمہارے لیے محسوس کر رہی ہوں...... نیلا تھوتھا کھا لوں گی...... پھندا ڈال لوں گی (اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے گردن کو پکڑا)...... چھت سے چھلانگ لگا لوں گی مگر تیری دلالی نہیں کروں گی نذر...... کبھی بھی نہیں......''

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ بھڑک اٹھتا...... اسے پیٹ ڈالتا مگر وہ بڑے سکون سے...... خباثت سے مسکرایا تھا۔

''پتا کیا بات ہے......'' اس نے جھک کر اسی کے پلو سے اپنا منہ صاف کیا۔

''تیرا مرنا بھی نا...... اب تیرے اختیار میں نہیں ہے...... وہ ہی ہوگا جو میں چاہوں گا...... تو چل دیکھتے ہیں کس کی چلتی ہے......''

یہ کہہ کر اس نے خدیجہ کو بازو سے کس کر پکڑا تھا۔

''نذر...... چھوڑ...... چھوڑ مجھے......'' اس نے اپنا آپ چھڑانا چاہا مگر پھڑ پھڑا کر رہ گئی تھی۔ وہ اسے گھسیٹتا ہوا دروازے تک لایا تھا۔

''نذر......! اللہ کا واسطہ...... اس کے رسول کا واسطہ...... ایسا نہ کر...... دیکھ! میں ہاتھ جوڑتی ہوں...... تیرے پیروں کو ہاتھ لگاتی ہوں...... یوں نہ بیچ مجھے......'' باخدا جان کنی کا عالم اتنا سخت نہ ہوگا کہ جس قدر یہ وقت تھا۔

اور اس فریاد پر نذر نے مڑ کر ساتھ گھسٹتی عورت کے پیٹ میں لات رسید کر دی۔

''آہ......!'' وہ تکلیف سے دوہری ہوئی...... اک لمحے کے لیے خاموش ہوئی اور ''کوئی ہے...... بچاؤ مجھے...... اللہ کے واسطے کوئی مدد کرو...... بچاؤ مجھے...... یہ مجھے بیچ رہا ہے...... کو......'' اور نذر نے یکدم اس کا باز چھوڑا تھا...... وہ لڑکھڑا کر پیچھے کو گری اور وہ اس پر چڑھ دوڑا...... اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبایا تھا۔ اور وہ پھڑ پھڑانے لگی...... ہاتھ پیر مارنے لگی...... مگر اس

کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا...... مارنا مقصد نہیں تھا اس کا......بس وہ اسے بے ہوش کرنا چاہتا تھا اور وہ ہو بھی گئی...... چند لمحے لگے تھے اس کی آواز کو دبانے میں......اس نے اسے کندھے پر اٹھایا اور لا کر اسے جیتے ہوئے شخص کے قدموں میں پٹخ دیا تھا۔ سب کچھ پہلے سے ہی تیار تھا۔اسے گاڑی میں ڈالا گیا اور لے جایا گیا۔نذر ہاتھ جھاڑ کر اندر آیا۔کم بخت اس کے سارے منصوبے پر پانی پھیر گئی تھی۔اگر کسی نے سن لیا تو......؟

اس نے احتیاط سے ادھر ادھر دیکھا...... چند لمحے انتظار کیا مگر کوئی بھی اسے پوچھنے،اس کا در کھٹکھٹانے نہیں آیا تھا۔اس نے اطمینان کی گہری سانس بھری تھی......تو کیا تھا آخر اس کا منصوبہ......

نذر کو اس پر گھر سے بھاگ جانے کا الزام لگانا تھا اور پھر غیرت کے نام پر قتل کر دینا تھا۔

بیوی کب رہی تھی اب وہ......تو یوں وہ دنیا کی نظروں میں بھی سرخرو رہتا اور اپنی انا کو بھی تسکین پہنچاتا لیکن وہ کمینی......

اس نے ایک بار پھر محتاط نظروں سے اردگرد دیکھا...... وہاں ہر سو خاموشی پھیلی تھی...... سنّاٹا آنکھیں پھاڑے...... بانہیں پھیلائے......ہو ہو کرتا ہوا چکر کاٹ رہا تھا......وہ چیخ اسی خاموشی میں دب گئی تھی......سنی نہ گئی تھی مگر......ڈوبنے سے ذرا پہلے دبنے سے ذرا پہلے......خاموش ہونے سے ذرا پہلے وہ سن لی گئی تھی۔

اور وہ بتول بی بی کے کان تھے جنہوں نے اسے سنا......اس کی آنکھیں تھیں جنہوں نے وہ منظر ساتھ ملی دیوار کی جھری سے دیکھ لیا تھا۔بتول اسی وقت ننگے پیروں خدیجہ کے گھر بھاگی تھی جو کہ قسمت سے اسی گاؤں میں تھا۔

☆......☆......☆

''جمشید علی......جمشید علی......!'' اس نے دروازے کو جیسے توڑ ڈالنا چاہا تھا۔یوں رات کے وقت کسی کا اس طرح سے دروازہ بجانا......سارے گھر والے اچنبھے سے کواڑ کی طرف تکتے تھے......جمشید علی خدیجہ کا بڑا بھائی تھا۔

''جمشید علی......!دروازہ کھول پتر......قیامت آ گئی ہے قیامت......'' بتول دروازہ پیٹتی جاتی تھی اور روتی جاتی تھی......

جمشید علی نے آگے بڑھ کر ترنت دروازہ کھولا تو......بتول جو کہ ادھیڑ عمر عورت تھی......جمشید کا آستین پکڑ کر رونے لگی۔

''بتولاں باجی......ہوا کیا ہے......؟بتاؤ تو سہی......''

''خدیجہ......!''اور بتولاں کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔

''کیا ہوا خدیجہ کو......؟'' خدیجہ کی ماں سینے پر ہاتھ رکھ کر آگے بڑھی تھی۔

''نذر اسے جوئے میں ہار آیا...... میں نے خود اسے خدیجہ کا گلا دباتے دیکھا ہے...... ہائے لٹ گئے...... برباد ہو گئے......جمشید علی وہ تیری ہیریاں ورگی......سوہنی دھی......بہن......کج کر لے......کج کر لے......''اور جمشید علی کے سر پر مانو

http://kitaabghar.com

آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔

''کہاں لے کر گیا......کچھ پتا ہے بتولاں باجی......؟'' وہ اک لمحے کے لیے ساکت ہوا اور پھر یوں جیسے اس میں برق دوڑی تھی۔

اور بتولاں باجی اسے جو سنا......اور جتنا نظر آیا کی بنیاد پر سارا واقعہ سنانے لگی تھیں......اور وہ......

''کامی......عمران......افضل......!'' اس نے بھائیوں کو آوازیں دیں......

''جو جو ملتا ہے اٹھالو......اور کامی تو نمبردار کے گھر جا......اسے ساتھ لے جا کر پرچہ کٹوا......اور عمران، افضل تم میرے ساتھ آؤ......'' اور لمحوں میں جیسے وہاں طوفان مچ گیا تھا۔

گھر کی عورتیں یوں روتیں...... یوں بین کرتی تھیں کہ جیسے کوئی مرگ ہو گیا ہو اور مرگ ہی تو ہوا تھا...... چاہے وہ سلامت واپس آتی یا داغدار ہو کر......بات تو اب ایک سی تھی......

پل بھر میں گلی محلے کی عورتیں وہاں جمع ہوئی تھیں......خبر تو کہتی......

''تو مینوں منہ وچوں کڈ......میں تینوں شہر وچوں کڈ دی......''

اور خبر تیار تھی......نذر حسین کو اس کے گاؤں سے نکالنے کے لیے ان تینوں نے پہلے نذر کے گھر چھاپا مارا اور پھر پولیس کو لے کر نذر کی نشاندہی پر وہاں چھاپا مارا کہ جہاں خدیجہ کو لے جایا گیا تھا۔ وہ ان شیطانوں سے تو بچ گئی تھی مگر پھر لوگوں کی زبانوں......ان کی آنکھوں کے اشاروں میں چھپے سوالوں......اور طنز میں بجھے تیروں سے نہ بچ سکی تھی۔

احمد مرتضٰی کی ماں جی بھی انہی لوگوں میں سے تھیں کہ جنہیں یقین تھا کہ خدیجہ جیسی گئی تھی......ویسی واپس لائی نہ گئی تھی۔

اور ماں جی کا دل تو مجبور ہو ہی گیا تھا مگر اب کی بار مسئلہ چراغ دین بنا۔ وہ کیسے......کیسے مولوی اللہ رکھے کے بیٹے کے رشتے پر اپنے بیٹے کا رشتہ ڈال سکتا تھا......یہ ناممکن تھا......یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ایسے میں احمد مجتبٰی آگے بڑھے......

''ابا جی......! مانا کہ مولوی صاحب قابلِ احترام ہیں مگر دوسری طرف آپ کا بیٹا ہے......وہ نہیں آئے گا......کبھی بھی نہیں آئے گا۔ ابھی تو اسے رشتے کی بات پتا چلی ہے......کل کلاں کو شادی ہو گئی تو سمجھیں وہ عمر بھر آپ کو منہ نہ دکھلائے گا......پھر آپ مولوی صاحب کو نہیں......اپنے بیٹے کو روئیں گے......یہ ظلم نہ کریں......ایسا نہ کریں۔''

مگر چراغ دین کہتا تھا کہ......

''مولوی صاحب ہی کہتے ہیں کہ یہ رشتہ ٹھیک نہیں ہے......جو ٹھیک تھا میں نے وہ ہی کیا......اب جب مولوی صاحب کہتے ہیں تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا......''

احمد مجتبیٰ باپ کو سمجھا نہیں سکے تھے مگر وہ ایک کام کر سکتے تھے اور وہ انہوں نے کیا۔
وہ جمشید علی سے ملے تھے۔

☆......☆......☆

''میں جانتا ہوں کہ خدیجہ بہن کے لیے مولوی اللہ رکھے کے بیٹے کا رشتہ آیا ہے......کوئی بھی بات کرنے سے پہلے میں تمہاری اس بارے میں رائے جاننا چاہوں گا۔''

''میری رائے کیا ہونی ہے پاء احمد......! ہمارے لیے تو یہ رشتہ ایسا ہے کہ جیسے جہنم کے سے دنوں میں کسی نے جنت کی کھڑکی کھول دی ہو۔ عزت بچائیں گے جی اپنی......جو رہی سہی رہ گئی ہے......''

اور احمد مجتبیٰ منہ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے......وہ کیا کہتے......کیا کرتے......

''اور اگر میں یہ کہوں کہ یہ عزت میں بچانا چاہوں گا......میں آپ کے سامنے اپنے بھائی کا رشتہ رکھتا ہوں تو......؟''

جمشید علی نے اک گہرا......دکھ بھرا سانس لیا تھا۔

''آپ کی ماں جی راضی نہیں ہیں......ہم جانتے ہیں......وہ بیچاری پہلے ہی دکھوں کی ماری ہے......میں نہیں چاہتا کہ وہ ماں جی کے عتاب کا شکار رہے......مولوی صاحب کے بیٹے کے گھر کم از کم سکون سے تو رہے گی۔''

''اور اس بات کی کیا گارنٹی ہے جمشید علی کہ وہ بچوں کو پالتے ہوئے بہت سکون میں رہے گی......؟''

اور اس ایک بات کا جمشید علی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ خاموشی سے سر جھکا گیا۔

''میرا بھائی اسے بہت خوش رکھے گا......یقین کرو جمشید علی......! بہت خوش رکھے گا......تم ہاں تو کرو......''

''میں ہاں کر دوں تو لالہ چراغ دین پھر بھی نہیں مانے گا......وہ تو فصلوں کو پانی تک مولوی اللہ رکھے سے پوچھ کر لگاتا ہے۔''

اور احمد مجتبیٰ نے اک گہری نگاہ سے اسے دیکھا۔

''جمشید علی......! ابا جی مانیں گے......''

''کیسے......؟'' اس نے حیران ہو کر سر اٹھایا۔

''ابا جی مانیں گے تب جب آپ مولوی اللہ رکھا کو انکار کریں گے......پاء جمشید اب سوچ لینا کہ بہن میری ماں کی صلواتیں سن کر زیادہ سکھی رہے گی یا مولوی جی کے پوترے پالتے ہوئے......''

اور وہ کہہ کر رکے نہ تھے......اٹھ کر چلے گئے تھے مگر جمشید علی کے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ گئے تھے۔

☆......☆......☆

http://kitaabghar.com

بات خوشی کی تھی......مگر گھر بھر میں سوگ سا پھیلا ہوا تھا۔ وہ کہ جس نے اتنی لڑائی لڑی تھی......اتنا کچھ سہا تھا......تکلیف، ناراضی، دکھ......کیا تھا جو نہیں سہا تھا......دل فگار تھا تو جان زخمی ہوئی تھی مگر......جو وہ چاہتا تھا......وہ نہ ہوا تھا اور اب......اس کے رشتہ پکا ہونے کی مٹھائی پڑی تھی اور گھر میں سے کوئی بھی اسے کھانا نہیں چاہتا تھا۔ جسے اس کی سب سے زیادہ خوشی ہونی تھی وہ بے خبر نہ جانے کدھر تھا......کہاں تھا......

ماں جی کو تو جیسے چپ کھائے جا رہی تھی......فرخندہ چھپ چھپ کر روتی تھی...... چراغ دین کو بھی بیٹے کے غم نے نڈھال کر رکھا تھا......اور ایسے میں صرف دو نفوس تھے جو مطمئن تھے اور وہ تھے......احمد مجتبیٰ اور ان کی بیوی ساجدہ......احمد مجتبیٰ کو یقین تھا......پتا نہیں کیوں یقین تھا کہ اب احمد مرتضیٰ کی خبر آئے گی......آئے گی......ضرور آئے گی......اس کی محبت اسے کھینچ کر لائے گی......وہ جہاں کہیں بھی ہے......دنیا کے جس بھی کونے میں ہے......اس کی محبت اسے کھینچ لائے گی۔

☆......☆......☆

اور وہ کھینچ لائی......اسے نہ سہی مگر......

دروازہ کھٹکھٹایا گیا تھا......صبح دس بجے کا وقت تھا......اس وقت کون تھا جو آیا تھا......

''بھاء احمد ہوں گے۔'' اسی سوچ کے تحت برتنوں کو ساہ (راکھ) سے مانجتی فرخندہ......یوں ہی بھرے ہاتھ لیے اٹھی تھی۔ اٹھ کر ایک دم دروازہ کھول دیا اور جب کھولا تو......

''ہائے اللہ......!'' وہ کرنٹ کھا کر کواڑ کے پیچھے ہوئی تھی۔

وہ کوئی اجنبی تھا۔

''جی......؟'' بدقت آواز کی لرزش پر قابو پایا۔

''احمد مرتضیٰ کا گھر یہی ہے......؟'' پوچھنے والے کا لہجہ شائستہ تھا۔

''احمد مرتضیٰ......!'' فرخندہ نے دل پر ہاتھ رکھا مگر جذبات پر قابو نہ رہا۔

''یہی ہے......'' وہ یکدم سامنے آئی۔ دھک دھک کرتے دل اور بھری آنکھوں کے ساتھ وہ نو وارد کو تکتی تھی۔

اس نے ذرا کی ذرا دیر نظریں اٹھائیں اور پھر ہونٹ بھینچ کر جھکا لیں۔

''اعجاز ہوں جی......قطر سے آیا ہوں۔ کوئی بڑا ہے تو اسے بھیجیں۔'' اور وہ نظریں جھکائے کہتا تھا۔

''ماں جی......! ماں جی......!'' فرخندہ کی چیخ دلخراش تھی۔

''کیا ہوا......؟ کیا ہو گیا فرخندہ......'' ماں جی بوکھلائیں۔

''وہ......وہ باہر......مم......ماں جی......احمد مرتضٰی......!'' اور وہ ان کے گلے لگ کر رونے لگی۔

''کیا ہوا احمد مرتضٰی کو......؟ کون آیا ہے......؟ الٰہی خیر......!'' قریب تھا کہ ماں جی بھی وہ ہی کرتیں جو فرخندہ کر رہی تھی کہ باہر سے آواز آئی۔

''اعجاز ہوں جی......قطر سے آیا ہوں......احمد مرتضٰی کی خبر لایا ہوں۔'' اور مردہ تنوں میں جیسے زندگی کی روح پھونکی گئی......نوید سنائی گئی تھی......انہیں جیسے زندگی دوبارہ ملی تھی۔

تو اسے اس کی محبت کھینچ لائی تھی۔

☆......☆......☆

''بہت دکھ سے وہ دوہا سے گیا تھا۔ کسی کو بھی بتائے بغیر......سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر، کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں گیا ہے......ہم سب پریشان تھے......آپ لوگوں کو اطلاع کرنا چاہتے تھے مگر ساتھ ہی ساتھ آپ کی پریشانی کا خیال بھی تھا......ہم چاہتے تھے کہ اس کی کوئی اطلاع مل جائے تو ہی آپ کو خبر کریں......ایسے میں ایک دن مجھے دوبئ سے ایک کال موصول ہوئی تھی......احمد کی......اسپتال سے......

''کیا ہوا میرے بچے کو......؟'' ماں جی کی آواز پھٹ گئی......احمد مجتبٰی نے انہیں کندھوں سے پکڑ کر سہارا دیا۔

''گھبرائیں نہیں، اب وہ ٹھیک ہے......بہت بیمار رہا ہے مگر اب ٹھیک ہے......اسے کچھ پیسے چاہئیں تھے سو اسی مجبوری میں اس نے مجھ سے رابطہ کیا تھا اور پیسے لینے کی حامی تب بھری تھی جب میں نے اس سے کسی کو بھی ''نہ'' بتانے کا عہد کیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ آپ میں سے کوئی بھی اس تک پہنچ جاتا تو وہ دوبئ کو بھی چھوڑ کر دربدر کی ٹھوکریں کھاتا......اس لیے میں نے آپ کو نہیں بتایا......وہاں بھی سب سے یہی کہا کہ وہ ٹھیک ہے......جانتا تھا کہ آپ لوگ پریشان ہوں گے اسی لیے بتانے چلا آیا......''

وہ سر جھکائے بات کرتا تھا اور باہر بیٹھک کے دروازے کے پیچھے کھڑی فرخندہ سسکیاں بھرتی تھی......اس کے ہاتھوں پر ابھی تک صابن اور راکھ جمی ہوئی تھی۔ وہاں اب خموشی تھی اور اس خموشی میں کواڑ کے پیچھے ابھرنے والی سسکیاں بڑا شور کرتی تھیں اور یہ سسکیاں کسی کے دل پر اثر کرتی تھیں۔

''فون نمبر ہے اس کا......؟'' چند لمحوں بعد احمد مجتبٰی بولے تھے......

''جی......!'' اعجاز نے قمیص کی جیب سے ایک پرچی نکال کر ان کی طرف بڑھائی تھی۔ وہ فوراً فون سیٹ کھینچ کر لائے۔ وہاں رنگ نہیں ہوتی تھی، ان کا دل دھڑکتا تھا۔

''ہیلو......!'' کچھ دیر بعد اس کی آواز سنائی دی۔ اور احمد مجتبٰی نے سکون بھری تکلیف کے ساتھ آنکھیں بند کیں۔

''اتنی ناراضی یار احمد......! اتنا غصہ......؟'' اور اب کی بار دوسری طرف خاموشی چھائی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ فون بند کر دے مگر نہ جانے کس بات کے زیر اثر وہ چپ کھڑا رہا۔

''اب تک غصے میں ہے......؟'' وہ پیار سے بولے اور جواباً آہ جیسا سانس سنائی دیا۔

''شادی طے ہوگئی اس کی......؟'' اور وہ جب پوچھتا تھا تو لہجے میں ہزار کرچیاں چٹختی تھیں......احمد مجتبیٰ مسکرائے۔

''ہاں......ہوگئی......!'' اور احمد مرتضیٰ تھوڑا اور مر گیا۔

''کیا ملا......میرے ساتھ یہ سب کر کے......؟ کیا......؟'' وہ شکوہ نہیں تھا......بے بسی تھی، دکھ تھا......تکلیف تھی......اور مسکراہٹ احمد مجتبیٰ کے ہونٹوں سے جدا نہ ہوتی تھی۔

''پوچھے گا نہیں؟ کس سے طے کی ہے......؟'' اور احمد مجتبیٰ اسے پچکارتے تھے۔

''زخموں پر نمک تو نہ چھڑکیں پاء جی......!'' وہ مشتعل ہوا۔

''اوئے پاغلا......! زخموں پر نمک نہیں چھڑکا، سپرٹ لگائی ہے......بس ذرا سی چبھن......اس کے بعد آرام ہی آرام ہے۔''

''کیا مطلب......؟'' وہ ناسمجھی کا شکار ہوا۔ احمد مجتبیٰ ہنس دیئے۔

''خدیجہ سے رشتہ طے کیا ہے تیرا......'' اور وہ اس اطلاع پر ''سن'' ہو کر رہ گیا......فریز......اک دم بے حس و حرکت۔

''لارے نہ لگائیں پاء جی......'' اور وہ رو پڑا۔

''خدا قسم احمد مرتضیٰ! خدا قسم......! ابا کے ایمان اور ماں کے دل سے کھیل کر تیرے لیے خدیجہ کو مانگ کر لایا ہوں......اس سے بڑی قسم کوئی اور ہے تو بتا......میں اٹھانے کے لیے تیار ہوں۔'' اور وہ سنجیدہ لہجہ......لہجے میں بولتا سچ......اور سچ دل پر اثر کرتا ہوا......ریسیور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔

وہ دونوں بازوؤں میں منہ چھپا کر زمین پر بیٹھا تھا۔

مرد تھا نا......اپنے آنسو دنیا کو دکھانا نہ چاہتا تھا لیکن وہ رونا چاہتا تھا......دھاڑیں مار مار کر رونا چاہتا تھا۔

☆......☆......☆

اور پھر وہاں ایک نہیں، دو نکاح ہوئے۔

فرخندہ کا اعجاز سے اور اس کا خدیجہ سے فون پر......دونوں کی رخصتی احمد مرتضیٰ کے آنے سے مشروط رکھی گئی۔

اور وہ جو اسے خط لکھ لکھ کر منع کرتی تھی......معلوم نہیں کیوں اس تعلق پر اس سے زیادہ پرسکون تھی......یوں لگا تھا کہ جیسے عرصے بعد تپش سے چھاؤں نصیب ہوئی تھی۔

http://kitaabghar.com

اور پھر وہ دن آیا جب وہ دولہا بن کر، گھوڑی پر بیٹھ کر اسے لینے آیا تھا اور کیسی شان سے آیا تھا۔ وہ محض اسے لینے نہ آیا تھا...... یہ اعلان تھا...... فتح تھی کہ من پسند عورت کا ساتھ کیسے حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے خوبصورت دن تھا...... حسین...... دل فریب اور یادگار...... اور وہ اس کے سامنے...... سجی سنوری...... سر جھکائے بیٹھی تھی...... جس کے چہرے کو شاید اس نے دو بار سے زیادہ نہ دیکھا ہو مگر یہ ہی دیکھنا ''قیامت'' ہو گیا تھا...... روگ بن گیا تھا اور اب اس کے لب نہیں، آنکھیں تک مسکرا رہی تھیں۔

''ماں جی کہتی تھیں کہ تم بہت چالاک ہو لیکن مجھے کیوں تم اتنی معصوم دکھتی ہو؟''

اور شوہر کے منہ سے پہلی بات سن کر اس کا جھکا ہوا سر مزید جھکا تھا۔ وہ اس کے انداز پہ مسکرایا۔

''اب بھلا بتاؤ...... ماں جی کو کیا پتا کہ مجھے معصومیت نے مارا...... نہ ہی تمہارے حسن نے لوٹا، میں تو تمہاری آنکھوں سے پٹ گیا ہوں......'' وہ کہہ رہا تھا اور اس کا سر جھکتا ہی چلا جا رہا تھا۔

تو ایک جنگ، ایک لڑائی اپنے انجام کو پہنچی...... اس نے کہا تھا کہ ماں باپ کی رضامندی سے ہی شادی کروں گا اور اس نے کر دکھایا تھا کہ وہ نام کا ہی مرد نہیں تھا۔

وہ اسے ساتھ لے کر جاتا...... پیچھے تو چھوڑ کر نہ جاتا...... اور ماں جی...... ماں جی کو ابھی تک اس کے اس ارادے کی بھنک نہیں پڑی تھی...... وہ تو بیٹے کی روانگی کی منتظر تھیں۔ ادھر وہ جہاز پر بیٹھتا...... اور ادھر انہوں نے آستینیں چڑھا لینی تھیں...... پھر وہ جو اس کا حال ہوتا...... وہ ایک زمانے نے دیکھنا تھا...... لیکن وہ...... احمد مرتضیٰ وہ کچے کام کرنے والا نہیں تھا...... وہ اپنی ماں جی کو بھی جانتا تھا اور خدیجہ کو بھی...... مرضی کی شادی...... لو میرج کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ بھئی ہم نے تمہیں پسند کیا...... زمانے سے جھگڑ کر تم سے شادی کی، اب تم تاوان بھرو...... ماں باپ کی خدمت فرمانبرداری اس پر فرض تھی...... اس کی بیوی کیوں تاوان بھرتی......؟ کہاں ناں...... وہ نام کا مرد نہیں تھا۔

''عورت کا تحفظ، اس کی زندگی کا سکون جتنا عورت کے ہاتھ میں ہوتا ہے...... اس سے کہیں زیادہ یہ مرد کے ہاتھ میں ہوتا ہے...... اگر مرد یہ بات سمجھ لے اور تاوان کا کام لینے کی بجائے عقل کو استعمال کرے تو Love marriages کے ٹوٹنے کی شرح کبھی بھی زیادہ نہ ہو۔''

☆......☆......☆

وہ انگاروں پر لوٹ رہا تھا...... اس کے خون میں شرارے دوڑ رہے تھے...... اس کے دماغ کی چولیں ہل گئی تھیں...... وہ...... وہ...... کہ جسے وہ ''ہار'' آیا تھا...... وہ ایک مزے کی، بھرپور زندگی گزار رہی تھی...... ایک نہایت ہی شاندار شخص کے ساتھ اور

وہ نذر حسین...... اس کا کیا ہوا...... وہ تو برباد ہو گیا تھا...... لٹ گیا تھا...... جیل کاٹ کر آیا تو کایا ہی پلٹی ہوئی تھی...... لوگ سرعام اس کے منہ پر تھوک دیتے تھے...... اسے گاؤں سے نکال دیا گیا...... اس کی زمین جائیداد گھر سب بک گیا...... وہ نوالے نوالے کو ترس گیا...... اور اس سب کا نتیجہ...... وہ خدیجہ کو قتل کر دے گا...... مار دے گا...... اس کے چہرے سے مسکراہٹ...... آنکھوں سے خوشی چھین لے گا...... وہ اسے یوں خوش نہیں رہنے دے گا...... لیکن نہیں...... وہ اسے کیوں مارے......

مر کر تو اس کا دکھ، غم ختم ہو جائے گا...... اسے زندہ رہنا چاہیے...... زندگی کو ''سہنا'' چاہیے...... پل پل سسکنا چاہیے...... تڑپنا چاہیے...... اور اس کے لیے اسے کیا کرنا تھا...... یہ کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں تھی...... وہ جانتا تھا...... مگر خدیجہ اور احمد مرتضیٰ نہیں جانتے تھے کہ دو شیطانی آنکھیں اب سے، ہر وقت...... ہر دم...... ان کی تاک میں ہیں...... وہ شیطان...... اور وہ دونوں اس کی شیطانیت کا شکار ہونے والے تھے۔

☆......☆......☆

''آپ کو لگتا ہے یہ ٹھیک ہے......؟'' وہ جیسے بہت بے بس ہو کر پوچھ رہی تھی، مگر وہاں جیسے کسی کو پرواہ ہی نہیں تھی۔

''ٹھیک لگتا ہے تبھی تو یہ فیصلہ کیا تھا نا......!'' وہ اس کے گال کو پیار سے چھو کر بولا تھا۔

''احمد......!'' اس نے زچ ہو کر کپڑے بیڈ پر پٹخے تھے۔ وہ اپنی اور اس کی پیکنگ کر رہی تھی۔ گھر بھر میں یہ بات احمد مجتبیٰ کے علاوہ اور کسی کو معلوم نہیں تھی کہ خدیجہ بھی احمد مرتضیٰ کے ساتھ جا رہی تھی۔

''ماں جی تو پہلے ہی میرے خلاف ہیں...... احمد! ایسے تو وہ اور بھڑکیں گی۔ مجھے یہاں رہنے دیں...... حالات کو ٹھیک کرنے دیں......'' وہ لہجہ التجائیہ تھا۔

اس بات پر اس نے رک کر خدیجہ کا چہرہ دیکھا...... چند لمحے دیکھتا رہا اور پھر ہاتھ پکڑ کر اپنے مقابل کھڑا کیا تھا۔

''تم نے مجھے خوش رکھنا ہے یا میری ماں کو......؟'' اس کے بالوں کی لٹ کو چہرے سے ہٹاتے ہوئے وہ پوچھ رہا تھا۔

''احمد......! میں......''

''شش......!'' اس نے ہونٹوں پہ انگلی رکھ دی......

''جو جس کسی کو ناپسند ہوتا ہے نا خدیجہ! وہ ناپسند ہی رہتا ہے...... کبھی پسند کی فہرست میں شامل نہیں ہو سکتا...... خدمت، اطاعت گزاری کسی اور کا دل تو بدل سکتی ہے، مگر میری ماں کا نہیں...... میں تم سے زیادہ جانتا ہوں انہیں...... جیسے جو ''پسند'' ہوتا ہے وہ کبھی ناپسند نہیں ہو سکتا، بالکل ایسے ہی ناپسندیدگی کو پسندیدگی میں نہیں بدل سکتے...... جو میں نے کیا ہے تمہارے اور اپنے لیے کیا ہے...... اپنی زندگی، تمہاری خوشی کے لیے کیا ہے...... ماں جی کا بیٹا میں ہوں اور میں انہیں بن کر دکھاؤں گا...... مگر یہ سب تمہاری

قربانی دے کر نہیں ہوگا......تم بس اپنے دماغ پر زور نہ دو......'' وہ اس کے سر کو ٹھوکا دیتے ہوئے بولا تھا۔

اس کی بات پر جہاں دل میں سکون اترا تھا......وہیں اس کی پریشانی کم تو ہوئی تھی مگر دور نہ ہو سکی تھی۔

☆......☆......☆

''ہائے اللہ بھابھی......! کتنی پیاری ہے نا یہ......اس کی آنکھیں تو دیکھیں ذرا......'' اور اس نے بڑھ کر ''خولہ'' کی دونوں آنکھیں چوم لیں......پھر اس کے گال پر پیار کیا تھا۔ وہ نومولود کو گود میں لے کر یوں خوش ہوئی کہ جیسے کوئی بچہ ہوتا ہے......اس نے نرمی سے، انگلی سے اس کے لبوں کو چھوا تھا۔ وہ خولہ تھی۔

احمد مرتضٰی لب دبائے......مسکراہٹ بھری آنکھوں کے ساتھ اسے تکتا تھا۔

''اللہ ہمارے احمد مرتضٰی کو بھی جلدی یہ خوشی دکھائے......'' وہ بھابھی کو خولہ واپس پکڑا رہی تھی تبھی ساجدہ نے کہا تھا......وہ جھینپ گئی تھی۔

''فرخندہ کو خبر کر دی......؟'' بچی کو پہلو میں لٹاتے ہوئے انہوں نے پوچھا تھا۔

''ہاں جی......! آ رہی ہے جہانگیر کو لے کر فیصل آباد سے......اب وہاں سے آنا بھی تو آسان نہیں......'' اس نے رسان سے جواب دیا۔

''کب ہے تم لوگوں کی فلائٹ......؟'' اور ان کے یوں پوچھنے پر خدیجہ کا رنگ فق ہوا۔ اس نے بے اختیار احمد مرتضٰی کو دیکھا۔

''بھابھی......! اس جمعے کو ہے......کل ہم خدیجہ کے گھر ملنے جائیں گے اور پرسوں صبح یہاں سے روانگی ہے۔'' اس کی بجائے احمد مرتضٰی نے جواب دیا تھا۔ وہ تو اڑی رنگت کے ساتھ، چور سی بنی بیٹھی تھی۔

''تمہیں کیا ہوا ہے......؟'' ساجدہ نے نرمی سے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما۔

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ روہانسی ہوئی۔

''کس سے......؟ احمد مرتضٰی سے......؟'' ساجدہ نے شرارت سے کہا۔

ساجدہ کی بات پر اس نے خفگی سے انہیں دیکھا اور پھر سر جھکا کر بولی۔

''ماں جی سے......''

''ابھی تک ڈرتی ہو خدیجہ......؟'' انہوں نے اس کا ہاتھ نرمی سے دبایا تھا۔

شادی کو کئی ماہ ہو چکے تھے۔ احمد دراصل جب دوہا سے نوکری چھوڑ کر آیا تو دوبئی میں اسے کوئی ڈھنگ کی نوکری نہیں ملی تھی......وہ چھوٹے موٹے کام کر کے گزارا کر رہا تھا......اب آتے ہوئے اس نے ایک کمپنی میں اپلائی کیا تھا......اب جا کر وہاں

نوکری ہوئی تھی......اس لیے اسے پاکستان آئے کئی ماہ گزر چکے تھے۔

''ابھی تک کیا بھابھی......! میں تو ساری عمر ہی ان سے ڈرتی رہوں گی......وہ یوں دیکھتی ہیں جیسے میں نے ان کا کچھ چرا لیا ہے......'' وہ بے بسی سے مدھم لہجے میں بول رہی تھی۔

''چرا تو لیا ہے نا...... یہ پانچ فٹ نو انچ کا آدمی......'' احمد مرتضٰی شرارت سے بولا تو وہ بری طرح سے جھینپی تھی۔ بھابھی ہنس دیں۔

''جو احمد مرتضٰی نے کیا......وہ ہی ٹھیک ہے خدیجہ...... پریشان نہ ہو......احمد کے یہاں ہوتے ہوئے بھی تم نے ان کا رویہ دیکھ لیا......سوچو بعد میں کیا کریں گی، اس لیے خوشی خوشی جاؤ۔'' وہ اسے پچکارتی ہوئی بولی تھیں۔

''چلیں! وہ بات تو ٹھیک ہے مگر انہیں ماں جی کو بتا دینا چاہیے...... یوں چھپانا نہیں چاہیے۔''

''بتا کر گھر کا ماحول خراب کرتا......اتنے دن جو آرام سے گزر گئے ہیں نا اسی وجہ سے گزرے ہیں کہ انہیں معلوم نہیں، ورنہ......''

احمد مرتضٰی نے بات ادھوری چھوڑ کر سر جھٹکا تھا۔

''اللہ سب خیر کرے گا پریشان نہ ہو......'' ساجدہ نے اس کا سر تھپکا تھا۔

☆......☆......☆

رات سنسان تھی مگر چاند جوبن دکھلاتا تھا۔ چودھویں کا سماں تھا اور وہ دونوں......خدیجہ کے گھر سے واپسی پر آتے ہوئے دیر ہو گئی تھی...... 11 بج چکے تھے اور اس وقت 11 بجنے کا مطلب تھا گاؤں میں آدھی رات...... مگر انہیں کیا پروا......وہ خود میں مگن......باتیں کرتے ہوئے...... ہنستے ہوئے چلے آ رہے تھے۔

''میرا دل چاہتا ہے کہ ہماری پہلی بیٹی ہو...... ہو بہو تمہاری آنکھوں جیسی......'' اس نے ہلکے سے اس کی آنکھوں کو چھوا......وہ ہنس دی اور اس کی کھنکھناتی ہنسی سناٹے میں دور تلک سنائی دی تھی۔

''اور پتا ہے میرا جی کیا چاہتا ہے......؟'' خدیجہ نے شرارت سے لب دبایا۔

''کیا......؟''

''بیٹا ہو...... بالکل ایسی ناک والا۔'' اب کی بار اس نے احمد کی ناک کو چھوا تھا۔ وہ زور سے ہنس دیا۔

''جانِ من! یوں تو میرے ساتھ کبھی نہ ہنسی تھیں تم......؟'' اور وہ دونوں اس آواز پہ کرنٹ کھا کر مڑے تھے۔

خدیجہ اس آواز کو لاکھوں کیا کروڑوں میں پہچان سکتی تھی۔

http://kitaabghar.com

''نذر......!''اس کے لب بے آواز ہلے اور وہ ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ کر بے اختیار لڑکھڑائی تھی۔احمد نے اس کی بکواس پر لب بھینچے اور خدیجہ کو ایک ہاتھ سے اپنے پیچھے کیا تھا۔

''کوئی مسئلہ ہے کیا......؟''اس نے سختی سے پوچھا۔

''مسئلہ تو بہت بڑا ہے......''اس نے احمد کے کندھے کے پیچھے اک خباثت بھری نظر ڈالی تھی اور احمد کی کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔

''بڑا ساتھ لے کر پھر رہے ہوا سے......بیوی تو کبھی میری بھی تھی اور......''

اور اس کے آگے اس نے بڑی فحش سی بات کی تھی خدیجہ کے متعلق......دماغ تو احمد کا گھوما تھا مگر خدیجہ کی موجودگی اسے کمزور کر رہی تھی۔

''اب اگر تم نے......خدیجہ کا نام بھی اپنی زبان سے نکالا تو اگلا سانس نہیں لینے دوں گا......''وہ غرایا۔

''اچھا......!''نذر کمینگی سے ہنسا۔

''تو پھر یہ لو......خدیجہ......خدیجہ......خد......یجہ......''وہ اک لے میں پڑھنے لگا تھا......اور احمد......

اس نے آگے بڑھ کر رکھ کر گھونسا اس کے منہ پر دے مارا تھا۔

''احمد......!''خدیجہ چیخی تھی اور اس کی قمیص سے پکڑ کر اسے روکنا چاہا مگر......اس کے روکنے سے وہ رکتا تھا بھلا......اس نے نذر کا گریبان پکڑ رکھا تھا اور وہ ہنستا جا رہا تھا۔

''ابھی تو میں نے نام لیا ہے تو اتنا غصہ......اگر کچھ اور کہا تو......''

اور وہ اگلی بات مکمل نہ کر سکا۔ابھی پڑنے والے گھونسے سے اس کا ہونٹ بری طرح پھٹا تھا اور وہ پشت کے بل زمین پر گرا تھا......اس نے انگلی سے ہونٹ پر بہنے والا خون صاف کیا اور اک نظر احمد مرتضیٰ کو دیکھا......وہ اسے قتل کرنے آیا تھا اور ہو گیا رہا تھا......طیش سے اس نے نیفے میں اڑسا چاقو نکالا۔

''نذر نہیں......!''خدیجہ یک دم احمد کے سامنے آئی تھی۔

''جانتا ہوں تیری جان اس طوطے میں ہے......اسی لیے تو اس کا قصہ ختم کرنے آیا ہوں......حرامزادی......مجھے ڈبو کر خود عیش منا رہی ہے......''وہ پھنکارا تھا۔

''حرام کا تو تو ہے اور حرام کی موت ہی مرے گا......''احمد نے خدیجہ کو پیچھے ہٹایا اور اس کی جانب بڑھا تھا۔

''احمد......!''خدیجہ نے یک دم روتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکا۔

اس نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑایا۔

http://kitaabghar.com http://kitaabghar.com

''چل اٹھ......آ......شاباش......دیکھ تیرے سامنے ایک مرد کھڑا ہے مرد......جس نے دن کے اجالے میں اک عورت کو عزت دی ہے......تیری طرح کی بے غیرتی نہیں کی......مرد ہے تو اٹھ......اٹھ شاباش......!'' وہ اسے پچکار رہا تھا......اشتعال دلا رہا تھا......اور وہی ہوا......

نذر طیش کھا کر اٹھا تھا۔ اس نے سیدھا چاقو احمد کے سینے میں گھسانا چاہا مگر وہ چوکنا تھا......اس نے وہ ہی چاقو والا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے سختی سے کس کر مروڑ دیا۔ اور گھٹنے پر رکھ کر جب جھٹکا دیا تو چاقو دور جا گرا۔

''خدیجہ......! چاقو اٹھاؤ......'' اس نے تیز آواز میں، اس کا ہاتھ مروڑتے ہوئے کہا تھا۔ خدیجہ نے چاقو تو اٹھا لیا مگر اس کے ہاتھ کانپتے تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے چاقو تھامے......لرزتی ہوئی کھڑی تھی۔

''اب کر بکواس......بول اب......!'' احمد نے رکھ کر گھٹنا نذر کے پیٹ میں مارا تھا۔ وہ تکلیف سے دوہرا ہوا......اور پھر ہنسنے لگا۔

''یہ نا......بڑی مست چیز ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے لوفرانہ انداز میں آنکھ ماری اور ایک فحش اشارہ کیا تھا۔

''کمینے......کتے......'' احمد تو جیسے پاگل ہوا تھا۔

''خون پی جاؤں گا تیرا......چیر کر کتوں کے آگے ڈال دوں گا جواب تو نے کوئی گھٹیا بات کی......'' وہ پیٹتا رہا اور ہنستا رہا اور جب مار مار کر احمد تھک گیا اور وہ ادھ موا ہو گیا تو احمد نے پاؤں کی ٹھوکر سے اس کا وجود پرے گرایا تھا۔

وہ چند لمحے گرا ہانپتا رہا اور احمد کو جب یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ اپنے پیروں پر اب کھڑا نہیں ہو سکتا تو وہ مڑ گیا۔

وہ مڑا ہی تھا کہ نذر پھر سے ہنسنے لگا۔ اور یوں ہی ہنستے ہنستے اس نے ایک نہایت ہی غیر موزوں بات خدیجہ کے بارے میں کہی تھی۔ خدیجہ کٹ کر رہ گئی۔ چاقو اس کے ہاتھ سے گر گیا اور وہ منہ چھپا کر رونے لگی۔ احمد ابھی تک ساکت کھڑا تھا اور اس کے کانوں میں وہ ہنسی کی کریہہ آواز گونجتی تھی......اس کے جبڑے بھنچ گئے......کنپٹی کی رگیں ابھر آئیں......ہاتھ کی مٹھیاں اتنی سختی سے بند کی تھیں کہ سرخی جھلکنے لگی۔ اس نے جھک کر خدیجہ کے پیروں میں گرا چاقو اٹھایا۔

''احمد نہیں......!'' خدیجہ نے سراسیمہ ہو کر کہا۔

اس نے پیچھے سے اس کی قمیص دبوچی مگر اس نے خدیجہ کو بری طرح جھٹک دیا۔ پاؤں کی ٹھوکر سے نذر کو سیدھا کیا......اس کے سینے پر گھٹنا رکھتے ہوئے چاقو اس کے نرخرے پر رکھ دیا۔

''ذرا پھر سے بولنا......میں نے سنا نہیں......کیا تم نے کچھ کہا؟''

اس کی آواز موت کی سی سرد تھی۔

نذر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا اور پھر...... پھر اس نے وہ ہی بات دہرائی اور دہراتا گیا اور پھر...... احمد کا ہاتھ اٹھا......اور اس کے سینے میں چاقو نصب ہو گیا......وہ غصے سے اتنا پاگل ہو گیا تھا کہ پے در پے اس کے سینے پر کئی وار کیے تھے۔

اس رات کی سیاہی میں ایک نسوانی چیخ گونجی تھی۔

''تم نے اسے مار دیا......'' اور وہ خوف سے کہتی تھی۔

اس آواز پر احمد نے حیرانی سے اپنے ہاتھوں کو دیکھا اور چاقو اس کے ہاتھوں سے دور جا گرا......اور چاقو گرنے کی آواز سناٹے میں دور تلک سنائی دیتی تھی......وہاں زمین سرخ رنگ سے رنگی جا رہی تھی۔

☆......☆......☆

''تم نے یہ کیا کیا احمد......'' اس کے ہاتھ سلاخوں پر گھسٹتے تھے اور وہ بے دم ہو کر نیچے بیٹھی تھی۔

اور احمد...... ہاتھوں میں ہتھکڑیاں...... پاؤں میں بیڑیاں اور وہ دیوار سے پشت لگائے...... کہنیاں، گھٹنوں پر ٹکائے بے حس سا بیٹھا تھا......یوں جیسے سامنے اس کی ''محبت'' نہیں کوئی اور تھا۔

''مت کرو ایسا...... ہاتھ جوڑتی ہوں......!'' اس نے سلاخوں میں سے جڑے ہاتھ بڑھائے، اس نے ذرا سی گردن موڑ کر دیکھا۔

''یہ ہاتھ......!'' تکلیف سے آنکھیں موند کر اس نے سر دیوار سے ٹکایا۔

''معاف کر دینا مجھے......خدیجہ معاف کر دینا، میں نے تمہارے ساتھ نذر سے بھی برا کیا......'' آواز سیلن زدہ تھی...... بھاری تھی......بوجھل تھی، مگر اٹل تھی۔

''احمد......!'' وہ سلاخوں سے ماتھا ٹکرا اور شدت سے روئی۔

''اعترافی بیان مت دو......خدارا یہ ظلم نہ کرو......کیا چاہتے ہو؟ سانس نہ آئے مجھے؟''

وہ چپ رہا۔

''احمد......! میں پکار رہی ہوں......تم سن رہے ہو؟'' اس کا وجود بے حس و حرکت تھا۔ پلکوں میں لرزش تک نہ تھی۔

''احمد......!'' اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے چھونا چاہا مگر وہ اس کی پہنچ سے دور تھا۔ خدیجہ کا دل پھٹ گیا۔

اس کا رونا......اس کی آواز......اس کی آہ و فریاد......اس کا پیار...... کچھ بھی تو اس پر اثر نہ کر رہا تھا۔

وہ چند لمحے سسکیاں بھرتے اس کے چہرے کو تکتی رہی اور پھر بولی۔

''جانتے ہو......تم باپ بننے والے ہو......'' اس کے ہونٹ کانپتے تھے......اس نے ایک دم آنکھیں کھولیں اور مڑ کر

خدیجہ کو دیکھا اور جب دیکھا تو......کیسی حسرت ان آنکھوں میں دم مارتی تھی، تڑپتی تھی...... یوں جیسے شعلہ بجھنے سے پہلے پھڑ پھڑاتا ہے۔ ایسے جیسے کوئی زندہ رہنے کی شدید خواہش رکھتا ہو مگر موت کے شکنجے میں ہو......پہلی بار آنسو اس کی آنکھ سے پھسل کر اس کی ٹھوڑی سے ٹپکا تھا۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کو یک ٹک تکتے تھے۔

وہاں اک "نار" تھی جو بھڑک رہی تھی اور اب کہ کون سا وجود اس کا ایندھن بننے جا رہا تھا......کون سا؟

☆......☆......☆

احمد کے گھر والے چاہتے تھے کہ اس کیس کو سیلف ڈیفینس کا رنگ دیا جائے اور احمد بھی یہی بیان دے اور یہاں آ کر سب کچھ غلط ہو گیا......غلط سے بھی زیادہ غلط ہو گیا۔

"احمد اپنا جرم قبول کرنا چاہتا تھا۔"

وہ جانتا تھا کہ یہ سیلف ڈیفینس نہیں تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اللہ بھی یہ بات جانتا تھا......تو کل کو جب سوال ہو گا تو وہ کیا جواب دے گا؟

نہیں......نہیں......وہ اپنی زندگی کے بدلے جہنم کی آگ نہیں خرید سکتا تھا۔ نہیں خدیجہ کے لیے وہ یہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اشتعال میں آ کر قتل کیا تھا......وہ مشتعل تھا اور اس کے سامنے ایک نہتا آدمی تھا۔ بھلے وہ اس کے قتل کے ارادے سے ہی آیا تھا مگر اس وقت وہ نہتا تھا......اسے کفارہ ادا کرنا تھا......خود کو پاک کرنا تھا......اسے دوزخ کا ٹکٹ نہیں خریدنا تھا......اسے تبھی خدیجہ کا خیال کرنا چاہیے تھا کہ جب وہ نذر کے سینے پر چڑھا...... بے دردی سے چاقو کے وار کر رہا تھا۔ اسے تب خدیجہ کا خیال کرنا چاہیے تھا، اسے تب خیال نہیں آیا تھا......تو اب بھی نہیں آنا چاہیے......وہ کیسا تکلیف بھرا دل لے کر مرے گا......اوہ خدا......کیسا تکلیف بھرا دل۔

اس کا بچہ......خدیجہ......اوہ خدایا......وہ ان دونوں کو کیا دے کر جا رہا تھا......کیا؟

☆......☆......☆

جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوئی، ماں جی تیر کی طرح اس کی طرف بڑھی تھیں۔

"خدیجہ......!مانا احمد......؟" اور اس نے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ نفی میں سر ہلایا تھا۔ ماں جی حق دق رہ گئیں اور پھر......

"بے غیرت، کمینی، رذیل......تیری وجہ سے......تیری وجہ سے ہوا یہ سب کچھ......نہ تو ہوتی......نہ یہ سب ہوتا......تیری وجہ سے میرا گھبرو جوان پتر جیل میں پڑا ہے......تیری وجہ سے اس نے قتل کیا......اسے نہیں تجھے موت آنی چاہیے......" وہ دونوں ہاتھوں سے اسے پیٹ رہی تھیں اور وہ چپ چاپ ان سے مار کھائے جا رہی تھی۔

''کہتی ہے مانا نہیں......ارے تیری مان مان کر ہی تو ان حالوں کو پہنچا ہے میرا بچہ......زندہ نہیں چھوڑوں گی میں تجھے کتی......'' اب کے ہاتھ اس کے گلے پر تھے۔ وہ مزاحمت نہیں کر رہی تھی......بس کھڑی اکھڑے اکھڑے سانس بھرتی رہی۔

''ماں جی......!'' ساجدہ چیخ کر آگے بڑھی۔

''چھوڑ دیں......چھوڑ دیں اسے......اللہ کا واسطہ ہے چھوڑ دیں......'' وہ ان کا ہاتھ اس کی گردن پر سے ہٹانے کی کوشش میں ناکام ہو رہی تھیں اور خدیجہ کا چہرہ لال ہو رہا تھا......اس کا دم گھٹ رہا تھا مگر وہ سوچتی تھی اچھا ہے وہ مر جائے......

''ماں جی......چھوڑ دیں......یہ امید سے ہے۔''

اور ماں جی کا منہ کھلا......پھر ہاتھ میکانکی انداز میں ڈھیلے ہوئے۔ ساجدہ نے ترنت اسے پیچھے گھسیٹا......وہ بے دم ہو کر لڑکھڑا گئی تھی۔

''میرے احمد مرتضٰی کا بچہ......!'' ماں جی بے آواز بڑبڑائیں اور پھر سر پر ہاتھ رکھ کر رونے لگیں......اور ان کا رونا......ایسا تھا کہ جیسے کافور کی مہک اس کے گھر کے در و دیوار سے لپٹ کر پھیل رہی ہو۔

☆......☆......☆

''آخری خواہش پوچھی گئی تھی......''

اور یہ زندوں سے تو نہیں پوچھی جاتی نا......اس نے کہا بیوی سے ملنا چاہتا ہوں۔

وہ اس دن کے بعد سے نہیں آئی تھی......وہ جانتا تھا کہ یہ ناراضی نہیں تھی......یہ دکھ تھا......غم تھا۔ وہ اسے اس حال میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ جانتا تھا......اور آخری خواہش کو تو پورا کرنا ہی ہوتا ہے نا......اس کی بیوی جیل آنے پر آمادہ نہیں تھی......وہ گھر کیا آیا تھا......سمجھو قیامت ساتھ لایا تھا۔

وہ کمرے سے باہر نہیں نکلی......گھر کے در و دیوار سمٹ رہے تھے......وہ اس کے وجود کو کچل کر رکھ دینے کے درپے تھے۔ وہ ایک کونے میں سکڑی سمٹی......سانسوں کو گنتی آنکھیں زور سے میچے بیٹھی تھی۔ اندھیرا چھا رہا تھا۔ دیواریں اس کے اوپر آ رہی تھیں۔ وہ دونوں ہاتھوں سے انہیں روکنا چاہتی تھی مگر ہاتھ بے جان تھے۔

''خدیجہ......!'' کسی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا......ہتھکڑیاں جھنجھنا اٹھیں۔ تکلیف کی ایک شدید لہر اس کے پیٹ کے نچلے حصے سے اٹھ کر معدے تک آئی تھی۔ اس نے سر نہیں اٹھایا......اور مضبوطی سے دونوں گھٹنوں کو جکڑ لیا تھا۔ وہ ساری عمر......اسی ایک ہاتھ کے لمس تلے گزار دینا چاہتی تھی۔ وہ لمس زندگی تھا......مردہ تن میں پھونکی جانے والی حرارت تھی۔

''خدیجہ......! ایک دفعہ اپنا چہرہ دیکھنے دو......ایک دفعہ......'' وہ ملتجی ہوا۔

اس نے سر اور گھٹنوں میں چھپایا۔اس کا بدن کانپ رہا تھا۔دیواریں جیسے لمحہ بہ لمحہ سرک رہی تھیں۔وہ ٹس سے مس نہ ہوئی اور ہتھکڑیاں ایک دفعہ پھر جھنجھنا اٹھیں۔اب کی بار سر سے ہاتھ ہٹا......احمد نے یوں ہی اسے بازوؤں میں سمیٹا تھا۔سینے سے لگا کر آنکھیں بند کر کے محسوس کیا تھا......یوں جیسے وہ اپنی سانس سانس میں اس وجود کی مہک بھر لینا چاہتا تھا۔

''مجھے معاف کر دینا......معاف کر دینا......میری بیٹی کو بتانا کہ اس کا بابا اسے بہت پیار کرتا ہے......اسے میری قبر پر لانا اور کہنا کہ تمہارا باپ قاتل ضرور تھا مگر اس نے کفارہ بھی بھرا تھا۔وہ مزید مجرم نہیں رہا تھا۔وہ موت سے بھی نہیں ڈرا تھا۔اس نے بہادروں کی طرح اپنے جرم کا اقرار کیا تھا......اور ہاں......اپنی آنکھوں جیسی والی بیٹی کا نام ''مزنہ احمد'' رکھنا......'' سرگوشی نما آواز اس کے کانوں میں ابھرتی تھی مگر وہ بے جان تھی۔اس کے پورے بدن میں عجیب سے دھماکے ہو رہے تھے......یوں جیسے ہر اک خلیہ پھٹ رہا تھا۔

وہ ذرا سی دیر کو رکا......اس کا آنسو خدیجہ کے بالوں میں مدغم ہوا۔اس نے خدیجہ کا سر چوما اور اٹھ کھڑا ہوا......ہتھکڑیوں کا شور پھر بلند ہوا......خدیجہ کی ساری جان یوں جیسے اس کے پیروں میں آن سمٹی تھی......وہ جا رہا تھا۔

''احمد......!'' اس کی چیخ دلخراش تھی۔بھاگ کر اس نے احمد کو پیچھے سے دونوں بازوؤں سے جکڑا تھا۔

''نہیں......نہیں......میں نہیں جانے دوں گی......نہیں......!''

وہ اس کی پشت سے چہرہ ٹکائے......کسی ہرنی کے بچے سے بھی زیادہ سہمی ہوئی تھی۔

احمد نے تکلیف سے منہ پر ہاتھ رکھے......وہ رونا چاہتا تھا......دھاڑیں مار مار کر رونا چاہتا تھا اور......مگر اس نے کیا کیا......

اس نے زبردستی خدیجہ کے خود پر بندھے ہاتھ کھولے تھے۔

''مجھے لے جائیں......'' اور خدیجہ کی مزاحمت کو اپنے ہاتھوں سے روکتے ہوئے باہر کھڑے سپاہیوں سے چلا کر کہا تھا۔اور اس کے آنسو......اس کا گریبان بھگونے لگے تھے،سپاہی آئے۔

''نہیں......نہیں......خدارا......میں منت کرتی ہوں......مت لے کر جاؤ......اللہ رسول کا واسطہ ہے تمہیں......ہاتھ جوڑتی ہوں......یہ......یہ چادر پھینکتی ہوں تمہارے پیروں میں اور اس نے اپنی چادر اتار کر سنتریوں کے پیروں میں پھینک دی۔

احمد منہ پر ہاتھ کی مٹھی رکھ کر رو دیا......مارے ضبط کے اس کا چہرہ سرخ تھا۔اس نے آگے بڑھ کر چادر اٹھائی اور خدیجہ کے سر پر اوڑھاتے ہوئے......ایک آخری نظر اس چہرے پر ڈالی......

''احمد نہیں......!'' وہ سمجھ کر بدکی۔اس نے نظر ہٹالی۔

''احمد......نہیں......نہیں۔'' اور اسے گے بڑھ کر دو خاتون اہلکاروں نے پکڑ لیا تھا۔وہ حق دق رہ گئی......چند لمحے گہرے

http://kitaabghar.com

سانس لیتی ان کے چہرے دیکھتی رہی اور پھر......

''مجھے جانا ہے......چھوڑو......جانے دو......احمد......اح......مد......''

اور اس کی چیخ سے ہرے بھرے پیڑ ایک دم خزاں رسیدہ ہوئے۔ان پر سوکھا پڑا تھا......کمرے کی دیواریں اک دھماکے سے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرائیں اور اس کا وجود ان دیواروں کے مابین تھا۔وہ لہرا کر گری تھی۔کافور کی مہک بڑی زور آور تھی۔یوں جیسے اس مہک کی طفیلی بیلیں اس کے وجود سے چمٹ کر تیزی سے بڑھنے لگی تھیں۔اور اس کا وجود ان طفیلی سیاہ، بدہیت بیلوں کے بوجھ تلے دبتا جا رہا تھا۔وہ بے ہوش ہو چکی تھی مگر ناک کی نتھنے اس تیز مہک کو پہچانتے تھے۔

جس دھج سے کوئی مقتل کو گیا......وہ شان سلامت رہتی ہے۔

☆......☆......☆

وہ پیروں پر چل کر گیا تھا......پیروں پر چل کر واپس نہیں آیا تھا۔

وہ کاندھوں پر لایا گیا تھا......آہ......احمد مرتضیٰ......آہ......کیا حسین......خوابوں بھری آنکھیں تھیں جو بند ہو چکی تھیں......کیا ہی خوبصورت وجاہت بھرا چہرہ تھا جو کہ موت کی زردی سے کھنڈ چکا تھا......کیا کڑیل جوان تھا......اور یوں چارپائی پر پڑا تھا۔ماں کا کلیجہ پھٹتا، کم تھا۔بہن کپڑے پھاڑ کر جنگلوں میں جا نکلتی، کم تھا......بھائی دیواروں سے سر ٹکراتا تھا......یہ بھی کم تھا اور وہ......وہ خدیجہ اس کے ساتھ ذرا آسانی والا معاملہ ہو گیا تھا۔وہ بے ہوش تھی......ابھی تک بے ہوش تھی......اور وہ اسی بے ہوشی میں دفنا دیا گیا......وہ ایک جیتے جاگتے انسان سے......قبر کا تختہ بن گیا تھا......وہ نہیں رہا تھا......پھانسی چڑھ گیا تھا۔

اس کے بعد......اس کے بعد کیا......زندہ رہنے والوں کی بھی کوئی زندگی تھی۔وہاں......اس گھر میں تا دم مرگ تھا......سوگ کا اعلان تھا۔وہاں اب کوئی آواز نہ تھی......کوئی زندگی کی رمق نہ تھی۔بس ایک خولہ تھی جس کی قلقاریاں اور رونا گونجتا تھا۔وہ زندگی نہیں......کابوس تھی۔وہاں ہر دم کافور کی مہک دھمال ڈالتی تھی۔یوں جیسے کوئی اور مرنے والا ہو......یوں جیسے کسی اور کے وجود کو کافور کی آکاس بیلیں گرفت میں لینے والی ہوں۔

☆......☆......☆

''کھا گئی......مار گئی میرے بچے کو......تجھے میں کتے کی موت ماروں گی......''

وہ ماں جی سے پٹ رہی تھی اور پٹتی جا رہی تھی......اسے ماں جی کے سامنے نہیں آنے دیا جاتا مگر جانے کیسے آج خدیجہ سامنے آ گئی تھی۔

''کمینی......بے غیرت......کتی......کھا گئی۔''وہ اب اسے ٹھڈے مار رہی تھیں۔

''ماں جی...... ماں جی......!'' ساجدہ دوڑتے ہوئے آئیں۔ اپنے وجود سے، اپنے ہاتھوں سے اسے بچانے لگیں۔

''ماں جی! احمد مرتضیٰ کا بچہ ہے...... اسے نقصان ہوگا...... ماں جی......'' وہ بلکتی تھیں اور جس کا بچہ تھا اسے پرواہی نہیں تھی۔ وہ ہوش وخرد سے بیگانہ...... زمین پر ہاتھوں کے بل گری تھی۔ گالوں کی ہڈیاں اندر دھنس چکی تھیں۔ ہونٹوں پر پپڑی جمی تھی...... نقاہت اتنی کہ وہ آنکھیں بھی کھول نہیں سکتی تھی۔ وہ کھاتی ہی نہیں تھی۔ یہ ساجدہ ہی تھیں جو مجبوراً نوالہ نوالہ...... گھونٹ گھونٹ کھانا، مائع اس کے حلق سے نیچے اتارتی تھیں۔ وہ تو جیسے کوئی روبوٹ تھی۔ جو جیسا کہتا کرلیتی...... اس کے سارے رنگ کھو چکے...... ساری حسیات سن ہو چکیں...... اسے درد محسوس ہوتا نہ تکلیف۔ اس کے ناخن خطرناک حد تک سفید ہو چکے تھے۔ خون کی شدید کمی تھی اور اس کا وقت نزدیک تھا۔

☆......☆......☆

سر کے بالوں سے لے کر پیر کے انگوٹھے تک...... وہ پسینے میں بھیگی ہوئی تھی۔ وہ اپنے چہرے، گردن کی پشت اور جسم پر آیا پسینہ لکیر کی صورت بہتا محسوس کرسکتی تھی۔ اتنا پسینہ کہ اس کی پلکوں پر بھی نمی کے قطرے موجود تھے۔ اسے سانس نہیں آرہی تھی۔ وینٹی لیٹر پر ہونے کے باوجود سانس نہیں آرہی تھی اور ہر دو سیکنڈ پر اسے اِک لمبی سانس کھینچ کر تنفس کے عمل کو بحال رکھنا پڑ رہا تھا۔ اس نے آہستگی سے پلکیں جھپکیں...... منظر دھندلا سا تھا۔ کچھ لوگ تھے، کچھ آوازیں...... اس نے ایک اور لمبی سانس کھینچی...... سب کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا۔ سب کچھ...... گہری، گہری سانس لیتے ہوئے وہ اپنی پلکوں کو بند ہونے سے روک رہی تھی مگر غنودگی زور آور تھی۔ وہ نیم بے ہوشی کی سی کیفیت تھی یا پھر...... یا پھر شاید وہ مر رہی تھی۔

اس نے پھر سے پلکوں کو جھپکا اور اب کی بار وہ انہیں کھول نہ سکی تھی مگر اس سے پہلے اس نے کسی کے رونے کی آواز سنی تھی۔ اس کے ہونٹ بِنا آواز ہلے تھے۔ اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا اور اسے محسوس ہوا جیسے اس کے جسم کو کسی اندھی، گہری تاریک کھائی میں پھینک دیا گیا ہو اور پھر...... پھر یک دم روشنی، اِک جھماکے کی سی صورت پھیلی تھی۔ آنکھوں کو چندھیا کر رکھ دینے والی روشنی...... اور پکچر جیسے ریوائنڈ ہونے لگی تھی۔ دور کہیں...... بہت دور کسی پاتال میں یا شاید کسی گہری قبر میں دفن ماضی میں......

اِک جوان نسوانی ہنسی گونجی...... اور اس نے خوشبو محسوس کی...... دل فریب، بے حد بھلی سی خوشبو...... اس کی خوشبو......

''تم آگئے؟'' اس نے رخ موڑے بِنا کہا...... اور اس کی آواز یوں گونجی تھی کہ جیسے کسی گنبد میں گونجتی ہے۔ وہ حیران ہوا۔

''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟'' وہ مسکرائی اور اب کی بار رخ موڑا۔

''تمہاری خو......ش......ب......ووو...... سے۔'' لفظ بازگشت کی صورت گونجے اور اس کے چاروں طرف پھیل گئے۔ منظر کے رنگ بگڑنے لگے اور بگڑ کر اِک نیا منظر تخلیق کرنے لگے...... رنگ مجسم ہوئے اور یکجا ہو کر تصویر پر ابھرنے لگے، بامعنی

انداز میں، وہ ساکت بِنا حرکت کیے کھڑی تھی اور اسے دیکھتی تھی۔

اس کی آنکھوں میں موجود جذبہ اتنا خوبصورت، اتنا پُر شدت تھا کہ نظر ہٹتی نہ تھی۔ آنکھ جھپکتی نہ تھی۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھایا اور اس کی آنکھوں پر رکھ دیا...... وہ بے اختیار مسکرایا۔ اس نے ہاتھ ہٹایا نہ تھا۔

"یہ کیا ہے؟" وہ پوچھتا تھا۔

"تاب کہاں سے لاؤں؟" اور جواب سرگوشی کی صورت گونجتا تھا۔ وہ ہنس پڑا...... اک قہقہہ لگا کر اور پھر جیسے سفید، سچے موتیوں کی کوئی لڑی ٹوٹ سی گئی تھی۔ اور وہ دونوں ہنستے تھے...... کھن کھنا کھن...... کھن، کھن، کھن...... منظر دھواں بنا، تحلیل ہوا...... سب رنگ اڑ گئے اور اب وہاں صرف اِک رنگ تھا۔ صرف اِک رنگ...... سرخ رنگ خون...... بھل بھل بہتا خون...... اِک زوردار نسوانی چیخ رات کی تاریکی میں گونجتی چلی گئی۔

"تم نے اسے مار دیا......" وہ خوف اور دہشت سے بولی اور قتل کرنے والے کے ہاتھ سے چاقو نیچے جا گرا...... دور تلک چاقو کے گرنے کی آواز گونجتی چلی گئی تھی اور اس کی بند آنکھوں کے کناروں سے نمی پھسلتی چلی گئی اور یہ اس کے آخری آنسو تھے۔ جو اس نے بہائے...... زندگی کے آخری آنسو......

مگر اس سے پہلے اس نے کسی کے رونے کی آواز سنی تھی۔ اس کے ہونٹ بِنا آواز ہلے...... وہ آواز بڑی واضح اور صاف تھی...... اور جیسے اس کی سماعتیں وہ ہی اک آواز سننے کے لیے سلامت تھیں۔ اس کے ہونٹوں نے بن آواز کے پکارا تھا۔

"میرا بچہ......!"

اور پھر وہ اپنے بچے کو دیکھ بھی نہ سکی تھی، چھونا تو دور کی بات...... وہ محسوس تک نہ کر سکی...... اور اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا...... یوں جیسے اس کے جسم کو کسی اندھی، گہری، تاریک کھائی میں پھینک دیا گیا ہو...... وہ نیچے ہی نیچے گرتی جا رہی تھی...... یہ جانے بنا کہ اس نے ایک بچی کو جنم دیا تھا...... اس کی بیٹی...... ہو بہو اس کی آنکھوں والی...... ویسی ہی خوبصورت، دل کش اور بڑی بڑی آنکھوں والی...... اس کی بیٹی...... مزنہ احمد......

☆......☆......☆

وہ بچ جاتی...... یہ معجزہ ہوتا...... اسے احمد کے پاس جانا تھا...... چلی گئی۔ اسے سکون مل گیا تھا۔ اس کا عذاب کم کر دیا گیا تھا۔

ساجدہ نے مزنہ کو یوں سینے میں بھینچا کہ جیسے وہ ان کے وجود کا حصہ تھی۔ ابھی چند ہی ساعتوں پہلے...... آپریشن روم میں جانے سے پہلے اس نے ساجدہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا......

"میری مزنہ آپ کے حوالے......"

کتنا یقین تھا نا اسے اپنے مرنے کا......

وہ ان ہی کی دوسری بیٹی تھی۔ مزنہ پیدا ہونے سے پہلے ہی اپنے لیے ہمدردی کا ووٹ حاصل کر چکی تھی۔ اس کے ماں باپ کے ساتھ جو ہو چکا تھا، اس کے بعد اسے ہتھیلی کا چھالہ بنا کر پالا گیا تھا۔

خولہ کو بھی اس سے پیار کرنے...... اسے سنبھالنے کا درس دیا گیا۔ وہ لوگ اس واقعے کے کچھ عرصے بعد اپنی بچی کچھی عزت سمیٹ کر فیصل آباد شفٹ ہو گئے تھے۔ احمد مجتبیٰ نہیں چاہتے تھے کہ مزنہ کی طرف انگلیاں اٹھیں۔ وہ دیکھو قاتل کی بیٹی...... وہ دیکھو اس کے باپ کو پھانسی ہوئی تھی۔ اس کی ماں ایسی تھی...... ویسی تھی...... وہ مزنہ کو کسی بھی قسم کے احساس محرومی کا شکار ہونے نہیں دینا چاہتے تھے۔ وہ لوگوں سے، ان کی زبانوں سے اور ان کی زبانوں سے پھیلنے والے شر سے بچا کر لے آئے تھے۔ پھر اس گھر کو بھول گیا کہ مزنہ خولہ کی بہن نہیں کزن تھی۔ وہ ایک گھر میں...... ایک جگہ...... ایک ہی معیار پر پروان چڑھی تھیں۔ وہ تایا کو ابو اور ساجدہ کو امی کہتی تھی۔ اسی ایک حادثے نے مزنہ کو اتنا اہم بنا دیا کہ اسے خولہ پر ترجیح دی جاتی۔ اور خولہ اتنی ''بیبا'' سی بچی تھی کہ کبھی ضد نہیں کی...... روئی نہیں...... اس نے کبھی عام بچوں کی طرح ردعمل ظاہر نہیں کیا۔

صبر جیسے اسے اوپر سے پلا کر اتارا گیا تھا۔ اس نے ہمیشہ مزنہ کا خیال ہی رکھا تھا۔ اور وہ اب تک اس چکی میں پس رہی تھی۔

وہ دونوں تو خود بھی بھول چکی تھیں کہ وہ بہنیں نہیں کزنز ہیں مگر یہ ہمایوں تھا...... جس کا ہونا ایک ''نار'' کو بھڑکاتا تھا اور خولہ کو مجبور کرتا تھا کہ وہ اس راز کو افشاں نہ ہونے دے۔

اور وہ کھٹکے کی آواز پر چونکا تھا۔ وہ خولہ تھی۔ ماضی کی فلم جیسے یکدم اس کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹی تھی۔ وہ اک گہرا سانس بھر کر متوجہ ہوا تھا۔

❁ ❁

ناول نار ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 5 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

http://kitaabghar.com
fb.com/sehar.sajid.official kitaabghar.com

http://kitaabghar.com

آخری قسط نمبر 9

اس کے خیال کے مطابق تو اسے بے حد غصے میں ہونا چاہیے تھا مگر وہ یوں دکھتی تھی جیسے بہت تھک چکی ہو...... جیسے زچ ہو چکی ہو......اور اسی تھکے، تھکے انداز میں وہ اس کے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھی تھی۔ اس نے پرس اپنے پیروں کے پاس رکھا...... دونوں ہاتھ گود میں......اور وہ خاموش تھی...... بے حد خاموش......

"آپ کچھ لیں گی......؟" اور جواباً اس نے نفی میں سر ہلایا۔

ہمایوں اس کے اس انداز پہ بے آرام ہوا۔

"میں آپ کو تکلیف نہیں دینا چاہتا خولہ......!" وہ اک گہری سانس بھر کر بولا تھا......یوں جیسے وہ خود بھی بے بس ہو۔

"تو اور آپ کیا کر رہے ہیں......؟" اس نے نظر اٹھا کر، حیرت سے استفسار کیا اور وہ بے ساختہ چپ ہوا۔

"میں نے زندگی سے اک...... محض اک خوشی چاہی ہے اور وہ خوشی گر آپ ہیں تو میں کیا کروں......؟ کدھر جاؤں......؟"

خولہ نے ہونٹ مس کرتے ہوئے رخ پھیرا۔

"بہر حال......!" وہ کہنیاں ٹیبل پہ رکھتے ہوئے، ہاتھ ایک دوسرے میں پھنسائے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"میں یہاں آپ کے پروپوزل کا جواب دینے آئی ہوں...... ہمایوں صاحب! آپ اگر دنیا کے آخری شخص بھی ہوئے تو......تو تب بھی...... I repeat......تب بھی آپ میری چوائس نہیں ہوں گے...... ہرگز بھی نہیں......" لہجہ تلخ...... انداز کرخت......

"میں جانتا ہوں......" ہمایوں ترنت بولا۔

"تو......؟" تیکھے چتون اور تیکھے ہوئے۔

"تو یہ کہ مس خولہ......! جب مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ آپ اور مزنہ سگی بہنیں نہیں تو تب بھی......تب بھی میں نے آپ کی خوشی

چاہی...... آپ کو بسا ہوا دیکھنا چاہا...... اور اب...... اب میں خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھوں گا اگر یہ خوشی، میرے توسط سے آپ کو ملے......'' یہ کہتے ہوئے اس نے ساتھ رکھی ٹیبل سے ایک فائل اٹھائی تھی جو کہ اس کے اٹھانے کی وجہ سے ہی خولہ کی نظر کی گرفت میں آئی تھی۔

وہ اب فائل کھول کر اس کے سامنے رکھ رہا تھا۔ اس نے اچنبھے کا شکار ہو کر فائل دیکھی۔ کوئی پیشنٹ فائل تھی۔ کوئی رپورٹ تھی اور مریض کا نام...... مزنہ تھا۔ خولہ نے ایک جھٹکے سے فائل اٹھائی۔ جلدی، جلدی اس کو پڑھا اور فائل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ٹیبل کی سطح پہ جا گری۔

''یہ جھوٹ ہے...... بکواس ہے...... فراڈ ہے...... fake ہے۔''

ہمایوں تکلیف سے مسکرایا۔

''یہ fake نہیں...... fake تو وہ تھی جو سالوں پہلے میں نے مزنہ کو دکھائی تھی......'' وہ فائل پہ درج تاریخ پہ انگلی رکھتے ہوئے بولا تھا۔

''آپ اس ڈاکٹر سے کنفرم کر سکتی ہیں۔'' اور ہمایوں کی آواز اسے بہت دور سے آتی سنائی دی تھی۔ اور وہ اس کا اپنا وجود تھا جو کسی گہری کھائی میں جا گرا تھا۔

☆......☆......☆

''مزنہ بانجھ ہے...... ہمایوں نے یہ سب ہم سے چھپایا...... اس نے کسی کو بھی اس بات کی بھنک نہیں پڑنے دی۔ حتیٰ کہ مزنہ کو بھی نہیں...... اس نے اپنے آفس کے سافٹ ویئر انجینیئر سے fake رپورٹ بنوالی تھی جو کہ نارمل تھی۔ احمد انکل! وہ شاید ابھی بھی یہ بات چھپائے رکھتا مگر......'' تبسم اک لمحے کے لیے چپ ہوئیں...... احمد صاحب کو تو ویسے ہی خاموشی چوس رہی تھی...... نوچ، نوچ کھا رہی تھی...... بات تھی ہی ایسی......

''یہ بات کب تک چھپنی تھی...... آخر کب تک...... ظاہر ہے اسے بھی فیملی چاہیے...... اور ہمیں بھی اس کی اولاد کی تمنا ہے۔ آج نہیں تو کل...... کل نہیں تو پرسوں...... پرسوں نہیں تو کسی نہ کسی ایک دن...... وہ دوسری شادی پہ مجبور تو ہو جائے گا ناں...... اکلوتا بھائی ہے وہ میرا...... اور یوں......'' اب کی بار تبسم کی آواز بھرائی تھی۔ انہوں نے نزاکت سے آنکھوں میں آنے والے آنسو ٹشو سے صاف کیے۔

''مزنہ کو تکلیف نہ ہو...... وہ خوش رہے...... جتنی دیر اس صدمے سے بچ سکتی ہے، بچی رہے...... محض اسی لیے اس نے چھپایا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ایک نہ ایک دن تو یہ بات باہر آنی ہی ہے۔''

http://kitaabghar.com

احمد صاحب نے اک آہ جیسا سانس بھری......تبسم ان کے پاس خولہ کا پروپوزل لے کر آئی تھیں۔

''خولہ کو سمجھائیں احمد انکل......! خدارا اس کو سمجھائیں۔ وہ یوں انکار کر کے ٹھیک نہیں کر رہی......اس کی خود کی بہن کی زندگی ہی خراب ہو گی کل کو اگر کوئی دوسری عورت ہمایوں کی زندگی میں آتی ہے تو آپ خود سوچیں کہ مزنہ کا مقام کیا سے کیا ہو گا......ہمایوں چاہے جتنا بھی خیال رکھے، جس طرح بھی اسے facilitate کرے، پرابلمز ہوں گے اور اگر خولہ وہ دوسری عورت ہوتی ہے تو زندگی mess نہیں بنے گی......نہ ہمایوں کی، نہ مزنہ کی......پلیز احمد انکل اسے سمجھائیں۔''

اور احمد صاحب نے بے ساختہ اپنی کنپٹی کو مسلا تھا۔ یہ فیصلہ کرنا ایسے ہی تھا کہ جیسے کنویں کو چھوڑ کر کھائی میں چھلانگ مار دی جائے......وقت بھی نا کیسے کیسے اور کس طرح کے مقام پہ لا کھڑا کرتا ہے۔

اف یہ زندگی......!

☆......☆......☆

''آخر یہ معاملہ کب سلجھے گا ہمایوں......؟ کب......؟''تبسم تنگ سی نظر آتی تھیں۔ ہمایوں ان کو اسکول ڈراپ کرنے جا رہا تھا۔

''وہ اس معاملے کو اس کی آخری حدوں تک لٹکائے گی......ہر آخری حد تک......''وہ احتیاط سے موڑ کاٹتے ہوئے بولا۔

''no way.....''تبسم حیران ہوئیں۔

''بڑی اچھی طرح سے جانتا ہوں میں اسے......اسے فیصلہ کرنے کے لیے کوئی push فیکٹر چاہیے......کوئی اسٹرانگ سی ریزن......کوئی ایسی لاکڈ سچوئشن کہ جہاں پیچھے مڑنے کی کوئی راہ نہیں بچتی......تو تب وہ فیصلہ کر پائے گی۔''

''تو اب پھر......؟''وہ تبسم کے پوچھنے پہ اک پل کو چپ ہوا۔

''اسے کہہ دیں کہ میں مزنہ کو انفارم کرنے والا ہوں......''

''اوہ......!''تبسم کے ہونٹ اوہ کے انداز میں کھل سے گئے۔ وہ چند لمحے اسی کیفیت میں رہی اور پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھیں۔

''بلیک میلنگ......!''اور ہمایوں نے ان کی طرف دیکھ کر کندھے اچکائے یوں جیسے اتنی سی بے ایمانی تو اس کا حق تھا اب......گاڑی میں اب خاموشی تھی اور وہ سبک رفتاری سے رستہ ماپتی تھی۔

☆......☆......☆

''آپ میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔''

''اور وہ جو آپ کرتی آئی ہیں وہ......؟ وہ کیا......؟''

''ہمایوں پلیز......!''اوراس نے ٹیبل کی سطح پہ دونوں ہاتھ زور سے مارے۔

''مجھے سمجھ نہیں آتی......اس قدر میچور ہونے کے باوجود آپ کو پکچر نظر کیوں نہیں آتی......؟ آخر مسئلہ کیا ہے......؟''اس نے سکون سے پوچھا۔

''تو آپ کو نہیں معلوم مسئلہ کیا ہے......؟''وہ تندی سے بولی۔

''نہیں......!''ادھر ہنوز سکون برقرار تھا۔

''آپ بتائیں......!''وہ پیپرویٹ گھماتے ہوئے بولا۔

خولہ نے غصے سے رخ موڑا......دانت کچکچائے تھے۔

''اس سوسائٹی کو کیا جواب دیں گے آپ......؟''اور پھر تنک کر پوچھا۔

''میں سوسائٹی کو جواب دہ نہیں ہوں۔''وہ ٹھہرا۔

''مذہب کو ہوں......''وہ کتنا کمپوزڈ دکھتا تھا نا......

''اوہ......!''وہ طنزیہ ہوئی۔

''مذہب......بڑا اچھا ہتھیار ہے اپنی خواہش کو justify کرنے کا......''

''تو اور کس چیز کی طرف دیکھا جائے اپنی خواہشات کو justify کرنے کے لیے......؟ مذہب ہی تو ہمیں سب کچھ دیتا ہے......طریقِ زندگی......''

''اوہ کم آن......! آپ نے رہنا اسی معاشرے میں ہے۔آپ اس کو چھوڑ کیسے سکتے ہیں......؟''لہجہ تلخ......بگڑا سا انداز......

''ہاں......! معاشرہ......یہ(منہ ہی منہ میں خود بولا) معاشرہ......یہ تو مذہب سے بھی بڑا ہے نا......بہت بڑا......یہ معاشرہ ہر وہ کام جائز قرار دیتا ہے جسے مذہب ناجائز کہتا ہے۔یہ معاشرہ ایک مرد کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ ایسی کسی عورت سے دوسری شادی کرے جو اس کی بیوی کی چچازاد بہن ہے......کیونکہ وہ ایک گھر میں پلی بڑھی ہیں اور کیونکہ اس سے خاندانی نظام میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔اوہ کم آن......مذہب میں یہ نظام ہے اور نہ ہی ایسے اعتراضات کی گنجائش......مذہب تو کہتا ہے جو بھی (مسلمان) عورت تمہیں بھائے......تمہیں پسند ہو وجہ ہو نہ ہو تم اس سے نکاح کر سکتے ہو......دو، دو......تین، تین......چار، چار......لیکن یہ معاشرہ......یونو واٹ......اسے ریزن چاہیے ہوتا ہے۔ایک ٹھوس وجہ......جو کہ اس خواہش کو justify کر سکے۔معاشرہ محض محبت کی بنا پہ مجھے ایسی کسی عورت سے شادی کی اجازت نہیں دیتا جو کہ میری بیوی کی رشتے دار ہے۔''

http://kitaabghar.com

اک لمحے کا توقف......

”یونو واٹ...... یہ ٹھوس وجہ بھی ہے میرے پاس......آپ کی (چچازاد) بہن کی بے اولادی......آپ کو نہیں کرنی یہ شادی......ٹھیک ہے......مت کیجیے......میں ہوتا کون ہوں آپ کو فورس کرنے والا مگر یاد رکھیے کل کو مجھے کسی نہ کسی سے تو دوسری شادی کرنی ہی پڑے گی۔ آپ سوچ لیجیے گا کہ تب آپ کی بہن کا کیا ہوگا......؟ وہ عورت آپ بھی ہوسکتی ہیں......“

ماتھے پہ بل......سُتے ہوئے تاثرات اور بات مکمل کر کے وہ یوں لاتعلق نظر آیا جیسے یہ اس کا معاملہ تھا ہی نہیں......خولہ چند لمحے خود پہ قابو پاتی رہی......اور پھر ایک دم وہ منہ چھپا کر رونے لگی تھی۔

”میں مزنہ کو اتنی بڑی تکلیف نہیں دے سکتی......وہ......وہ کیا سوچے گی......؟“ اور ہمایوں لاتعلق رہا......وہ روتی رہی۔

”زندگی میں ہر ایک کو کمپرومائز کرنے پڑتے ہیں۔ مجبوری سہنی پڑتی ہے۔ کیا آپ نے نہیں سہی......؟ کیا میں نے نہیں سہی......؟ یہ مزنہ کی زندگی کا سچ ہے......جس کے ساتھ اسے کمپرومائز کرنا ہی ہوگا......آج نہیں تو کل......کل نہیں تو پرسوں......پرسوں نہ سہی کسی نہ کسی ایک دن تو ضرور......اسے یہ کرنا پڑے گا......آپ نہیں تو کوئی اور سہی......مگر یہ ہوگا ضرور......“ سرد آواز، یخ تاثرات اور بے لچک لہجہ......خولہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا......ٹو پیس سوٹ......ٹانگ پہ ٹانگ دھری......اس لمحے وہ کتنا پرسکون نظر آیا تھا۔

”ہمایوں وہ ڈیپ ڈپریشن کا شکار رہی ہے......گلواسفنگ تک جا پہنچی تھی تو اب......اب کیا حال ہوگا اس کا......؟ سوچ سکتے ہیں آپ......؟“

”اپنی زندگی کی کٹھنائیاں خود ہی سہنی پڑتی ہیں......اپنے بوجھ کے لیے دوسروں کے کندھوں کا سہارا نہیں لیتے......اسے سمجھنا ہوگا......برداشت کرنا ہوگا......سمجھنی ہوگی یہ بات کہ زندگی کی بخشی ہوئی تکلیف خود ہی سہنی پڑتی ہے اور میں ہوں اس کے ساتھ......اسے چھوڑ کب رہا ہوں......یہ کسی سے زیادہ میرے لیے سب سے مشکل ہوگا......“

"لیکن ہمایوں......!“

“I loved you...... loved you. Isn't it enough?”

وہ ایک دم اس کی بات کاٹ کر، سلگ کر ٹیبل پہ ہاتھ مار کر بولا۔ خولہ نے ترنت سختی سے ہونٹ بھینچے......آنسو ٹھہر سے گئے......وہ اب کہ خوف سے اسے تکتی تھی اور پلک تو وہ بھی نہ جھپکتا تھا اور پھر خولہ نے منہ پہ ہاتھ رکھا۔ آنکھوں میں نمی پھر سے امڈ آئی اور وہ منہ پہ ہاتھ رکھ کر الٹے قدموں وہاں سے بھاگ آئی تھی۔

☆......☆......☆

اِک اور رات...... اپنے پیروں میں اس کے لیے تکلیف باندھ کر لائی تھی اور یہ تکلیف اسے نچاتی تھی...... ہونٹ خشک...... بال بکھرے ہوئے...... کندھے پہ دھرا دوپٹا......جس کا ایک پلوز مین کو سلام کرتا تھا۔آنکھیں کھنچی ہوئیں......اور وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ وہ چلتی ہے...... کمرے میں گھٹن تھی...... بہت ساری گھٹن......اتنی کہ اسے ہوا چاہیے تھی......آکسیجن چاہیے تھی بہت ساری...... ڈھیر ساری......اتنی کہ وہ کھل کر سانس لے سکے اور پھر ساری عمر کے لیے وہ ہوا، وہ آکسیجن اپنے پھیپھڑوں میں بھر لے اور اس کے بعد کبھی...... ہاں کبھی بھی وہ اس گھٹن کا شکار نہ ہو سکے......دونوں ہاتھ کھڑکی کے پٹ پہ مارتے ہوئے اس نے پٹ کھولے تھے۔باہر اندھیرا تھا۔اماوس کی رات سکون سے سانس لیتی تھی۔

"میری رات کا چاند...... ہے کہ نہیں......؟"اس کے ناک کے نتھنے پھڑ پھڑائے۔

"I loved you......"

کسی نے کان میں آ کر سرگوشی سی کی تھی۔اس نے اذیت سے آنکھیں بند کیں......پلکوں پہ نمی لرزی......دل کو کسی نے مٹھی میں جکڑا۔

"یوں مت کرو ہمایوں...... یوں مت کرو......"اِک بے بس سی بڑبڑاہٹ لبوں پہ پھیلی تھی۔

"میں جہانگیر......"اور یہاں پہ آ کر وہ رک گئی......ساکت ہو گئی......سانس بھی کہیں رک کر ٹھہر سی گئی......وہ چند لمحے اسی کیفیت میں رہی اور پھر کرنٹ کھا کر مڑی تھی۔اس نے ایک جھٹکے سے الماری کے پٹ کھولے...... ہاتھ مار کر کچھ تلاش کرتے ہوئے......بہت سی چیزیں نیچے گرائیں اور بالآخر جہانگیر کی تصویر برآمد کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔اس نے تصویر نکالی، دونوں ہاتھوں میں پکڑا......اِک ٹرانس کی سی کیفیت میں بیڈ تک آئی اور گرنے والے انداز میں ڈھے پڑی تھی۔

"تو اسے جہانگیر کا چہرہ یاد کرنے کے لیے اب تصویر کا سہارا لینا پڑے گا......تو اب سے اسے ایسا کرنا پڑے گا کیا......؟"ہاتھوں کی گرفت تصویر پہ مضبوط ہوئی اور اس نے کچھ خوفزدہ ہو کر تصویر کو سینے سے بھینچا تھا۔

"تو کیا وہ کمزور پڑ رہی تھی......؟"

وہ ایک ناآسودہ عورت تھی اور آسودگی باہیں کھولے اسے پکارتی تھی...... بلاتی تھی......اور وہ تھی کہ پیر دلدل میں دھنسائے کھڑی تھی۔

☆......☆......☆

"تمہیں یہ پروپوزل قبول کر لینا چاہیے......"اور باپ کے منہ سے یہ بات سن کر اس کا منہ سرخ ہوا۔

"ابو پلیز......!"

''کیا پلیز......؟ ہاں......کیا پلیز......؟ کیوں خود کی زندگی خراب کرنے پہ تلی ہوئی ہو خولہ......!''اور خولہ نے ان کا بے بس لہجہ تکلیف سے سنا......وہ چند لمحے ہونٹ بھینچے چپ رہی......

''آپ مزنہ کی وجہ سے زور دے رہے ہیں ناں ابو......؟ ہے ناں......؟''اور پھر بھرائی آواز میں مدھم سا بولی تھی۔

احمد صاحب زخمی سا مسکرائے۔

''نہیں......صرف تمہارے لیے......اب کی بار صرف تمہارے لیے......بہت خوش رکھے گا وہ تمہیں......اتنا کہ سارے دکھ......ساری زندگی کی اذیتیں بھول جاؤ گی......اتنا تو میں دیکھ ہی سکتا ہوں......''اور وہ حیرانی سے انہیں تکتی رہ گئی۔

''پر کیا سزا ہے یہ بھی......کبھی ایک بیٹی بے اعتبار کرتی ہے تو کبھی دوسری......''اِک گہری سانس بھر کر وہ گھٹنوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اٹھے۔

''میرا یقین کرو......میں اب کی بار صرف اور صرف تمہارا بھلا چاہتا ہوں خولہ بچے......صرف تمہارا بھلا......''اور پھر اس کا سر تھپتھپا کر کہتے ہوئے وہ وہاں سے چلے گئے تھے۔خولہ نم آنکھوں سے ان کی پشت تکتی رہ گئی تھی۔

''کیوں اور کمزور کرتے ہیں ابو......کیوں......؟''وہ سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے بڑبڑائی تھی۔

☆......☆......☆

''ٹھک......ٹھک......''کیل پہ ہتھوڑی کی لگی ضرب سماعتوں پہ گراں گزر رہی تھی......مگر احمد صاحب خاموشی سے اس کے کمرے کی دہلیز پہ کھڑے،اس کو یہ کام کرتا دیکھتے رہے......آواز یک دم بند ہوئی......وہ نیچے اتری......ابو کو دیکھ کر ٹھٹکی اور پھر بیڈ پہ رکھا فریم اٹھایا اور اٹھا کر دیوار پہ آویزاں کر دیا۔

اسے جہانگیر کا چہرہ یاد رکھنا تھا......بھولنا نہیں تھا......وہ اس کی بیوہ تھی......اسے یہ ہی یاد رکھنا تھا۔

نیچے اتر کر وہ مصروف سے انداز میں چیزوں کو اپنے ٹھکانے پہ رکھنے لگی......ابو خاموشی سے اسے تکتے رہے اور اب کے یوں خاموشی سے تکنا اسے الجھن میں ڈالتا تھا......وہ جھنجلائی اور پھر مڑ کر ان تک آئی۔

''کیا بات ہے ابو......؟''نرم مگر ستا ہوا لہجہ......

''تبسم آئی ہیں......''مدھم مگر تھکا ہوا لہجہ......

اور تھک تو اب خولہ بھی چکی تھی۔

☆......☆......☆

مس مفتی نے اسے دیکھا اور اس نے مس مفتی کو......اور......اور......

http://kitaabghar.com fb.com/sehar.sajid.official kitaabghar.com

''پلیز مس مفتی......پلیز یہ کھیل اب ختم کریں......ختم کریں پلیز......'' وہ روہانسی ہوئی۔

''خولہ......خولہ......!'' اور مس مفتی نے عجیب بے قرار انداز میں اس کے ہاتھ تھامے تھے۔

''میرا اکلوتا بھائی ہے وہ......اسے یوں دل کی خوشی......دل کے سکون سے محروم نہ کرو......خدارا ایسا نہ کرو......اب کی بار وہ جو ٹوٹا تو کھڑا نہ ہو سکے گا......بکھرا تو سمٹ نہ سکے گا......وہ بہت بھگت چکا......بہت اذیت سہہ چکا بہت سہہ چکا ہے......اب اس کے ساتھ یوں تو نہ کرو......یوں مت کرو......محبت کرتا ہے تم سے......کچھ تو خیال کرو......''

اور وہ حیرت سے......دکھ سے انہیں تکتی رہ گئی۔

''آپ کے بھائی کا خیال کروں اور اپنی بہن......؟ اس کا......اس کا کیا کروں......؟ کیا......؟'' اور بے بسی اپنے عروج کو پہنچی......تبسم نے لاچاری سے اس کے ہاتھ چھوڑے......یوں جیسے امید بری طرح سے ٹوٹی ہو......آنکھوں کو زور سے میچا تو کئی نمی کے قطرے ٹوٹ کر ان کے گالوں پہ گرے تھے۔

''بہت ظلم ہے یہ......زیادتی ہے خولہ......صریحاً زیادتی......'' وہ بہت ٹوٹی ہوئی تھیں......خولہ نے تکلیف سے آنکھیں بند کیں......وہ کرتی تو آخر کرتی کیا......؟ نہ جائے رفتن......نہ پائے ماندن......

''اب......اگر......مزنہ کے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی تو اس کی ذمہ دار تم ہوگی......صرف تم......کیونکہ......'' چبا، چبا کر بولتے ہوئے آنسو ان کی آنکھوں سے ٹوٹ، ٹوٹ بہتے تھے۔

''ہمایوں شادی کر رہا ہے......'' اور......اور خولہ کا دل دھک کر کے رہ گیا......اس نے فق ہوتی رنگت کے ساتھ مس مفتی کو دیکھا۔

''اور جس دن......'' وہ دو قدم آگے آئیں۔

''جس دن......تم نے کسی تیسرے شخص سے شادی کی ناں خولہ......اس دن......ہاں ٹھیک اس دن میں تمہارا گریبان پکڑ کر یہ سوال کروں گی کہ وہ شخص ہمایوں کیوں نہیں ہو سکتا تھا......کیوں......؟'' وہ اتنے طیش سے اور لاؤڈ ہو کر بولی تھیں کہ گلے میں خراش سی پڑ گئی تھی اور پھر وہ......اسی طیش کے ساتھ......ایک سخت نظر اس کے چہرے پہ ڈال کر وہاں سے چلی گئی تھیں اور خولہ......وہ بے ساختہ لڑکھڑائی......اور بے دم ہو کر صوفے پہ گر گئی تھی۔

"I loved you......loved you. Isn't it enough......?"

اور وہ آواز کہ جسے وہ مردہ قرار دے کر دفن کر چکی تھی......اچانک سے......یک دم......پھر سے زندہ ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

اس نے یک دم پیچھے سے جا کر اس کا ہاتھ پکڑا۔

''آؤ......باہر چلتے ہیں۔'' اسے اپنی طرف کھینچا۔

''ہمایوں......! میں یہ وارڈ روب......'' اس نے احتجاج کرنا چاہا۔

''ہوتا رہے گا......ابھی چلو۔''

''یوں ہی کیا......؟'' اس نے چھیلے ہاتھوں سے خود کے حلیے کی طرف اشارہ کیا۔

''یوں ہی......'' وہ بضد ہوا۔

وہ ایک دم کانشس ہوئی، مڑ کر خود کو آئینے میں دیکھا۔ چند بکھری، الجھی لٹوں کو ہاتھ سے سنوارنا چاہا۔

''کم آن......'' وہ بدمزا ہوا۔

''اچھا چلیں......'' وہ اس سے بھی زیادہ بدمزا ہو کر بولی۔

''''ایسا بھی بیوی پر کیا پیار آیا ہو......''

ہمایوں نے مڑ کر آنکھیں دکھائیں تو اس نے ہونٹ بھینچ کر ہاتھ اٹھا دیئے......جیسے کہتی ہو......

اچھا اب اک لفظ اور نہیں۔

اور وہ اسے لے کر لانگ ڈرائیو پر نکل آیا۔ خنک سے دن تھے۔ کہر میں لپٹی شامیں......سانس میں گھلتی خزاں کی سی باس ...... پوروں پر اترتی نمی......سورج غروب ہونے کی سرخی افق پر چھائی تھی......برہنہ سے پیڑوں کے پار سورج آج کا آخری سانس لینے والا تھا۔ ہوا نرمی سے، بل کھا کر جب چلتی تھی تو پتے ٹوٹ ٹوٹ گرتے تھے......گاڑی کے بند شیشوں پر اوس ذرا سی دیر کو قطرے کی صورت ٹھہرتی اور پھر پھسل کر اک لکیر کی صورت بناتی چلی جاتی۔

اس نے شال کو شانوں کے گرد لپیٹا اور ہمایوں کو اک نظر دیکھا۔ اس کے لب خود بخود مسکرا اٹھے۔ وہ ایسا ہی تو تھا کہ جسے دیکھ کر مسکرایا جائے اور جس کے ساتھ ہونے پر ناز کیا جائے۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور ہلکے سے اس کے بال بگاڑ دیئے۔

ہمایوں نے مڑ کر دیکھا اور وہ ہنس پڑی۔

''موسم کا اثر ہو رہا ہے؟'' مسکراہٹ کو لب تلے دباتے اس نے پوچھا۔

''تو نہ ہو کیا......؟'' اس کا اٹھلانا دیکھنے لائق تھا۔

ہمایوں نے تائید میں سر ہلایا۔

''آج کیسے خیال آ گیا......؟''

http://kitaabghar.com

”بڑے افسوس کی بات ہے مسز......! کیا پہلے کبھی نہیں آیا......؟“

”نہیں آیا ہے...... پر آج بڑے دنوں بعد آیا ہے نا......“ شکوہ اپنی جگہ قائم تھا۔

”تو کافی نہیں کہ آ گیا......“

”کافی تو ہے مگر......“

”مگر یہ ”مگر“ نہیں ختم ہونی...... ہے نا......؟“ اس نے ترنت بات کاٹ کر کہا تو وہ پھر سے ہنس دی۔

اس نے گاڑی ایک ڈھابے کے پاس روکی اور دو چائے کا اشارہ کیا۔ درختوں سے لپٹی بتیاں روشن ہو چکی تھیں۔

ان دونوں کے ہاتھ میں اب چائے کی پیالیاں تھیں اور وہ دونوں جیسے اس منظر کے زیر اثر تھے۔

”تمہیں نہیں لگتا مزنہ! کہ زندگی اک مسلسل جمود کا شکار ہے......؟“

”مطلب......؟“ اس نے چونکے بنا ہمایوں کو دیکھا۔

اس سوال پر اس نے ساتھ بیٹھی عورت کا چہرہ دیکھا۔

”وہ...... وہ نہیں تھی جو لہجے سے، انداز سے بات کی تہہ تک جا پہنچے۔“

”کیا اس سے سیدھی بات کہنی چاہیے......؟“

اور اس سوچ پر اس نے گہرا سانس بھرا اور ساتھ ہی ایک جلتا ہوا گھونٹ اندر اتارا...... کہنے کو چائے تھی...... مگر وہ کیا تھا یہ ساتھ بیٹھی عورت نہیں سمجھتی تھی...... نہیں سمجھ سکتی تھی۔

”مزنہ......! زندگی بڑی پریکٹیکل چیز ہے اور اس سے بڑھ کر تلخ...... No fantasies ...... No pipe dreams

اپنی زندگی کی تلخیوں سے جنگ لڑنی پڑتی ہے...... بہادر نہ بھی ہوں تو سینہ چوڑا کرنا ہی پڑتا ہے، نہیں تو پھر دوسرا حل یہ ہی رہ جاتا ہے کہ آپ گر جائیں، زندگی کو اجازت دے دیں کہ وہ کسی بدمست، بدکے ہوئے ہاتھی کی طرح اپنے پیروں تلے آپ کو روند ڈالے......“

”ہمایوں......!“ اس نے خوفزدہ ہو کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

”کیا بات ہے......؟ کچھ ہوا ہے......؟“ اور ہمایوں نے موسم جیسا سانس لیا۔ تو کیا واقعی ہی میں اسے سیدھی بات کہنی تھی۔

اس نے پیالی ڈیش بورڈ پر رکھی...... اس کے ہاتھ سے بھی پیالی لے کر اپنی پیالی کے برابر رکھ دی۔ اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے...... وہ چاہتا تھا کہ جب وہ ”سیدھی بات“ سنے تو یہ احساس اس کے ساتھ ہو کہ ہمایوں اس کے ساتھ تھا۔

”گھر والے اولاد کے حوالے سے پریشرائز کر رہے ہیں مزنہ......!“

ہمایوں کے ہاتھوں میں موجود وہ ہاتھ......اک دم سرد ہوئے......بہار جیسا چہرہ......کسی برہنہ پیڑ کا سا ہوا۔اس سے اگلا ردعمل......آنکھوں کی تہہ میں جمی اوس پانی میں بدلی اور لکیر کی صورت بہنے لگی۔

اس نے ہاتھ کھینچنے چاہے مگر ہمایوں نے یہ کرنے نہ دیا۔

بازو بڑھا کر اسے ساتھ لگایا......اس نے سہم کر اس کے بازو میں چھپ کر ساری دنیا سے اوجھل ہو جانا چاہا......

اور اس کی سانسوں سے ہمایوں کا بازو ٹھٹھرتا رہا۔

”تم دوسری شادی......؟“لفظ بھاری ہوئے......ادا ہو کے نہ دیتے تھے۔

”شش......“ ہمایوں نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھی......اس کا چہرہ سیدھا کیا......گالوں پر بہنے والی نمی کو صاف کیا......

”حالات چاہے کچھ بھی ہوں مزنہ......!مجھ پر سے یقین کبھی نہ ختم کرنا......تم میری بیوی ہو اور رہو گی......میں تمہاری پروا کرتا آیا ہوں اور کرتا رہوں گا۔تمہاری اس گھر میں حیثیت مُسلّم تھی اور مُسلّم رہے گی......حالات چاہے کچھ بھی ہوں......“ وہ اس کی بکھری لٹوں کو ایک ایک کر کے کان کے پیچھے اڑستا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا......تسلی لفظ لفظ کے ساتھ دل پر اترتی تھی مگر آہ......کہ وہ سمجھنے والوں میں سے نہیں تھی۔وہ ایک بار پھر الفاظ کے ہیر پھیر کا شکار ہوئی۔نہیں جانتی تھی کہ یہ تسلی نہیں......مائنڈ میک اپ تھا۔یہ یقین دہانی نہیں......اشارہ تھا۔

”گھر چلیں پلیز......!“ ذرا سا سنبھل کر وہ زکام زدہ آواز میں بولی۔

”ہاں......!چلتے ہیں۔“ اور اس نے آواز دے کر چائے والے لڑکے کو بلایا......ادھ خالی کپ اسے پکڑائے......بل ادا کیا اور گاڑی اسٹارٹ کی تھی اور جب وہ گھر کے دروازے پر پہنچا تو......

”تم جاؤ......مجھے کچھ کام ہے۔“ اور اس نے مزنہ کے چہرے کو دیکھنے سے اجتناب برتا۔

”سنو......!“

”ہاں......!“ وہ ایک دم مڑی اور شیشے پر جھکی۔

تناؤ جیسے ہمایوں کے چہرے پر بکل مارے بیٹھا تھا۔

”تمہاری شام برباد کرنے کے لیے افسوس ہے مگر مجھے دوسری شادی کرنی پڑے گی......!“ اور اس کے ساتھ ہی گاڑی کے ٹائر زور سے چرچرائے......اور وہ اسے ساری عمر سیدھا نہ ہونے کے لیے وہیں جھکا چھوڑ گیا تھا۔

☆......☆......☆

''ہیلو......!'' اور اسے سمجھ نہ آیا کہ اس ہیلو کے جواب میں کیا کہے...... یہاں سب کچھ......اک دم سے اتنا پرایا ہوا تھا کہ جیسے کبھی شناسائی تھی ہی نہیں......لوگوں سے لے کر اس کمرے کی دیواروں تک......سب پرایا ہوا تھا۔

''ہیلو مزنہ......! کیا بات ہے؟'' دوسری طرف سے خولہ پوچھتی تھی مگر......اس کے ہونٹ ہل کر نہیں دے رہے تھے۔

''مزنہ......! تم مجھے پریشان کر رہی ہو......''

''آپی......!''

''کیا ہوا ہے......؟''

''ہمایوں دوسری شادی کر رہا ہے......'' اور اس نے الفاظ ادا کرتے ہی اک دم سیل فون پرے پھینکا۔ اپنے ہی الفاظ نے اسے ڈسا تھا......اپنے ہی الفاظ کا زہر بدن میں اترا تھا۔ وہ سر دونوں ہاتھوں پر گرا کر بیٹھ گئی......فی الوقت دماغ سمجھ سے خالی تھا......اور دل......؟

دل اور دماغ دونوں اکٹھے چلنے کی چیز نہیں......جب دل درد سے بھرتا ہے تو دماغ سمجھ سے خالی ہو جاتا ہے اور جب دماغ سمجھنے لگتا ہے تو دل اک دم خالی......تو طے ہوا......اس وقت اس کا دل دکھ سے بھرا ہوا تھا......خولہ نے دوبار......سہ بار......چہار......بار بار اسے فون ملایا......اسے نہیں اٹھانا تھا سو اس نے نہیں اٹھایا۔ خولہ نے دوسرا کام ہمایوں کو فون کرنے کا کیا تھا مگر اس کا نمبر بھی آف جا رہا تھا۔

اور خولہ کا دماغ دوڑنے لگا۔ اس نے مزنہ کے گھر جانے میں دیر نہیں کی تھی اور وہاں جا کر جو معلوم ہوا......وہ پیروں تلے زمین آرام سے کھینچ سکتا تھا۔

''تو کیا اب وہ مجھے یوں بلیک میل کرے گا......؟'' وہ بری طرح سے چڑی ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

مزنہ کو نیند کی دوا جب کھلائی تو اس کا دماغ جھنجھنا اٹھا......کیا پھر سے وہی سب......اس کی رگیں کھنچ گئیں......بس اب یہ ہمایوں کا عذاب ہوگا......اسے ہی بھگتنا ہوگا......اس کو لٹا کر اس پر کمفرٹر برابر کرتے ہوئے جیسے اس نے عہد کیا تھا...... یہاں آنا بھی آسان نہ تھا وہ بھی ایسے میں جب تبسم سب جان چکی تھیں......لیکن وہ خود کو روک نہ پائی تھی......ہمایوں کے گھر آنے سے پہلے وہ وہاں سے چلے جانا چاہتی تھی مگر کمرے کے دروازے سے باہر پیر رکھتے ہی اس کا ارادہ زمین بوس ہوا تھا......وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو دیکھ کر ٹھٹکے......اس کا چہرہ ستا ہوا تھا......اس نے پاس سے گزر جانا چاہا......مگر......

''بات کرنی ہے آپ سے......'' اس کا لہجہ خوامخواہ میں ہی تیکھا ہوا......

http://kitaabghar.com

''مگر مجھے کوئی بات نہیں سننی......'' یوں تڑخ کر جواب آیا کہ وہ اف بھی نہ کر سکی......مڑ کر اتنی حیرت سے اس کے چہرے کی جانب دیکھا جیسے کہ وہ کسی اور شخص کا چہرہ تھا۔

''آپ......آپ مجھے بلیک میل کریں گے اب......'' وہاں پر بھی کسی غصے نے جوش مارا تھا......ناک کے نتھنے خوامخواہ میں پھڑکے تھے۔

''آخر میں کیوں کروں گا آپ کو بلیک میل......؟'' اس نے سیدھا آنکھوں میں دیکھا......اور وہاں کسی کی سانس کانٹوں پر گھسیٹی گئی......اس کا رنگ فق ہوا......اور پھر یک دم اس میں سرخی گھلنے لگی۔

وہ اس کے پہلو سے تیزی سے نکلی تو دل کمینگی پر اترا ہوا تھا......خوامخواہ میں ہی دھڑک دھڑک جاتا تھا۔

''کتنا بدتمیز ہے یہ شخص......!'' اس نے سرد ہاتھ گرم گالوں پر رکھے تھے۔

☆......☆......☆

اس دن کے بعد ہمایوں نے کچھ کہا نہ مزنہ کچھ بولی......بس اک غیر محسوس سا تناؤ تھا جو ان دونوں کے درمیان در آیا تھا۔

آج بھی معمول کی طرح ہمایوں کے کپڑے نکال کر جب وہ کمرے سے باہر جانے لگی تو اس نے روک لیا......جانے نہ دیا۔

''پریشان ہو......؟'' حالانکہ یہ ایک فضول سوال تھا مگر بات چھیڑنے کے لیے ضروری تھا۔

''تو کیا نہ ہوں......؟''

''اس کے بعد بھی جب ہمایوں تمہارے ساتھ ہے......؟''

اور وہ لاجواب ہوئی۔

''ہم انتظار نہیں کر سکتے کیا......؟''

''میں ابھی تک اور کیا کرتا آیا ہوں مزنہ......؟ مگر گھر والے......''

اور مزنہ نے تکلیف سے اسے دیکھا۔

''یعنی کہ......!'' اور اس کے حلق میں کچھ اس بری طرح سے پھنسا کہ وہ بول نہ پائی۔ ہمایوں جانتا تھا کہ اس نے کیا پوچھا ہے۔

''ہاں......!'' اور اس نے مزنہ کو زندگی کے تلخ سمندر میں یک دم دھکا دے دیا تھا تاکہ اب وہ اپنا ڈر دور کر سکے......نہ کہ فرار حاصل کر سکے......تو مزنہ ایک مکمل وجود سے مٹھی بھر خاک ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

http://kitaabghar.com

''ابو......!ہمایوں دوسری شادی کر رہا ہے......میں برباد ہو گئی ابو برباد......!'' وہ احمد صاحب کے سینے سے لگی زاروقطار رو رہی تھی۔

انہوں نے خولہ کی طرف دیکھا اور خولہ نے خوامخواہ میں نظریں چرائیں۔

''بیٹھو......مجھے تفصیل سے بتاؤ......کیا زہرا صاحبہ یا تبسم نے کچھ کہا تم سے......؟''

''نہیں......انہوں نے تو ایک بات بھی نہیں کی مگر ہمایوں......وہ خود مجھ سے کہہ چکا ہے ابو......!اس کے بعد کسی اور کے کہنے کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے......''

''میں مر جاؤں گی ابو......میں کیسے......''

اور انہوں نے ایک بار پھر خولہ کی طرف دیکھا اور اب کی بار خولہ وہاں سے اٹھ گئی۔ احمد صاحب ایک گہرا سانس بھر کر رہ گئے تھے۔

وہ فرخندہ پھوپھو کو سلا کر آئی تو ابوا سے لاؤنج میں بیٹھے ملے تھے۔

''آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں......؟'' اور جواباً انہوں نے یوں اسے دیکھا کہ جیسے کہتے ہوں......بیٹا کہ جیسے تمہیں معلوم ہی نہیں کہ بوڑھا باپ یوں......اس وقت کیوں جاگتا ہے......

''بیٹھو بات کرنی ہے......'' اور وہ چپ چاپ ان کے سامنے جا کر بیٹھ گئی۔

''تمہیں مجبور نہیں کرتا خولہ......!میں کر ہی نہیں سکتا کہ میں ایک دفعہ یہ کر کے دیکھ چکا ہوں......بس ایک بات کہنا چاہتا ہوں یاد رکھنا کوئی دوسری عورت جب جب مزنہ کے ساتھ زیادتی کرے گی تب تب میں تمہاری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھوں گا ضرور......!کہ اس بن ماں باپ کی بچی کے ساتھ یہ ظلم محض تمہاری وجہ سے ہوگا۔'' وہ کہہ کر رکے نہیں......اٹھ کر چلے گئے اور وہ......اسے کسی نے ان گنت بھاری زنجیروں میں جکڑ کر یک دم زمین کے پاتال میں کھینچ لیا تھا۔

☆......☆......☆

وہاں خاموشی تھی......چہار سو پھیلی خاموشی......ابدی خموشی......اور اک ابدی سکون......دھوپ دیواروں سے سرک کر انہیں ٹھنڈا کرتی تھی کہ زمین آج کا چکر پورا کرنے کے قریب تھی۔ دور کسی کوئل کے کوکنے کی صدا بلند ہوتی تھی۔

''تو کیا یہاں بھی کوئل بولا کرتی ہے......؟'' اس نے گردن اٹھا کر اس کوئل کو ڈھونڈنا چاہا مگر ناکام رہی......اور پھر سے سر جھکا کر ٹھوڑی گھٹنوں پہ جما کر تنکے سے کریدنے لگی۔

''پتا ہے جہانگیر! میں ساری عمر تمہاری بیوہ کہلانا چاہتی تھی......تمہارے نام پر گزار دینا چاہتی تھی......تم سے بے وفائی

نہیں کرنا چاہتی تھی مگر...... میں کر رہی ہوں جہانگیر......!'' وہ شہر خموشاں تھا اور وہاں کی بولتی زبان بھی خموشی تھی۔ اس کی آنکھوں سے نمی کا اک قطرہ گرا۔

''تم نے ہمیشہ میرا ساتھ تب چھوڑا جہانگیر......! جب مجھے تمہاری سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ تم ہوتے تو میرے اور ہمایوں کے بیچ ایک دیوار رہتی...... تم نے یہ دیوار کیوں گرائی جہانگیر...... کیوں......؟'' قطروں کی رفتار میں تیزی آئی مگر اس کے ہاتھ سستی سے مٹی رگیدتے تھے۔

''مجھے تم تک لے کر آنے والی بھی مزنہ تھی...... اور اب ہمایوں تک لے جانے والی بھی مزنہ...... مزنہ میری زندگی سے نکل نہیں سکتی کیا......؟'' اس نے بے دردی سے گال رگڑے۔

''پتا ہے تمہارے جانے کا کیا نقصان ہوا...... اس شخص کی آنکھیں تمہارے نام کا باندھا گیا حصار توڑنے لگی ہیں...... وہ کسی پن کی طرح میرے وجود میں کھبتی ہیں جہانگیر......! میں کیا کروں......؟ تم ہوتے تو کیا یہ سوئیاں چبھتی مجھے......؟''

''تم کیوں چلے گئے جہانگیر...... کیوں......؟'' اور اس نے ماتھا کتبے سے ٹکا کر ہچکی لی......

''مجھے تکلیف ہوتی ہے کہ میرا دل تمہارے علاوہ......'' اور اس نے ہونٹ بھینچ لیے یوں جیسے جہانگیر کو بھی تکلیف ہو گی۔

''مجھے محبت نہیں تھی تم سے جہانگیر......! لیکن تم شوہر تھے میرے اور یقین مانو یہ محبت سے بڑا درجہ ہے...... تمہارے سارے قصور معاف کیے جہانگیر......! معاف کیے...... خدا جنت میں مجھ سے بڑھ کر ساتھی عطا کرے تمہیں کہ میں اک کمزور اور نا آسودہ عورت ہوں جو کہ تمہاری بیوی پر ساری عمر نہیں بتا سکی......''

اور وہ کسی بڑھیا کی طرح گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھی...... اِک آخری الوداعی نظر اس کی قبر پر ڈالی اور پشت پھیر لی...... پھر کبھی نہ دوبارہ مڑ کر دیکھنے کے لیے...... پشت پھیر لی گئی۔

☆......☆......☆

''میرے سامنے مت آیا کریں آپ...... loved ...... I ...... مزنہ بانجھ...... شادی کر رہا...... loved you...... تمہارا گریبان...... Isn't it...... جہانگیر...... جہانگیر...... ہمایوں شادی کر ررر...... جہانگیر...... ہمایوں...... ہمایوں......'' اور یک دم اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ پسینہ سے تر بتر چہرہ...... تیز چلتی سانس...... جلتی آنکھیں اور تپتا وجود...... وہ کئی لمحے یوں ہی چت لیٹے گہرے مگر تیز سانس لیتی رہی اور پھر خود کو گھسیٹتے ہوئے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا لی تھی۔ سر بھاری ہو رہا تھا...... اس نے بے اختیار سر دونوں ہاتھوں پہ گرایا تھا...... کئی لمحے...... کئی لمحے وہ اسی حالت میں بیٹھی رہی اور پھر جھٹکے سے سر اٹھایا اور سائڈ ٹیبل پہ رکھے فون کو دیکھا...... اس فون میں ایک نمبر تھا جو کہ محض اک tap کی مار تھا اور ...... پھر...... پھر کیا ہوگا...... اب ہوگا کیا بھلا......؟ یہ

اذیت...... یہ تکلیف...... یہ dilemma ختم ہو جائے گا کیا......؟ اس نے ہاتھ بڑھایا...... فون اٹھایا...... نمبر نکالا اور پھر ملا بھی لیا...... بیل جا رہی تھی...... اور فون کی دوسری طرف ہمایوں اس پل...... رات کے اس پل اسکرین پہ جگمگاتے اس نمبر کو دیکھ کر حیران ہوا...... عجلت سے ریسیو کیا۔

''خولہ......!'' انداز میں شدید حیرت اور جواب میں خاموشی...... اس کی مدھم سانسوں کی آواز......

''خولہ......! خولہ کیا ہوا......؟ خیریت......؟'' وہ بے قرار ہوا مگر وہ کہاں بولتی تھی...... اور پھر جیسے ہمایوں کو الہام ہوا...... اس نے اچنبھے سے فون کو کان سے ہٹا کر دیکھا اور پھر سے سننے لگا۔ اس کی بولتی خاموشی...... اور پھر چند لمحوں بعد...... اسے ایک سسکی سی سنائی دی اور اس نے بے حد سکون سے آنکھیں موند کر سر کراؤن سے لگایا...... اس کے ہونٹوں پہ بڑی آسودہ سی مسکراہٹ پھیلی تھی۔

☆......☆......☆

تیری آنکھوں نے میرے گرد جو اک دیوار کھینچی ہے
میں اس سے بھاگ کر جانا چاہوں
تو کہیں اب جا نہیں سکتا
کہ پیروں سے کوئی زنجیر بے آواز لپٹی ہے
یہ وہ دیوار ہے کہ جس میں کوئی روزن نہیں کھلتا
میں اس میں در بناتا ہوں
تو ہر اک خشت مرا رستہ روکے
میرے کانوں میں اک پرکیف سی آواز آتی ہے
یہاں سے بھاگ کر جانا کوئی آساں نہیں ہے
محبت اس قدر کمزور مری جاں نہیں ہے
تیری آنکھوں نے میرے گرد جو اک دیوار کھینچی ہے
میں اس کو توڑتا ہوں تو شیشہ سر کو آتا ہے
یہاں اڑنا کہاں اس طائر بے پر کو آتا ہے
مری ساری توانائی یہاں ناکام ہوتی ہے

یہیں اب صبح ہوتی ہے یہیں اب شام ہوتی ہے
تیری آنکھوں نے میرے گرد جو دیوار کھینچی ہے
مجھے اس سے مفر کا ایک بھی رستہ نہیں ملتا
کہ اس دیوار کے پیچھے بھی اک دیوار لگتی ہے
تیری آنکھوں نے مرے گرد جو اک دیوار کھینچی ہے

☆......☆......☆

یہ ایک ہوٹل کا بڑا اور پُرتعیش کمرا تھا اور اس وقت نسبتاً نیم تاریک سا دکھتا تھا۔ قطار میں بنی بہت سی کھڑکیوں پہ پردے برابر تھے۔ ان برابر کیے ہوئے سفید پردوں کے پار اندھیرا، رات کی گواہی تھا۔ بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر ایک cylinderical لیمپ دھرا تھا۔ جس کی مدھم، ٹھنڈی، سفید روشنی کمرے کو مکمل تاریک ہونے سے بچائے ہوئے تھی۔ کمرے میں کوئی خوشبو بھی تھی جو بل کھا کر چکراتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ روشنی کی طرح ہی مدھم مگر اپنا پتا دیتی ہوئی......شاید وہ اس بکے سے اٹھ رہی تھی جو کہ لیمپ کے پاس ہی رکھا ہوا تھا۔ جیسمین اور گلاب کے پھول......اس نیم تاریک کمرے میں آنکھیں جب دیکھنے کے قابل ہوں تو معلوم ہوتا تھا کہ وہاں خوشبو، مدھم، ٹھنڈی روشنی اور خنکی ہی نہ تھیں...... وہاں کوئی اور بھی تھا۔ اِک وجود......نیم جاں سا......کسی خوف میں مبتلا مغربی دیوار کے ساتھ یوں کھڑا تھا کہ جیسے ابھی کے ابھی ڈھے پڑے گا۔ وہ کوئی دلہن تھی شاید......آ......نہیں......شاید نہیں......وہ یقیناً اِک دلہن ہی تھی لیکن اس کا لباس سرخ نہ تھا۔ وہ نیوی بلو کلر کے گھیر دار فراک میں ملبوس تھی کہ جس کے گھیر پہ کوئی قریب چار انچ چوڑی پٹی کی صورت سلور گرے کام ہوا ہوا تھا۔ باقی کا سارا فراک سادہ تھا۔ دوپٹے پہ جا بجا ٹکے سلور گرے موتی اور قریب کوئی دو انچ چوڑی پٹی کی صورت کام تھا۔ وہ میک اپ اور جیولری سے آراستہ دلہن نہ تھی۔ وہ منفرد تھی۔ گلے میں وائٹ گولڈ کی چین اور کانوں میں وائٹ گولڈ کے ہی ذرا بڑے، چوکور شکل کے ٹاپس، اس کی اسکن گلو کر رہی تھی۔ روز پنک cheeks کے ساتھ وہ ہونٹوں پر کورل پنک لپ اسٹک لگائے ہوئے تھی۔ آنکھوں پر اسموکی میک اپ اور کاجل کی گہری دھار......بالوں کا اسٹائل side bun تھا اور bun کے بالکل اوپر چند کلیاں اٹکی ہوئی تھیں۔ لمبی پلکوں کو مسکارے سے سجا رکھا تھا۔ وہ بہت دل کش دکھتی تھی۔ ابھی ٹھیک اسی پل میں اس کی دل کشی کو خوف ڈھانپتا ہوا نظر آتا تھا۔ وہ سہمی ہوئی تھی۔ ابھی ذرا دیر پہلے ہی تو نکاح ہوا تھا اور......

''یہ......یہ میں نے کیا کر دیا......کیا؟'' وہ منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے گھسٹتی ہوئی بے دم سے انداز میں نیچے بیٹھتی چلی گئی تھی۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

”کیا کر دیا یہ میں نے......؟“ اور اب کی بار اس نے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھاما تھا۔ تکلیف ایسی تھی جیسے سانس نکلتی نہ ہو...... جو اسے کبھی نہیں کرنا تھا اور یہ طے تھا کہ ایسا نہیں کرنا تھا اسے...... وہ ہو گیا تھا...... ہو چکا تھا۔

”یہ...... یہ کیا ہو گیا......؟“ اس کے گلے سے پھنسی مگر بھرائی ہوئی آواز نکلی اور اس کے ساتھ ہی آنسو آنکھوں سے لڑھک کر ٹھوڑی تک آ گئے۔ اور پھر وہ ٹپ، ٹپ قطروں کی صورت گرنے لگے، بہنے لگے اور یوں گر کر، بہہ کر وہ اس تکلیف کو پوری طرح سے بیان کرتے تھے جو کہ اس وقت، اس چہرے پر موجود تھی اور پھر یک دم وہ چونکی اور چونکانے والی چیز...... دروازہ کھلنے کی آواز تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس کی حالت اور خراب ہوئی تھی۔ وہ مزید سہمی تھی...... وہ منہ پر ہاتھ رکھے، بے یقینی سے دروازے کی سمت دیکھ رہی تھی۔ ایک ہیولہ سا نمودار ہوا اور اس ہیولے کے سائے نے اس کے سارے وجود کو چھپا کر رکھ دیا تھا۔ جوتوں کی چاپ ابھری اور سایہ گھٹتا، گھٹتا بالکل معدوم ہوا اور عین اس کے سامنے آ کر رکا تھا۔ وہ خود میں اتنی ہمت نہ پاتی تھی کہ نظر اٹھا کر اس کی سمت دیکھ سکے...... وہ اپنی نظروں کو اس کے جوتوں پر گویا چپکی پاتی تھی۔ وہ اس کے سامنے اکڑوں بیٹھا اور اس نے بیچارگی سے آنکھیں بند کی تھیں۔ وہ اس کے چہرے پہ بہنے والے آنسو...... اس کی گیلی لرزتی پلکوں اور کانپتے ہونٹوں کو دیکھتا رہا...... اور پھر انگلی بڑھا کر اس کے چہرے کی نمی کو محسوس کیا۔ جیسے ہی انگلی نے اس کے چہرے کو چھوا، اس کے رونے میں شدت آئی تھی۔ اس نے دانتوں تلے ہونٹوں کو دبا کر، انہیں کانپنے سے روکنا چاہا تھا...... مگر ناکام رہی تھی۔

”ہمایوں......!“ اور خولہ کے منہ سے ازحد لاچاری، بے بسی سے کانپتا ہوا یہ نام نکلا تھا۔

☆......☆......☆

اس نکاح میں احمد صاحب، زہرہ اور ہمایوں اور گواہان کے علاوہ اور کوئی فرد شامل نہ تھا۔ احمد صاحب چاہتے تھے کہ ابھی مزنہ کو نہ بتایا جائے۔ وہ خود اسے بتائیں گے...... نکاح ہوٹل میں ہی ہوا تھا۔ یہ فیصلہ کر کے اسے بری طرح سے محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے غلط کیا تھا...... لیکن اب کی بار فیصلہ کرنے کی وجہ مزنہ ہی نہیں تھی...... وہاں کچھ اور بھی تھا......

☆......☆......☆

”ابو......! آپ اوپر والا پورشن کیوں بنوا رہے ہیں......؟“ مزنہ آئی ہوئی تھی۔ کنسٹرکشن ہوتی دیکھ کر پوچھا تھا...... خولہ بھی وہیں تھی۔

”خولہ کے لیے بنوا رہا ہوں...... یہ ہمیں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی سو ہمایوں نے یہ حل نکالا...... اب شادی کے بعد یہیں رہے گی اوپر والے پورشن میں......“ اور خولہ کے حلق سے کچھ نیچے اترتا دکھائی دیا۔

”یہ تو اچھا آئیڈیا ہے......“ مزنہ نے خولہ کو دیکھ کر کہا۔

''آپی! آپ بہت خاموش سی نہیں ہوگئیں......کیوں ابّو......؟'' اسے چند لمحے دیکھنے کے بعد مزنہ نے سوال کیا اور احمد صاحب یوں مسکرائے جیسے کہ جواب نہ تھا ان کے پاس......

''یہ رِنگ......واؤ......کتنی زبردست ہے......کب لی......؟'' مزنہ نے اس کے ہاتھ میں موجود رنگ کو دیکھ کر کہا......خولہ نے ہاتھ چھپانا چاہا......مگر اس نے مہلت نہ دی تھی۔

''خوب صورت...... بے حد خوب صورت......'' اور خولہ ہونٹ چباتی رہی......اتنے میں باہر گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ احمد صاحب اٹھ کر گئے۔

''ہمایوں لینے آئے ہوں گے......'' مزنہ نے قیاس آرائی کی اور خولہ منٹ میں بوکھلائی اور بوکھلا کر کھڑی ہوئی۔

''آپ کو کیا ہوا......؟'' اسے حیرت ہوئی۔

''میں......میں......وہ......پھپو......'' اور وہ یہ کہہ کر وہاں سے فوراً غائب ہوئی تھی۔ وہ سامنا نہیں کر سکتی تھی...... بالکل بھی نہیں......ہمایوں آیا تو احمد صاحب نے اسے بٹھالیا اور خولہ کو آواز دینی چاہی کہ کچھ سرو کرے مگر پھر رک سے گئے۔

''جاؤ مزنہ......! چائے لے آؤ۔'' انہوں نے کہا......پھر ہمایوں جتنی دیر بیٹھا رہا......خولہ کو گن گن کر پھپو کے کام یاد آتے رہے......وہ سامنے نہیں ہوئی......اور جب وہ جانے لگے تو......

''آپی......آپی......مل تو لیں......'' مزنہ باہر صحن میں کھڑی اسے آوازیں دے رہی تھی......اسے مجبوراً آنا پڑا۔ اسے آتا دیکھ کر ہمایوں تو بہت کمپوزڈ اور نارمل رہا جبکہ خولہ پسینہ، پسینہ ہوئی تھی۔

''آپ کو کیا ہوا......؟ طبیعت ٹھیک ہے ناں......؟'' مزنہ نے یوں اس کو پیلا پڑتے دیکھ کر تشویش سے کہا۔

''ٹھیک ہوں......تم جاؤ......وہ بہ مشکل کہہ سکی اور اندر کو چلی گئی اور کمرے میں جا کر وہ عجب بیچارگی بھرے تاثرات کے ساتھ خالی بیٹھی رہی۔

☆......☆......☆

''ہمایوں......! آپ بہت زیادہ مصروف نہیں ہو رہے......؟'' پچھلے چند دنوں سے وہ اس کی روٹین کو دیکھ رہی تھی۔

''ہاں! وہ احمد انکل اوپر والا پورشن سیٹ کر رہے ہیں تو ان کے ساتھ جانا پڑتا ہے......کبھی فرنیچر مارکیٹ تو کبھی کسی اور مارکیٹ......'' اس نے سیدھا جواب دیا۔

''ہم مم......'' وہ اک لحظے کو چپ ہوئی۔

''آپ چینج بھی ہو رہے ہیں......''

''اچھا......؟ مثلاً کیا چینج آیا ہے مجھ میں......؟''

''آئی ڈونٹ نو......لیکن ہے کچھ......'' وہ الجھ کر بولی یوں جیسے وضاحت دینی نہ آتی ہو......وہ اس کو دیکھ کر بس مسکرا دیا۔

''میں تمہیں بتاؤں کیا چینج آیا ہے مزنہ......؟ میری زندگی میں پہلی بار......پہلی بار مجھے سکون ملا ہے......میں خوش ہوں......بہت خوش......'' ہمایوں یہ سب اس سے کہہ نہ سکا تھا......محض سوچ کر رہ گیا تھا۔

☆......☆......☆

تبسم سے باتیں کرتے، کرتے......وہ چلتے، چلتے ایک دم رکی اور رک کر ساکت ہوئی اور ساکت ہو کر اس نے بدترین حیرت کے ساتھ اسے دیکھا......اور پھر چند لمحے کے لیے وہ اس شاک سے باہر نہ نکل سکی تھی۔ اس کا دوسرا رِدِعمل گردن موڑ کر استفسار جمع شاکی نظروں سے تبسم کو دیکھنے کا تھا۔ تبسم بری طرح محظوظ ہوئی تھیں۔ سر جھکا کر......ہونٹ دبا کر انہوں نے اپنے تاثرات چھپانے چاہے......مگر......وہ انہیں ٹکر، ٹکر دیکھ رہی تھی۔ اب کی بار تبسم کو بڑے زور کی ہنسی آئی۔

''کھا نہیں جائے گا......''انہوں نے سرگوشی کی۔

''یو......یو چیٹڈ می......!'' جواباً اس کا حیرت بھرا لہجہ......

''ہمایوں نے کہا تھا......'' اور اس کے چہرے پہ بیچارگی کے شدید تاثرات ابھرے تھے۔ وہ سامنے ہی تو تھا......آف وائٹ شرٹ، ڈینم جینز اور اس پہ فوکسڈ نگاہیں......خولہ سخت بے آرام تھی۔

''میں جا رہی ہوں......'' اس نے واک آؤٹ کرنا چاہا مگر واک آؤٹ یوں وقوع پزیر نہ ہو سکا کہ ہمایوں نے یک دم آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑا تھا اور لو جی......اس کی رہی سہی روح بھی فنا ہوئی تھی۔ اس نے فق ہوتی رنگت کے ساتھ پہلے ہمایوں کو دیکھا......پھر تبسم کو اور اس کے بعد ارد گرد بکھری پبلک کو......

''آپ جائیں آپی......!'' مسکراتا سا لہجہ......

اور تبسم نے وہاں سے جانے میں منٹ بھی نہیں لگایا تھا۔

ہمایوں نے نرمی سے اس کا ہاتھ چھوڑا اور کہا۔

''آؤ......!'' اس نے خاموشی سے پیروی کی۔ ہمایوں کا رخ پارکنگ کی طرف تھا۔

☆......☆......☆

''ہم ہو سکتے تھے ناں......کوئی بھی دو افراد......دنیا کے ہجوم کا حصّہ......اپنی، اپنی زندگیوں کو یوں ہی گزارتے ہوئے کہ جیسے وہ تھیں......مگر یہ کہ نہیں......ہم دنیا کے ہجوم میں چھپے ''کوئی'' بھی دو افراد نہیں ہو سکتے تھے اور گر ہوتے تو تب بھی ''محبت'' نے

http://kitaabghar.com

ہمیں یوں آمنے سامنے لے ہی آنا تھا چاہے تم ایک کونے میں ہوتی اور میں دوسرے کونے میں......اور دنیا کو سمیٹ کر محض دوقدم کے فاصلے پہ لے آنے والی شے ''محبت'' ہی تو ہے۔محبت کا ''ہو'' جانا معجزہ نہیں......اس کا یوں دوقدم کے فاصلے پہ آپ کے سامنے......آپ کے ساتھ بیٹھنا معجزہ ہے۔''

اور پانی کی اِک لہر آئی اور ان دو سمٹے ہوئے، دوقدم کے فاصلے پہ بیٹھے ہوئے افراد کے پیروں تک آتے، آتے اس کا جوش ٹھنڈا ہوا اور وہ ان کے پیر بھگو کر واپس ہولی تھی۔پیروں کی انگلیوں کو چھوتی نمی فرحت بخش تھی...... یہ احساس اچھا تھا اور اک اور احساس......وہ خاموش ہوا تھا اور اس کا یوں خاموش ہو جانا سماعتوں کو ذرا پسند نہ آیا تھا۔لہروں کا شور تھا۔دور کہیں کسی بگلے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ہوا اس کے بالوں کی لٹوں کو منتشر کرتی تھی......اور وہ دوقدم کے فاصلے پہ موجود......دو سمٹے ہوئے افراد......

''یہ ایسا اور اتنا بڑا معجزہ ہے کہ ہاتھ بڑھاؤں تو چھولوں......نظر بھر کر دیکھنا چاہوں تو دیکھ لوں......محسوس کرنا چاہوں تو کوئی روک نہیں......میرے جیسے شخص کے لیے اس سے بڑھ کر بڑی بات اور کیا ہوگی کہ میں بنا کسی تکلیف کے......آزادی کے ساتھ......اسے دیکھ سکتا ہوں کہ جسے میں نے عمر بھر دیکھتے رہنے کی خواہش کی ہو......''

خولہ نے عجب سے احساس کے ساتھ اسے دیکھا۔وہ گھٹنوں کے گرد ہاتھ باندھے......سامنے دیکھ رہا تھا۔کون کہتا ہے کہ نظر بھر کر دیکھنے کے لیے کسی کے چہرے کو تکنا ضروری ہے۔ہمایوں کے لیے اس کی وہاں موجودگی......اس کا ہونا اور اس ہونے کا احساس ہی کافی تھا۔خولہ نے بے ساختہ سر جھکایا......آنکھ نم ہوئی تھی......یوں ہی......بلاوجہ میں ہی......

''تم خولہ احمد......! تم گر مجھے ساری عمر بس دوقدم کے فاصلے پر بٹھا کر رکھ چھوڑو تو یقین مانو یہ سودا بھی گھاٹے کا نہیں......تمہارا میری زندگی میں......میرے سامنے ہونا اہم ہے......یہ احساس کافی ہے میرے لیے......''اور خولہ کا دل دھک کر کے رہ گیا تھا۔اس کے جسم میں کوئی لہر سی دوڑی تھی اور بے ساختہ اس نے ہاتھ کی دونوں مٹھیاں بھینچی تھیں۔

چند لمحے بعد اس نے ہمایوں کو دیکھا......وہ اب بھی اسی انداز میں سامنے دیکھتا تھا......اور خولہ اس سے نظر ہٹا نہ پائی تھی۔اس کا دل عجیب سے انداز میں اس کی طرف کھنچا تھا۔اس طرح سے کہ وہ خوف زدہ سی ہوئی تھی......اس نے فوراً گردن موڑی اور پھر وہ بھی سامنے تکنے لگی......

تو وہاں لہروں کے اٹھنے اور گرنے کا شور تھا......دور کہیں کوئی بگلا بولتا تھا اور نمی بھری ہوا تھی جو ان کے چہروں سے ٹکراتی تھی۔ان کے بالوں کو منتشر کرتی تھی......کوئی بھید کھولتی تھی......اور وہ دو وجود......دوقدم کے فاصلے پہ بیٹھے وہ دو وجود کہ جنہیں محبت نامی شے دنیا کے دو مختلف کونوں سے کھینچ لائی تھی۔

☆......☆......☆

http://kitaabghar.com

مشال کی منگنی تھی۔لوگوں کا ہجوم تھا جو کہ اس بڑے سے لان میں ٹولیوں کی شکل میں بکھرا تھا۔وہ بار، بار گردن اٹھا کر اس ہجوم میں سے اسے تلاشتا...... دیکھتا اور ہر بار سکون کے اک نئے مفہوم سے آگاہ ہوتا تھا۔سیاہ ساڑی میں ملبوس...... بالوں کا گردن کے ساتھ جوڑا بنائے ہوئے......آنکھوں میں کاجل لگائے......وہ سحر طراز دکھتی تھی......وہ تبسم کے ساتھ بیٹھی تھی۔ہونٹوں پہ محسوس ہوتی مسکراہٹ......زہرہ بھی وہیں تھیں اور مزنہ......اس کے اپنے شوق اور مصروفیات......وہ اسٹیج پہ سیلفیز بنانے میں مصروف تھی......

''میرا خیال ہے خولہ اب اسے بتا دینا چاہیے......''تبسم کہہ رہی تھیں۔

''وہ بہت بری طرح ری ایکٹ کرے گی......''خولہ پریشان ہوئی۔

''اب...... یہ چیز تو face کرنی پڑے گی ناں......کب تک یوں چھپا کر رکھو گی......ایسے تو زندگی نہیں گزرتی...... نہ گزاری جاتی ہے۔''وہ زہرہ تھیں......خولہ بے اختیار خاموش ہوئی۔

''میرا دل چاہتا ہے کہ اسے کبھی معلوم نہ ہو......کبھی پتا نہ چلے......بہت تکلیف ہوگی اسے......''وہ نم آواز میں بولی۔

''اس فیصلے میں اسی کی بھلائی ہے......اسے یہ سمجھنا ہوگا۔''تبسم نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا تھا۔خولہ نے سر ہلایا...... یوں جیسے اتفاق کرتی ہوں ان کی بات سے......

''میں اب چلوں......ابو کو مشکل ہو رہی ہوگی......'' کچھ دیر بعد وہ بولی تھی۔

''ہمایوں کو کہتی ہوں، تمہیں ڈراپ کر دے......''زہرہ نے سادگی سے کہا تھا مگر تبسم......ان کی چھیڑتی نظریں خولہ پہ تھیں۔

''نہیں آنٹی......پلیز......!''اور وہ بری طرح سے بلش ہوئی تھی۔اس کے یوں بلش ہونے پہ تبسم اور زہرہ ہنس دیں۔

''اچھا چلو......ڈرائیور کو کہتی ہوں تمہیں ڈراپ کر آئے......''تبسم بولتے ہوئے اٹھیں......وہ بھی زہرہ کو خدا حافظ کہتے ہوئے اٹھی تھی۔تبسم ڈرائیور کو کال ملا رہی تھیں مگر کال مل نہیں رہی تھی۔انہوں نے اسے گیٹ تک جانے کا کہا اور خود کسی کو دیکھنے لگیں جو کہ ڈرائیور کو بلا لاتا......اور وہ کسی ہمایوں سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا تھا بھلا......

ساڑی کا پلو شانے کے گرد لپیٹے......وہ باہر کو جاتے راستے پہ چل رہی تھی......اس کی ہیل کی ٹک، ٹک ماحول کو ارتعاش زدہ رکھتی تھی......اور ہمایوں......وہ چند لمحے اس کی پشت کو تکتا رہا، پھر......

''ایکسکیوز می......!'' اور وہ اس آواز پہ یک دم ٹھہر سی گئی تھی۔ اک پل کو فلیش بیک ہوا۔ اس نے گردن اٹھا کر سامنے......باہر کو جاتے رستے کو دیکھا......راستہ خالی تھا اور وہاں اب کوئی ایسا نہ تھا جو کہ اس کا منتظر کھڑا ہوتا۔خولہ ایک سانس لیتے ہوئے رخ موڑ کر پلٹی اور ہمایوں کو دیکھا۔وہ ایک ہاتھ جیب میں ڈالے......سکون سے کھڑا تھا۔

''جی......؟''

http://kitaabghar.com fb.com/sehar.sajid.official kitaabghar.com

اور وہ کاجل بھری آنکھوں میں ذراسی حیرانی سموئے جب پوچھتی تھی تو اس کی معصومیت جان لیتی تھی۔

وہ مسکرایا......سر جھکا کر ہلکا سا ہنس دیا اور پھر اس کی طرف بڑھا۔

”آپ جارہی ہیں......؟“اس نے چلتے، چلتے پوچھا۔

”میرا خیال ہے......“اس کو اپنی طرف بڑھتا دیکھتے ہوئے جواب دیا گیا۔

”آپ کو نہیں لگتا کہ آپ کو یوں فنکشن چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے؟“مسکراہٹ اور گہری ہوئی۔خولہ نے اسے اپنے سامنے رکتا دیکھا اور رخ موڑ کر تاثرات چھپانے لگی۔

”ایکسکیوزمی......؟“پھر چہرہ سیدھا کرتے ہوئے، ایک ابرو اٹھاتے ہوئے بولا۔

”تو آپ نہیں ٹھہریں گی......؟“

”آپ کا سوال بے معنی ہے......“

”اور میں اگر......اک بامعنی سوال کروں تو......؟“اور وہاں سب کچھ......سب کچھ ٹھہر سا گیا......وہاں بس وہ دو وجود تھے......اِک دوسرے کے آمنے سامنے......سانس روکے اک دوسرے کو تکتے ہوئے۔

”پروپوز کرنا چاہتا ہوں آپ کو......“اور اک سرگوشی سی بلند ہوئی...... مانو کہ حسرت تمام ہوئی۔خولہ کے چہرے کا رنگ بدلا...... اک پل کے لیے...... چند لمحوں بعد وہ دو قدم آگے بڑھی......اس کی آنکھوں میں جھانکا...... ہونٹوں پہ مسکراہٹ ابھری......اور ابھر کر پھیل گئی۔

”میں......میریڈ ہوں......“اور پھر جوابی سرگوشی کی گئی۔وہ ذرا سی دیر کو ساکت ہوا......اس کا رنگ فق ہوا پھر وہ دونوں ہنس پڑے......زور سے......

☆......☆......☆

اور جب اوپر والا پورشن سیٹ ہو گیا تو احمد صاحب نے مٹھائی منگوائی، پورے محلے میں بانٹی اور نکاح کا اعلان کر دیا......

لوگ مٹھائی کھاتے ہی تفصیلات جاننے کو دوڑے......تفصیل سن کر انگلی ہونٹوں میں داب تے......”آ کے“انداز میں منہ کھولتے...... اک سخت تعجب بھری مگر ایسی نظروں سے احمد صاحب کو دیکھتے کہ جیسے بڑا ہی سخت غلط کام سر انجام دے دیا گیا ہو لیکن وہاں پروا کسے تھی۔وہ......احمد صاحب لوگوں کی پروا کر لیتے یا پھر خولہ کی......اور......اور یا پھر مزنہ کی...... یہ بیچ کی راہ تھی......اس سے ان کی دونوں بیٹیوں کا مستقبل محفوظ تھا......وہ جانتے تھے...... بہت اچھی طرح جانتے تھے کہ خولہ یا ہمایوں، مزنہ کو کوئی تکلیف نہ دیں گے......تو زندگی میں بعض اوقات بڑے، بڑے سخت اور زہریلے فیصلے کرنے پڑ ہی جاتے ہیں۔یہ کرنا پڑتا ہے کہ انسان مجبور ہوتا

ہے……مجبور ہو جاتا ہے……اور اگر یہ دونوں کام نہ ہوں تو پھر زندگی اسے مجبور کر ہی ڈالتی ہے……اور مزنہ ابھی تک بے خبر تھی کہ مٹھائی اس تک نہیں پہنچائی گئی تھی۔

☆……☆……☆

وہ ابھی ابھی پھپھو کو سلا کر کمرے میں آئی تھی۔ مصروف سے انداز میں بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹتے ہوئے وہ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اب عادت سی ہونے لگی تھی اس کمرے میں رہنے کی…… چاہے ہمایوں وہاں ہو یا نہ ہو……وہ اپنے دھیان میں کمرے تک آئی……دروازہ کھولا……بتی جلائی اور ٹھٹک کر رک گئی۔

''یہ…… یہ کب آیا……؟'' وہ سخت حیران ہوئی۔ یقیناً ابو نے دروازہ کھولا تھا اور وہ اسے پھپھو کے ساتھ مصروف دیکھ کر اوپر آ گیا تھا……خولہ چند لمحے بورڈ پہ ہاتھ رکھے اسے دیکھتی رہی اور پھر سر جھٹک کر مسکرائی تھی۔ وہ یوں ہی اسے دیکھتے ہوئے، مسکراتے ہوئے، نرم سی چال چلتی ہوئی اس تک آئی……وہ بازو آنکھوں پہ رکھے سو رہا تھا۔

''میں بے حد خوش ہوں خولہ…… بے حد……!'' اور اس کے کانوں میں ہمایوں کی آواز گونجی تھی……وہ کرسی پہ بیٹھی…… گال ہاتھ پر ٹکا کر…… پھر سے…… بڑے آرام سے، سکون سے اسے تکنے لگی…… یوں جیسے اس کے سوا دوسرا کوئی کام نہ ہو……اس کا فیشل ہیئر اسٹائل شارٹ سے لانگ stubble میں بدل چکا تھا……اور تبدیلی اسے سوٹ کر رہی تھی۔

''میں اتنا خوش ہوں…… اتنا کہ مجھے لگتا ہے کہ سارے جہان کو بٹنے والا سکون…… اک میرے اکیلے کے دل پہ اتار دیا گیا ہے……'' اور اس کی مسکراہٹ اور گہری ہوئی۔

''میں اس جذبے کو محسوس کر سکتا ہوں……کھل کر…… پوری طرح سے…… میں محسوس کر سکتا ہوں…… یہ اک خوشی کافی ہے……عمر بھر کے لیے……لیکن تم نہیں سمجھ سکتی……کبھی بھی نہیں سمجھ سکتی……'' اور خولہ نے مسکراتے ہوئے آنکھیں موندیں اور کرسی کی پشت سے سر ٹکایا۔

''ہاں……ہمایوں……! میں نہیں سمجھ سکتی……تم ٹھیک کہتے ہو……'' اور اس کے لب ابھی تک مسکراتے سے تھے۔

''اور میں……میں کیا ایسے تمہیں چاہ سکتی ہوں کہ جیسے کہ تم…… مجھے…… آں ہاں……نہیں…… بالکل بھی نہیں……''

اور بے ساختہ اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

''بھلا ہمایوں مفتی……! اس چیز میں، میں تمہارا کیا مقابلہ کر سکتی ہوں……''

اس کے لبوں کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی اور وہ یوں ہی آنکھیں موندے سکون سے بیٹھی، ساتھ سوئے شخص کو سوچتی رہی……

☆……☆……☆

http://kitaabghar.com

وہ کال بیل بجا کر دروازہ کھلنے کی منتظر تھی......

"بڑا حوصلہ ہے تمہارا مزنہ......!" اور اس آواز پہ اس نے حیرت سے پلٹ کر دیکھا۔ وہ آنٹی رضیہ تھیں۔ یہ ساتھ ہی تو گھر تھا ان کا......

"جی......؟ آنٹی میں سمجھ نہیں سکی......"

"لو......! اس میں سمجھنے والی کوئی بات تو ہے ہی نہیں...... خود اپنے شوہر کا اپنے ہی ہاتھوں سے نکاح کر دیا خولہ سے...... حوصلے والی بات نہیں تو پھر اور کیا ہے؟" اس پہ بم گرا اور اس کے وجود کے پرخچے اڑ کر رہ گئے تھے...... وہ ابھی تک پھٹی، پھٹی نگاہوں سے اس سمت تکتی تھی کہ جس سمت وہ آنٹی گئی تھیں...... دروازہ کھلا...... مگر وہ بے خبر اسی طرف دیکھتی تھی۔

"مزنہ......!" ابو نے اس کا ہاتھ ہلایا۔ وہ چونکی...... گردن موڑ کر انہیں اس تکلیف سے دیکھا کہ جیسے کلیجا پھٹ گیا ہو۔

"ابو......!" اور اس کے ہونٹ بنا آواز ہلے تھے۔ احمد صاحب کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ہوا کیا ہے...... ایک گہری سانس بھر کر انہوں نے اس کا ہاتھ تھاما، اسے دروازے سے اندر کیا اور مزنہ پر دوسرا گرنے والا بم...... ہمایوں کی گاڑی وہاں کار پورچ میں کھڑی تھی...... اس کے کندھوں میں یک دم تکلیف کی اک لہر اٹھی...... وہ جکڑے گئے تھے اور وہ...... وہ بے اختیار لڑکھڑائی تھی۔

ابو ہی اسے سہارا دے کر اندر تک لائے تھے۔ انہوں نے ہی اسے کرسی پہ بٹھایا تھا اور اس کے لیے پانی لینے چلے گئے تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامے...... ماؤف ہوتے ذہن اور بے جان جسم کے ساتھ بیٹھی تھی۔

"پانی پی لو......!" اور اس نے میکانکی انداز میں سر اٹھایا...... وہ چند لمحے انہیں دیکھتی رہی...... کچھ کہنے کی کوشش کرتی رہی...... مگر لفظ اس کے منہ سے ادا نہ ہوتے تھے...... یوں جیسے قوت گویائی پر یک دم فالج آن گرا تھا...... احمد صاحب نے اک گہری سانس بھری...... اور پانی اس کے سامنے ٹیبل پہ رکھ دیا۔ انہیں خود سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اب وہ کیا کریں...... کیا کہیں...... کریں تو آخر کریں کیا......؟ وہ بھی اسی کے سے انداز میں وہاں چپ سے بیٹھے تھے۔ مزنہ کی آنکھ سے اک آنسو گرا۔

"سگی بیٹی نہیں تھی ناں میں آپ کی......" اور اس کی ناک سرخ ہوئی...... نتھنے پھڑپھڑائے۔

"کوئی اور نہیں ملا تھا آپ کو ابو......؟ ہمایوں ہی کیوں......؟" اور اس کا لہجہ کانپتا تھا...... آواز میں لرزش تھی۔

"مجبوری......"

"کیسی مجبوری......؟" اور اس کی آواز پھٹ سی گئی تھی۔ سامنے پڑے گلاس کو ہاتھ مار کر گراتے ہوئے وہ چیخی تھی۔

"میرا گھر برباد کیا...... آپ نے ابو...... آپ......! اپنی سگی بیٹی......"

"بس...... بس کر دو مزنہ...... بس کر دو......" احمد صاحب نے تکلیف سے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

ایک دفعہ پہلے بھی وہ انہیں یہ طعنہ دے چکی تھی جب عزیز سے اس کی شادی توڑی گئی تھی۔

شور کی آواز سن کر خولہ ننگے پیر نیچے کو بھاگی اور مزنہ کو وہاں بیٹھا دیکھ کر وہ الٹے قدموں مڑی تھی۔

''یہ جو کچھ ہوا ہے ناں......اسی میں تمہاری بھلائی ہے......''

''بھلائی......؟''اور مزنہ نے بنا آواز کے لفظ دُہرائے......یوں جیسے پیٹ میں بڑے زور کا گھونسا پڑا ہو۔

''تم......تمہیں کیا ہوا خولہ......؟''ہمایوں نے اس کی فق رنگت کو دیکھ کر کہا تھا۔وہ ابھی،ابھی واش روم سے نکلا تھا کہ جبھی خولہ اندر داخل ہوئی تھی۔

''ہمایوں......!''اس نے لرزتے ہاتھوں سے ہمایوں کے بازو کو تھاما......یوں جیسے یہ نہ کیا تو گر پڑے گی۔

''خولہ......!ایوری تھنگ فائن......؟طبیعت ٹھیک ہے......؟''وہ بے اختیار پریشان ہوا اور اسے کندھوں سے پکڑ کر بیڈ پہ بٹھایا تھا۔

''اوہ میرے خدا......!''خولہ نے چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپا تھا۔

''خولہ......خولہ کیا ہوا ہے......؟''

''مزنہ......!''اور نام اس کے منہ سے سسکی کے مانند ادا ہوا اور وہ منہ پہ ہاتھ رکھ کر رو دی تھی۔ہمایوں کا منہ''اوہ''کے سے انداز میں کھلا......اس نے ایک نظر خولہ کو دیکھا......اک گہری سانس بھری......پنجوں کے بل اس کے سامنے بیٹھا اور اس کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا......میں دیکھتا ہوں......سنبھالو خود کو......''اور پھر وہ اس کا چہرہ تھپتھپا کر اٹھ گیا تھا۔خولہ اور شدت سے روتی تھی۔دوسری طرف مزنہ،ابو کو کہہ رہی تھی۔

''کیسی بھلائی ابو......؟کیسی بھلائی......؟''وہ ایک دم کھڑی ہوئی تھی۔

''میری نہیں......آپ نے خولہ کی بھلائی دیکھی......میری......میری بھلائی دیکھی ہوتی تو......''

''تمہارا شوہر خود آیا تھا میرے پاس......''احمد صاحب اچانک لاؤڈ ہوئے اور لاؤڈ ہو کر اس کی بات کاٹی تھی۔

''جاؤ جا کر اس سے پوچھو......ادھر ہی ہے وہ......جاؤ......''

اور مزنہ نے اک تنفر بھری نظر ان پہ ڈالی اور تیز رفتاری سے باہر کو نکلی تھی۔اس کا ہمایوں سے ٹکراؤ سیڑھیوں پہ ہوا تھا۔وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو دیکھ کر ٹھہر سے گئے تھے۔

ہمایوں نے منہ آسمان کی طرف کر کے اک گہری سانس لی اور پھر اسے دیکھا۔

''مزنہ......!'' ہمایوں نے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا مگر اس نے نفرت سے، اک جھٹکے سے چھڑوایا تھا اور اس کو کراس کر کے وہ دروازے کی طرف بڑھی تھی۔ ہمایوں نے اب کے بے بسی سے پیشانی کو مسلا تھا اور پھر سست رفتاری سے مڑا تھا۔ مزنہ نے پیر کی زوردار ٹھوکر سے دروازہ کھولا اور اس نے......اس عورت کو دیکھا جو کہ ڈائن تھی......غاصب تھی......اس کا حق ہڑپ کر گئی تھی......نفرت کی اک شدید لہر اٹھی اور مزنہ کے اندر اتنا سارا زہر بھر گئی تھی اور وہ......وہ عورت......وہ دروازہ کھلنے کی آواز پہ بھی نہ مڑی تھی......وہ پایئز وال سے گال ٹکائے......انگلی سے کچھ لکھ رہی تھی......اور یوں لکھ رہی تھی جیسے اس کے سوا کوئی دوسرا شغل نہ ہو......اور اس کے سوا وہاں دوجا کوئی بھی نہ ہو......

مزنہ کسی نار کی طرح بھڑکتے ہوئے اس تک گئی۔

''شرم نہیں آئی......'' خولہ کی انگلی کی حرکت ذرا سی دیر کو رکی اور پھر سے رواں ہوئی......اس کے پوز میں......محویت میں، ذرا سا، اتنا سا بھی فرق نہیں آیا تھا۔

''بہن ہوں میں آپ کی......اور میرا ہی گھر لوٹ لیا تم نے......'' وہ رو رہی تھی......چیخ رہی تھی مگر وہاں سنتا کون تھا......خولہ نے اک نگاہِ غلط سے بھی اس کو نہیں دیکھا تھا۔

''تم اتنی آوارہ ہو سکتی ہو......سوچا بھی......''

''مزنہ......!'' اور ہمایوں نے دہاڑ کر کہا۔

مزنہ نے تکلیف سے ہمایوں کو دیکھا اور پھر مڑ کر خولہ کو......خولہ نے اس کا دیکھنا نوٹ کیا......انگلی کی حرکت روکی اور سر اٹھا کر اسے دیکھا......سرد نگاہوں سے......

''کہا تھا ناں تم سے......یہ راز اک چنگاری ہے......سلگتی ہوئی چنگاری......چنگاری جو اک ایسی ''نار'' کو بھڑکا دے گی کہ جس کو تم بجھا سکو گی اور نہ میں......کہا تھا ناں......؟'' اس نے تائید چاہی اور مزنہ پھٹی، پھٹی آنکھوں سے اسے تکتی رہ گئی تھی۔

وہ دو قدم آگے بڑھی......اور مزنہ اس کے کان کے پاس لے جا کر کہا۔

''اور میں......اک ناآسودہ عورت تھی مزنہ......ناآسودہ......''

اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل کر مزنہ کی سماعت میں انڈیلی گئی تھی......یوں جیسے آگ پہ تیل پھینکا گیا ہو......مزنہ یک دم ہی بھڑکی تھی......اور بھڑک کر اس نے خولہ کو دونوں ہاتھوں سے دھکا دیا تھا۔

''اللہ کرے تم مر جاؤ......'' اس نے چیختے ہوئے کہا۔ خولہ لڑکھڑا کر دیوار کے ساتھ جا لگی۔

''کیڑے پڑیں تمہاری قبر میں......'' اور اب کے اس نے دونوں ہاتھوں سے اسے پیٹنا چاہا لیکن......

"مزنہ......!" ہمایوں نے اچانک اسے بازو سے پکڑ کر طیش سے پیچھے کو کھینچا تھا۔

"expect کر رہی ہے وہ......" اور پھر پرے دھکیلتے ہوئے مشتعل لہجے میں بولا تھا......اور بس...... یہ آخری کیل تھی......آخری کیل......مزنہ حیرت کے صدمے سے ساکت ہوئی اسے تکتی تھی اور خولہ......اس نے ایک نظر ان دونوں پہ ڈالی اور پھر سے گال پا پیئر وال کے ساتھ ٹکایا۔اس کی انگلی ایک بار پھر سے حرکت میں آئی تھی...... ہمایوں تھک کر مڑا......سائڈ ٹیبل سے اک فائل نکال کر مزنہ کو پکڑاتے ہوئے بولا۔

"وہ رپورٹ fake تھی مزنہ...... جو میں نے تمہیں پہلے دکھائی تھی...... سچ یہ ہے......" وہ فائل اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا۔مزنہ سے حیرت سے دہرے ہوتے ہوئے وہ فائل کھولی اور......اور اس کی آنکھوں کے آگے یک دم ہی اندھیرا چھا گیا تھا۔وہ بے ساختہ لڑکھڑائی تھی۔ہمایوں نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔اس نے مزاحمت کرنا چاہی مگر وہ کر نہ پائی تھی......ہمایوں نے ایک بازو اس کے شانے کے گرد پھیلایا اور اسے لے کر باہر کو نکلا تھا...... یہ کہتے ہوئے۔

"ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچنا اب کہ خولہ سے نکاح میں......تمہارا کیا فائدہ ہے۔"

☆......☆......☆

وہ جب دوبارہ کمرے میں آیا تو وہ ابھی تک اسی ایک پوزیشن میں تھی،اس کی انگلی کی حرکت تھمی نہ تھی۔اور وہ بار،بار لکھتی جارہی تھی۔

ہمایوں نے اک نظر اسے دیکھا......آہستگی سے چلتا ہوا اس تک آیا اور اس کے شانے کے گرد بازو پھیلایا تھا۔اس کی انگلی کی حرکت یکبارگی رکی اور پھر اس نے لفظ مکمل کیا......"ہمایوں......"

اس کے بعد اس نے اپنا سر ہمایوں کے بازو پہ ٹکایا تھا۔ہمایوں نے بے ساختہ اس کا سر چوما اور اس کی انگلی اک بار پھر سے......بار،بار لفظ ہمایوں لکھنے لگی......اور لکھتی ہی چلی گئی......اور وہ اسے اپنا نام لکھتا دیکھتا گیا۔

"کچھ سناؤ ناں ہمایوں......!" چند لمحوں بعد اس کی مدھم سی آواز سنائی دی۔ہمایوں مسکرایا......اس فرمائش پہ......اس نے اک سانس بھری اور پھر کمرے میں اس کی پرسوز آواز گونجنے لگی......

دکھ سے بھرپور دن تمام ہوئے
اور کل کی خبر کسے معلوم
دوش و فردا کی مٹ چکی ہیں حدود
ہو نہ ہو اب سحر کسے معلوم

http://kitaabghar.com

زندگی ہیچ! لیکن آج کی رات

ایذیت ہے ممکن آج کی رات

آج کی رات ساز درد نہ چھیڑ

اب نہ دہرا فسانہ ہائے الم

اپنی قسمت پہ سوگوار نہ ہو

فکر فردا اتار دے دل سے

عمر رفتہ پہ اشک بار نہ ہو

عہد غم کی حکایتیں مت پوچھ

ہو چکیں سب شکایتیں مت پوچھ

آج کی رات ساز درد نہ چھیڑ

آج کی رات......

آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ

”عورت بڑی سخت شے ہوتی ہے......پتھر ہے پتھر......دل کا دروازہ نہیں کھولتی......چاہتی ہے کہ اسے ویسے ہی چاہا جائے جیسے کہ وہ چاہے جانا پسند کرتی ہے......“

اور اسے اب کہ......ویسے ہی چاہا گیا تھا کہ جیسے چاہے جانا وہ چاہتی تھی......وہ پسند کرتی تھی......

کیا ضروری ہے کہ عورت دل پر پیر رکھ کر جیے......؟

تو ”نار“ بھڑک چکی......وہ نار کہ جس کا نام محبت......تو کوئی کب تک اور کہاں تک دل بچائے......دامن بچائے......

اس کے آگے سب بھسم ہو جانے کے واسطے ہے......کیا دل......اور کیا وجود......

ختم شد

http://kitaabghar.com